پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

بابر حسین

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اپریل، ۲۰۲۱ء

پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع

مقالہ نگار

بابر حسین

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اپریل، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع

پیش کار: بابر حسین رجسٹریشن نمبر: 575/PhD/Urd/F15

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) _____

ریکٹر

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں، بابر حسین حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی اسکالر کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

بابر حسین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	ix
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف وبنیادی مباحث	1
الف۔ تمہید	1
i. موضوعِ تحقیق کا تعارف	1
ii. بیان مسئلہ	1
iii. مقاصد تحقیق	2
iv. تحقیقی سوالات	2
v. نظری دائرہ کار	2
vi. تحقیقی طریقہ کار	4
vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	4
viii. تحدید	4
ix. تحقیق کی اہمیت	5
x. پس منظری مطالعہ	5
ب۔ دہشت گردی کے لغوی واصطلاحی مفاہیم	5

ج۔ دہشت گردی کا آغاز وارتقاء 10
د۔ دہشت گردی کے محرکات 16
ہ۔ دہشت گردی کی مختلف جہات 27
و۔ اردو ادب میں دہشت گردی بطور موضوع 63
حوالہ جات 75
باب دوم: دہشت گردی پر لکھے گئے منتخب افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ 79
الف۔ یلدرم سے پریم چند تک 80
ب۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے اردو افسانے پر اثرات 82
ج۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کی دہائی کا اردو افسانہ 83
د۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی اور مابعد اردو افسانے میں دہشت گردی 88
ہ۔ ۹/۱۱ کے بعد اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع 109
حوالہ جات 185
باب سوم: دہشت گردی پر لکھے گئے منتخب افسانوں کا فنی مطالعہ 192
الف۔ پاکستانی اردو افسانے کے اسلوب پر دہشت گردی کے اثرات 196
ب۔ پاکستانی اردو افسانے کی تکنیک پر دہشت گردی کے اثرات 223
ج۔ پاکستانی اردو افسانے کی کردار نگاری پر دہشت گردی کے اثرات 234
حوالہ جات 249
باب چہارم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات 254
الف۔ مجموعی جائزہ 254
ب۔ تحقیقی نتائج 262
ج۔ سفارشات 263
کتابیات 264

ABSTARCT

Terrorism as a Theme in Pakistani Urdu Fiction

Terrorism is, in the broadest sense, the use of intentional violence for political or religious purposes. It is used in this regard primarily to refer to violence during peacetime or in the context of war against non-combatants (mostly civilians and neutral military personals). The terms "terrorist" and "terrorism" originated during the French Revolution of the late 18th century. The increased use of suicide attacks from the 1980s onwards was typified by the September 11 in New York City and Washington, D.C in 2001. Terrorism is often construed as a well-thought-out, extreme form of violence to perceived injustices. The after effects of terrorism are usually reported without understanding the underlying psychological and social determinants of the terrorist act. Since '9/11' Pakistan has been at the epicentre of both terrorism and the war against it. Pakistan has suffered particularly excessively from the social, economic and human costs due to terrorism. It is portrayed as being on the front line in the international war against terrorism and at the same time has been wrongly labelled as a sponsor of international terrorism. Terrorism in Pakistan is a multidimensional phenomenon and, among many precipitating factors, the psychosocial factors play an important role. Pakistan's social landscape has for the most part been plagued with illiteracy, disease, insecurity and injustice. Since the 9/11 incident, Pakistan has been intricately linked with the many facets of the 'war on terrorism.' Some argue that Pakistan is a breeding ground for terrorist outfits, but it is certain that all of this havoc has resulted in the significant loss of innocent lives as well as loss of economic revenue. These fragile conditions provide a fertile ground for terrorism to grow. The unmanned army drone strikes killed and maimed thousands of innocent civilians in poor and difficult to access regions of Pakistan. This infuriated people,

leading them to take up arms against the perceived aggressors. This triggering of the relatives of the deceased to engage in such activity is the culture of revenge in Pakistan, which unfortunately can last for generations. Self-sacrifice and martyrdom has been explicitly used in almost all religions and is aggressively exploited by terrorist outfits who groom suicide bombers using the ideology of Islamist martyrdom. Such tragic incidents had a profound effect not only on world literature but also on Urdu literature. Urdu fiction writers have made terrorism the subject of their fiction. Many fiction writers created excellent literature, especially on the 9/11 tragedy. This thesis discusses terrorism as a topic in Pakistani fiction.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے مجھ پر خدائے بزرگ و برتر کا شکر واجب الادا ہے کہ جس کے خاص لطف و کرم نے تحقیق کے تمام مشکل مراحل کو میرے لیے آسان بنایا اور مجھے اس قابل کیا کہ ڈاکٹریٹ کے مقالہ کو تکمیلی شکل دے سکوں۔ میرا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ بہ فضل تعالیٰ مکمل ہو گیا ہے۔ ابتدا میں میرے لیے موضوع کی تلاش انتہائی مشکل کام تھا۔ لیکن میرے محسن و مربی استاد ڈاکٹر رشید امجد نے اس سلسلے میں میری بھرپور معاونت کی اور مجھے ''پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع'' پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی ترغیب دی، جسے کمال مہربانی سے ادارے نے بھی قبول کر لیا۔ مقالے کے لیے جب کتب اور مضامین کی تلاش شروع ہوئی تو ڈاکٹر رشید امجد کی ہر مرحلہ پر معاونت نے میرے حوصلے کو جلا بخشی اور میرے شوق کو مہمیز عطا کی۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ان کے لیے دعا گو ہوں۔

میری نگران پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم نے مقالے کی تکمیل تک کے تمام مراحل میں جس طرح رہنمائی کی اس سے مجھے آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں کہ اس راہِ پُر خار میں ہر سطح پر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے ہر بار نئے عزم سے نوازا۔

مقالے کی تیاری کے مراحل میں مجھے شعبہ اُردو کی سابقہ سربراہ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کی سرپرستی حاصل رہی۔ جس کی بنا پر مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ تمام اساتذہ ڈاکٹر عابد حسین سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر ظفر احمد اور ڈاکٹر رخشندہ مراد کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے ایک اسکالر کی حیثیت سے پیش آنے والی میری تمام مشکلات کا ازالہ کیا اور میری بہترین رہنمائی فرمائی۔ میں اپنے ان دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اللہ پاک ان سب کو جزائے خیر دے! (آمین)

والدین اللہ پاک کی عطا کردہ سب سے عظیم نعمت ہیں جن کی محنت، محبت اور بے لوث دعائیں کامیابی کی منزل تک پہنچاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھ پر ان کا شفقت بھرا سایہ ہمیشہ قائم و دائم رکھے! (آمین)

بابر حسین

باب اول

موضوعِ تحقیق کا تعارف وبنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع تحقیق کا تعارف

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے آخر میں دنیا بھر میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص دہشت گردی کی جو لہر آئی اس سے فرد بلکہ پورے معاشرے کو خوف کی ایسی کیفیات میں جس نے کئی مسائل پیدا کیے۔ جس میں نفسیاتی مسائل بھی شامل ہیں۔ دہشت گردی کا واقعہ روح ارضی پر رونما ہونے والے غیر معمولی واقعات میں سے ایک ہے۔ جس نے دنیا بلکہ ادبی منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا اور اس کے اثرات طول وارض پر پھیل گئے۔ پاکستان خاص طور پر دہشت گردی کا شکار ہوا اس سے ان گنت انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں رہی جہاں دہشت گردی نے اپنا اثر نہ دکھایا ہو۔ بالخصوص نائن الیون کے بعد جو صورت حال اچانک رونما ہو کر انسانی اعصاب پر غالب آگئی، اسے نظر انداز کرنا ادب کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ لہٰذا گزشتہ سنگین ادوار کی طرح اس سخت دور میں بھی ادب نے اپنے فرائض بطریقِ احسن نبھائے ہیں۔ مابعد نائن الیون تخلیق ہونے والا افسانہ فکر، فن اور اسلوب ہر اعتبار سے اہم ہے اور اسی تناظر میں زیادہ گہری معنویت کا حامل ثابت ہوا ہے۔ ہر افسانہ نگار نے اپنی بساط کے مطابق اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ افسانہ چونکہ مختلف واقعات سے جنم لیتا ہے اس لیے اردو افسانے میں اس موضوع کا اظہار بھرپور طریقے سے ہوا۔ نائن الیون کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں اور جن نئے رجحانات نے جنم لیا ہے، وہ پاکستانی اردو افسانے کا حصہ بنے ہیں۔ ان کے پیش نظر اردو افسانے کے فکری و فنی نظام میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جو کسی بھی نئے رجحان کی دین ہوا کرتی ہیں۔ یوں اس میں بے شمار منفرد اسالیب وافکار کا اضافہ ہوا ہے۔ میری اس تحقیق میں اسی فکری استدلال کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ

دہشت گردی کے موضوع پر مختلف مضامین لکھے گئے ہیں۔ اس موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جن کی حیثیت اخباری روزنامچے سے زیادہ نہیں۔ حالات حاضرہ کے موضوعات پر

فوراً لکھ لینا ادب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس موضوع پر بہت عمدہ افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن کا فنی معیار اعلیٰ درجے کا ہے۔ اس مقالے میں فکری و فنی ہر دو طرح سے پاکستانی افسانوں کا جائزہ لے کر اُن کی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔

iii. مقاصد تحقیق

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے دوران خاص مقاصد درج ذیل رہے:

۱۔ دہشت گردی پر لکھے جانے والے اردو افسانوں میں کون کون سے فکری زاویے متعین کیے گئے ہیں؟

۲۔ دہشت گردی پر لکھے جانے والے افسانوں کا فنی تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ان میں کون سے افسانے فنی معیار پر پورے اترتے ہیں۔

۳۔ دہشت گردی کے اردو افسانے پر اثرات کا جائزہ لینا۔

۴۔ دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے افسانے کا موضوعاتی جائزہ لینا۔

۵۔ اردو افسانے کی روایت میں دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے افسانے کی قدر کا تعین کرنا۔

iv ۔ تحقیقی سوالات

۱۔ دہشت گردی کے عمومی مباحث کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ پاکستانی اردو افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو کس طرح برتا ہے؟

۳۔ ۹/۱۱ کے بعد اردو افسانے میں کیا کیا موضوعاتی تبدیلیاں رونما ہوئیں؟

۴۔ دہشت گردی کے تصورات نے اردو افسانے کی تکنیک اور فن پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار

عہد حاضر میں دہشت گردی کی اصطلاح کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ دہشت گردی ایک ایسا فعل ہے جس میں غور و خوض کے بعد تباہی اور تشدد کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور امن و سکون کی جگہ ظلم و بربریت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تباہی و بربادی سے مراد عموماً تخریبی کارروائیوں کے ذریعے اپنے مقاصد کا حصول ہے اور ملک میں بدامنی اور انتشار پھیلانا ہے۔ دہشت گردی کی تاریخ بہت طویل ہے مگر اس موضوع پر تحقیق ابھی نئی ہے۔ تحقیق کا یہ اہم موضوع گزشتہ تین دہائیوں میں بخوبی پھیلا ہے۔ اس کے باوجود کوئی مشترکہ تعریف وضع نہیں کی جاسکی۔ دہشت گردی کے پھیلاؤ میں اقتصادی اور معاشرتی اسباب کا تعلق کافی کم زور ہے۔ عالمگیریت

کے تناظر میں دہشت گردی کی یہ تفہیم کوئی معقولیت نہیں رکھتی یا کم از کم اسے مرکزیت حاصل نہیں ہے۔ اگر دہشت گردی کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ 94-1893ء کے دوران "Regime De Terror" نامی جماعت سے دہشت گردی کی تحریک کی باقاعدہ ابتداء ہوئی۔ "Terror" اور "Terrorism" کے الفاظ اسی زمانے میں رائج کیے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات میں تبدیلی آتی گئی اور اس کے نئے معانی و مفاہیم میں بھی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وسعت آتی گئی مگر ایک بات جو ہمیشہ مشترک رہی وہ تھی تباہی و بربادی اور طاقت کا بے جا استعمال۔ دنیا کے تمام بڑے ممالک اپنا تسلط اور اختیارات بڑھانے اور سپر پاور رہنے کی خواہش میں انسانیت کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں اور مظلوم ممالک اور اقوام کو طاقت کے زور پر ظلم و بربریت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اقتدار کی ہوس، حکمرانی کی خواہش وغیرہ کے نتیجے میں لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ جبر کی یہ صورت دہشت گردی کی بدترین صورت حال ہے جس نے انسانیت کا دامن تار تار کر دیا ہے۔ خاص طور پر کرۂ ارض پر 9/11 کا سانحہ رونما ہوتے ہوئے ہی عالمی منظر نامہ بدل کر رہ گیا۔ بین الاقوامی سطح پر بے شمار لوگوں کے خون سے ظلم کی نئی داستانیں رقم کی گئیں جنہوں نے دنیا کے سارے خدوخال میں ہی تغیر برپا کر دیا۔ 2001ء سے اب تک وہ طوفان تھما نہیں۔ "نائن الیونزم" عہد حاضر میں اپنے وسیع کینوس کی بنا پر تھیوری کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ اس سانحے کے بعد دنیا کا کوئی خطہ بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں رہا۔ مساجد، مندر، چرچ، دفاتر، اسکول، گھر غرضیکہ کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جہاں آئے روز ایسے واقعات رونما نہ ہوتے ہوں۔ ان واقعات نے بنی نوع انسان کی سوچ کے زاویے ہی بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ انسان نفسیاتی طور پر خوف، دہشت اور کرب میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ دہشت گردی کے واقعات نے دنیا کے ہر ادب کو متاثر کیا ہے اور ہر وہ سانحہ خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہوا، تمام اہل قلم نے اس پر خامہ فرسائی کی۔ اردو ادب پر بھی دہشت گردی کے واقعات نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اردو افسانے میں دہشت گردی اور خاص کر 9/11 جیسے واقعات کو بہت سے افسانہ نگاروں نے موضوع بنایا ہے اور انسانیت پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے خلاف بار بار آواز اٹھائی ہے۔ جبر اور ظلم کی کوئی بھی صورت جس میں معصوم انسانوں کی زندگی سے کھیل کھیلا جائے وہ سب دہشت گردی کے زمرے میں آتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں دہشت گردی کی مختلف صورتوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے کیوں کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس نے پورے معاشرے کو مختلف سطحوں پر متاثر کیا ہے۔ اس مقالے میں دہشت گردی کے اسباب تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ اردو افسانے میں اس کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف ماہرین

نے دہشت گردی سے متعلق جو تعریفیں اور اصول وضع کیے ہیں ان کی روشنی میں اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع پر تحقیق و تجزیہ کیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

میری تحقیق کا موضوع "پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع" ہے۔، لہٰذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ تحقیق کا انداز تاریخی اور دستاویزی طرز کا ہے جو کہ استقرائی طریقہ تحقیق کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ جس میں دستیاب علمی مواد (کتب، مضامین، انٹرویوز، ریڈیو، ٹی وی مباحثے اور اخباری مذاکرے) کا تنقیدی جائزہ اور تجزیاتی تقابل کر کے مقاصد تحقیق میں درج مطلوبہ پہلوؤں کو اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ نیز موضوع سے وابستہ شخصیات سے مکالمہ کے ذریعے تحقیق کے ماحصل پر تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ بنیادی مواد کے علاوہ ثانوی مواد سے بھی مدد لی گئی ہے۔ معاصر ادبی و علمی شخصیات کے مضامین جو اس موضوع سے متعلق تھے ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علمی و ادبی شخصیات کے انٹرویوز بھی کیے گئے ہیں۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے حوالے سے جامعاتی سطح کی کوئی تحقیق نہیں ہوئی تاہم اس موضوع سے بالواسطہ یا متعلقہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، ڈاکٹر نجیبہ عارف

- شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہونے والے سیمی نار کی روداد "پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات"۔

اس سیمی نار میں ۲۱ مقالے پڑھے گئے جو مختلف اصناف کے حوالے سے ہیں۔ اردو افسانے کے حوالے سے ایک مقالہ شامل ہے۔

- پاکستانی اردو افسانے پر ۹/۱۱ کے اثرات، نوشین توقیر۔

viii۔ تحدید

تحقیق و تنقید کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر اردو افسانے میں دہشت گردی کے حوالے سے فکری و فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز تکنیکی، اسلوبیاتی اور کرداری مطالعے کی روشنی میں دہشت گردی کی

مختلف اقسام کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا زمانی دائرہ کار ۱۹۸۰ء تا ۲۰۱۷ تک ہی محدود رہا۔ اس سے قبل کا افسانوی ادب میری تحقیق کا حصہ نہیں۔

ix۔ تحقیق کی اہمیت

دہشت گردی کے حوالے سے لکھے جانے والے افسانوں پر چونکہ کوئی مربوط کام ابھی تک نہیں ہوا چنانچہ اس مقالے میں اس موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں کا تجزیہ کرنا مقصود ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ پاکستانی اردو افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر کس کس حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔

x۔ پس منظری مطالعہ

زیرِ نظر موضوع پر تحقیق کے لیے بنیادی مآخذ کے ساتھ مختلف جائزاتی مطالعات اور متفرق تحقیقی مقالات سے تحقیقی مواد لیا گیا ہے۔ نیز اُن سب دستیاب اسکالرز، اساتذہ اور علمی شخصیات سے رابطہ کی کوشش کی گئی جو اس موضوع پر دسترس رکھتے تھے۔ مزید برآں مختلف مباحثوں، سیمینارز، ویب سائٹس، انٹرنیٹ مواد اور انسائیکلوپیڈیاز سے بھی مکمل حوالہ کے ساتھ استفادہ کیا گیا ہے۔

ب۔ دہشت گردی کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم

انسان اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے، جہاں نت نئی ایجادات اور ترقی کی راہیں کھل رہی ہیں۔ عصر حاضر کے انسان کو مختلف مسائل خاص کر دہشت گردی جیسے عالم گیر چیلنج کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دہشت گردی کا مسئلہ کسی ایک مخصوص علاقے یا قوم کے لیے ایک چیلنج نہیں بلکہ یہ تمام انسانوں خواہ وہ دنیا کے کسی خطے کے بھی باسی ہوں، سب کے لیے ایک عفریت کی سی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ روز بروز ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے۔ انسان چاند تک جا پہنچا ہے اور اس کی رسائی سیاروں سے بھی آگے ہے مگر دہشت گردی جیسے مسئلے پر انسان قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیوں کہ یہاں انسان ہی انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ دنیا میں آئے روز دہشت گردی کے مختلف واقعات میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ مساجد، امام بارگاہیں اور دیگر عبادات کے مقامات پر خود کش حملے کیے جا رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے معصوم اور بے گناہ انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ نہ صرف سرکاری و غیر سرکاری عمارتیں بلکہ اب تو اسکول، کالجز اور تعلیمی ادارے بھی اس سے محفوظ نہیں۔ دہشت گردی کا مسئلہ ایک سنگین صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جس نے نہ صرف پاکستان بلکہ ساری انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہر طرف دہشت گردی کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ انسان کو ایک

پل کی خبر نہیں کہ وہ گھر سے باہر جا کر واپس بھی لوٹے گا یا نہیں۔ ہر طرف جھوٹ، لالچ، ظلم و ستم اور حسد کی فضا قائم ہے۔ گویا یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ امن و سلامتی کے حالات اب خواب محسوس ہوتے ہیں اور دہشت گردی انسان کی فطرت معلوم ہونے لگی ہے۔ ہر طرف بدامنی اور انتشار کا دور دورہ ہے۔ پُر امن اور سکون سے بھرپور فضا میں سانس لینا انسان کے لیے اب ممکن نہیں نظر آتا۔ دہشت گردی کے عالمگیر مسئلے نے تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے۔ دنیا کا ہر طبقۂ فکر اب اس مسئلے کے حل کے لیے تدبیریں کرنے میں مصروفِ عمل نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ تمام انسانوں کا مشترکہ مسئلہ بن گیا ہے۔

کسی جگہ پر مثلاً کسی ملک، شہر یا علاقے میں خوف و ہراس، پریشانی یا کھلبلی کی فضا قائم کرنے کو دہشت گردی کی ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ قتل و غارت گری کی ابتداء پیدائش انسان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان جھگڑے کا انجام ایک بھائی کی موت پر ہوا۔ قابیل نے کرۂ ارض پر پہلا قتل کیا اور ہابیل پہلا مقتول تھا۔ روایت ہے کہ جنگل میں ہابیل سو رہا تھا اور قابیل نے وزنی پتھر اس کے سر پر دے مارا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس طرح خون خرابے کا آغاز ہوا اور ایک بھائی نے دوسرے کو اپنے ذاتی اغراض مقاصد کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

عصرِ حاضر میں کرۂ ارض کا کوئی کونہ دہشت گردی کے شکنجے سے محفوظ نہیں رہا۔ ہر جگہ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ آج وہ وقت آ گیا ہے کہ مرنے والے کو اپنا قصور معلوم نہیں اور مارنے والے کو یہ پتہ نہیں کہ وہ کیوں مار رہا ہے۔ اگر انسانی جانوں کا ضیاع ہی صرف مقصود ہو تو ایسی سوسائٹی میں امن و امان کا قیام ناپید ہو کر رہ جاتا ہے اور معاشرہ جنگل کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں انسان کی صورت میں درندوں کا راج ہوتا ہے۔ جن کے دل پتھر کے ہوتے ہیں اور رحم اور ہمدردی سے عاری ہوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں چوری، راہزنی، لوٹ مار، قتل و غارت اور خودکش حملے روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں۔

لفظ "دہشت گردی" عصر حاضر میں بکثرت استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ مختلف جگہوں پر اس کے مختلف معانی و مفاہیم ہیں۔ مگر ایک قدرِ مشترک بھی ہے۔ وہ ہے ظلم و ستم، تباہی، فسادات وغیرہ۔

لفظ دہشت گردی دو لفظوں کا مرکب ہے۔ دہشت + گردی۔ دہشت سے مراد خوف و ہراس اور گردی گردش سے ماخوذ ہے۔ گردش سے مراد چکر لگانا یا گھومنا پھرنا کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے "Terrorism" کی اصطلاح رائج ہے۔

آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری(Oxford Advanced Learner's dictionary)
میں اس کی وضاحت اس طرح ملتی ہے:

" The calculated use of violence or threat of violence to inculcate fear. Terrorism is intended to coerce or intimidate governments or societies in the pursuit of goals that are generally political, religious, or ideological.''(1)

دراصل لفظ" Terror "قدیم فرانسیسی زبان میں موجود تھا۔ میریم ویب سٹرز(Marriam Websters) میں اس کی وضاحت اس طرح ملتی ہے:

"The systematic use of 'Terror' especially as a means of coercion(2)"

اردو میں دہشت گردی کی اصطلاح فارسی سے آئی ہے۔ مولوی فیروزالدین اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

" دہشت گردی فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی ہیں معنی خوف و ہراس پھیلانا۔"(۳)

دہشت گردی میں" گردی" کی جگہ دہشت انگیزی بھی استعمال ہوا ہے۔ نوراللغات میں دہشت انگیزی کے معنی "خوفناک قسم کا خوف وہراس پھیلانا ہیں۔"(۴)

مختلف لغات میں دہشت گردی کے مختلف مفاہیم درج ہے جبکہ میرے مطابق دہشت گردی کو خوف، ڈر، پریشانی، ظلم وجبر، وحشت، تشدد، بدامنی، انتشار، درندگی، طاقت کا ناجائز فائدہ، تباہی و بربادی، خون ریزی، فساد، انتہاپسندی کے مفاہیم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

دہشت گردی کے مظہر کی بیشتر ادبیات بتاتی ہیں کہ دہشت گردی کے مفہوم کی سنجیدہ تعریف کی کوشش ۱۹۳۴ء میں کی گئی، ہارڈمین نے اس کی تعریف یوں کی کہ:

"یہ وہ نظریہ ہے جس کی رو سے کوئی منظم گروہ اپنے مبینہ اہداف کے حصول کے لیے بنیادی طور پر منظم تشدد کا استعمال کرتا ہے۔"(۵)

ماہرین نے دہشت گردی کے مختلف محرکات بتائے ہیں۔ مگر جو عنصر سب میں مشترک ہے وہ تباہی و تشدد اور سیاسی مقاصد کا حصول ہے۔ دہشت گردی ایک ایسا فعل ہے جس میں غور وخوض کے بعد تباہی اور تشدد کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور امن وسکون کی جگہ ظلم و بربریت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تباہی و بربادی سے

مراد عموماً تخریبی کاروائیوں کے ذریعے اپنے مقاصد کا حصول ہے اور ملک میں بدامنی اور انتشار پھیلانا ہے۔ وسیع پیمانے پر اگر دیکھا جائے تو اکثر اوقات غیر ملکی قوتیں طاقت یا پھر مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے ریاست کو شامل کر کے انتشار کی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی دہشت گردی "State Terrorism" کہلاتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں دہشت گردی Terrorism کی تعریف کچھ اس طرح ملتی ہے۔

> "Terrorism–the Systematic use of terror or unpredictable violence against government public or individuals to attain a political objective Terrorism has been used by political organizations with both rights and objectives by nationalistic and echoic groups by revolutionaries and by the armies and secret police of governments themselves".(6)

دہشت گردی، کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے حکومت، عوام یا کسی فرد کے خلاف باقاعدہ و منظم طور پر خوف و ہراس یا ناقابل تصدیق تشدد کے استعمال کا نام ہے۔ سیاسی تنظیمیں اپنے قدامت پسندانہ، جدت پسندانہ اور اہداف کے حصول کے لیے دہشت گردی کرتی ہیں۔ اسی طرح قوم پرست، نسلی و لسانی گروہ، انقلاب پسند گروہ اور خود حکومتی فوج اور خفیہ پولیس بھی دہشت گردی کا ارتکاب کرتی ہیں۔

گویا دہشت گردی کو مختلف ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے اپنایا جاتا ہے۔ جس میں مختلف ممالک، عام لوگ یا پھر تنظیمیں ملوث ہو سکتی ہیں۔ دہشت گردی کا اصل مقصد خوف و ہراس پھیلانا ہے۔ جس میں دہشت گرد عام عوام یا خاص لوگوں کو خونریزی کا نشانہ بناتے ہیں۔ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

> "Terrorism is the use or threat of violence to create fear alarm terrorists murder and kidnap people set off bombs, hijack airplanes, set fires and commit other serious crimes but the goals

of terrorists differ from those of ordinary criminal".[7]

خوف و دہشت اور خطرے کا ماحول پیدا کرنے کا نام دہشت گردی ہے۔ دہشت گرد لوگوں کو قتل و غارت اور اغوا کا نشانہ بناتے ہیں، بم دھماکے کرتے ہیں۔ ہوائی جہاں اغوا کرتے ہیں۔ آگ لگاتے ہیں اور اسی طرح کے شدید ترین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن دہشت گردوں کے اغراض و مقاصد عام مجرموں کی نسبت مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی ان مذموم عزائم میں ملوث عناصر لوگوں عمارتوں یا عبادت گاہوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ جس میں کئی جانوں اور املاک کی تباہی سامنے آتی ہے۔ میشل فوکو (Michel Foucault) کے مطابق:

''A new theory of crime emerged in nineteenth-century.France that put forward the conception of a "dangerous individual," whose criminal nature was a social fact sui generis, irrespective of actual criminal conduct: "Nineteenth century psychiatry invented an entirely fictitious entity, a crime which is insanity, a crime that is nothing but insanity, an insanity that is nothing but crime"[8]

"بے گناہ انسانوں کا قتل دہشت گردی ہے۔ اسی طرح انسانی املاک کو تباہ کرنا، انسان خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم کسی بھی مذہب کے لوگ ہوں جو پُر امن ہوں، جنگ میں آپ کے خلاف شریک نہ ہوں، ان کا تعلق خواہ کسی بھی ملک کے ساتھ ہو اور ملک بے شک آپ کے ساتھ حالت جنگ میں کیوں نہ ہو مگر وہ عوام جو جنگ میں ملوث نہیں ہیں۔ ان کو قتل کرنا، بوڑھوں، بچوں اور بیماروں کو مارنا، عبادت گاہوں، ہسپتالوں اور دیگر جگہوں پر بم دھماکے کرنا عام زندگی میں خلل ڈالنا، دوسروں کی جان و مال اور عزت کے لیے انہیں ہراساں کرنا، نظام زندگی کو درہم برہم کرنا، دنگا فساد، گھیراؤ کی دھمکی دینا اور دھمکیوں کے ساتھ ہڑتالیں کروانا، سیکیورٹی کو خطرے میں ڈال دینا، دوسرے کے مذہب پر حملہ کرنا، ان کی آزادی پر حملہ خواہ وہ کسی بھی نام پر ہو یہ دہشت گردی ہے اور جو ان کا ارتکاب کرے وہ دہشت گرد ہے۔"[9]

گویا دہشت گردی کو کسی بھی مذہب میں جائز قرار نہیں دیا گیا۔اسلام میں بھی عام انسان یا عبادت گاہوں کو نشانہ بنانے کی کوئی اجازت نہیں۔ دہشت گردی میں قیمتی جانوں کا ضیاع جس طرح ہوتا ہے اس کی کسی بھی مذہب میں معافی نہیں، کوئی بھی انسان کسی کا خون بہائے وہ مجرم ہے اور سزا کا حق دار ہے۔

ان تعریفوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم دہشت گردی کی بامعنی تعریف تین نظریات کی مدد سے کر سکتے ہیں۔

ا۔ دہشت گردی میں ملوث لوگ پاگل یا ذہنی مریض نہیں، نہ ہی یہ مظلوم اور مجبور ہیں۔

۲۔ بالعموم جو لوگ اس کا نشانہ بنتے ہیں وہ اصل ٹارگٹ نہیں ہوتے بل کہ اصل ہدف تو اس سے محفوظ ہی رہ جاتے ہیں۔

۳۔ دہشت گرد یا دہشت پسند دراصل یہ چاہتے ہیں کہ ان سے لوگ ڈریں اور یہ لوگ نفرت کے لائق ہوتے ہیں۔

میری ذاتی رائے کے مطابق دہشت گردی کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ :

"کسی ذاتی یا اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے ملکی و غیر ملکی املاک کو نقصان پہنچانا، بے گناہ لوگوں کا قتل و غارت اور کمزور لوگوں کو اپنے تابع کرنے کی جسارت دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔"

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کے دہشت گردی کا مقصد صرف لوگوں کو ایذا پہنچانا اور اپنے ذاتی مقاصد کا حصول ہے۔ چاہے اس میں کسی قسم کا بھی نقصان واقع ہو۔اس سب میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ تباہی و بربادی اور تشدد ہے۔

ج۔ دہشت گردی کا آغاز وارتقاء

دہشت گردی کی تاریخ بہت طویل ہے لیکن اس موضوع پر تحقیق ابھی نئی ہے، تحقیق کا یہ اہم موضوع گزشتہ تین دہائیوں میں بخوبی پھیلا ہے، اس کے باوجود کوئی مشترکہ تعریف وضع نہیں کی جاسکی، دہشت گردی کے پھیلاؤ میں اقتصادی اور معاشرتی اسباب کا تعلق کافی کمزور ہے، عالمگیریت کے تناظر میں دہشت گردی کی یہ تفہیم کوئی معقولیت نہیں رکھتی یا کم از کم اسے مرکزیت حاصل نہیں ہے۔

دہشت گردی کا آغاز زمانہ قدیم میں ہی ہو چکا تھا۔ مگر مؤرخین نے اس پر توجہ مرکوز نہ کی جس کی وجہ سے اس کے ارتقاء کے بارے میں کوئی حتمی شواہد موجود نہیں۔ اگرچہ سکرئی(Sicarii)ایک مشہور گروہ تھا جو کہ یہودی لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ متوسط لوگ یہودیت کے فروغ کے لیے بھی کام کرتے تھے۔ یہ لوگ

عبادت گاہوں پر چھٹی کے دنوں میں حملے کرتے تھے۔ ان کا اصل مقصد لوگوں میں خوف ہراس پیدا کرنا تھا۔انعام الرحمٰن سحری لکھتے ہیں:

"دہشت گردی کی تعریف اس لیے مشکل ہے کہ دہشت گردی کو مختلف موقعوں پر مختلف معانی دیے جا سکتے ہیں۔ مختلف ماہرین عمرانیات کے نزدیک دہشت گردی کی تعریف میں الگ الگ عناصر پائے جاتے ہیں۔ البتہ تاریخ دانوں نے دہشت گردی کے ضمن میں ملک ملک کی تاریخ صدیوں اور لمحوں کے حوالے سے پڑھی ہے۔انہوں نے لیڈران کی زندگیوں کو بھی کھنگالا ہے اور حکومت کی تبدیلیوں کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ پس انہوں نے معاشرتی اور معاشی حالات کی روشنی میں دہشت گردی کے صحیح مفہوم کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تعریف کے مراحل طے کرتے ہوئے بعض ماہرین عمرانیات دہشت گردی کو اس لیے بھی کوئی جامع روپ نہیں دیتے کہ کئی حکومتیں اپنے مذموم سیاسی مقاصد اور سیاسی انتقام کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس راستے سے ہوتے ہوئے وہ اپنے اپنے ملک میں موجود چھوٹی سیاسی جماعتوں کو ختم کر دینا پسند کرتی ہیں۔"(۱۰)

سیکاری فرقے کے لوگوں کے پاس چھوٹی سی تیز دھار تلوار جسے "Sica" کہا جاتا تھا، ہوتی تھی، اس کی مدد سے وہ لوگوں پر حملے کرتے تھے۔ان کی اس حرکت کی وجہ سے روم نے انہیں دہشت گرد قرار دیا تھا۔

"وہ اپنے مخصوص عقیدے یعنی The Fourth Philosophy کی ترویج میں لگے ہوئے تھے جس کے مطابق وہ زمین پر کسی کو خدا تسلیم نہ کرتے تھے اور راہبوں کو تو یکسر رد کر دیا تھا۔ کچھ تاریخ دانوں نے سکرئی کو ایسی معاشرتی تحریک کا نام دیا ہے جس میں غریب لوگوں کو امیروں پر حملہ کرنے اور انہیں دھتکار دینے کی ترغیب دی جاتی تھی۔اس فرقے نے جو طریقہ اپنایا تھا اس کی بنیاد پر ان کو دہشت گرد قرار دیا جا سکتا ہے۔"(۱۱)

یہودی دراصل فلسطین پر اپنا تسلط اور حکمرانی قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس طرح کی سرگرمیوں میں اس لیے مصروف رہتے تھے تاکہ انہیں تقویت حاصل ہو۔اس مقصد کے لیے انہوں نے یہودی برادری کو مجتمع کر کے دہشت گردی شروع کر دی اور اہل فلسطین پر ان کی زمین تنگ کر دی۔

دہشت گردی سیاسی و معاشرتی جنگ کی ایک شکل ہے،اور چونکہ جنگ شروع سے لے کر اب تک اس شکل کا سب سے اہم عنصر رہا ہے لہذا زمانہ عالمگیریت میں دہشت گردی اس جنگ کی دوسری سب سے اہم شکل قرار دی جاسکتی ہے، مستقبل میں دہشت گردی کا ادراک ٹیکنالوجی سے متاثرہ عالمگیری عوامل کی وجہ سے مزید وسیع اور گہرا ہو جائے گا۔

اگر دہشت گردی کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ۹۴ ۔ ۱۸۹۳ کے دوران "Regime De Terror" نامی جماعت سے دہشت گردی کی تحریک کی باقاعدہ ابتداء ہوئی۔ Terror اور Terrorism کے الفاظ اسی زمانے میں ہی رائج کیے گئے۔ اس کے بعد فرانسیسی ڈکشنری "Dictionary of Academic Francaise " میں دہشت گردی کا لفظ پہلی بار متعارف ہوا۔اس کے بعد اس کا استعمال قدرے عام ہوا اور دیگر لغات میں یہ لفظ مستعمل ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے حالات میں تبدیلی آتی گئی،اس کے معانی و مفاہیم میں بھی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وسعت آتی گئی۔ مگر پھر بھی ایک بات جو ہمیشہ مشترک رہی وہ تھی تباہی و بربادی اور طاقت کا بے جا استعمال۔ دہشت گردی کے آغاز کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے موجود نہیں۔ کیونکہ اڑھائی ہزار قبل مسیح تک دہشت گردی کے بہت سے واقعات لکھے ہی نہیں جاسکے تھے کیوں کہ تاریخ نویسی کا اس وقت باقاعدہ آغاز نہیں ہو سکا تھا۔

تاریخی طور پر دہشت گردی کے واقعات کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ تاہم دہشت گردی کی جدید صورت انیسویں صدی کے نصف میں ظہور پذیر ہوئی۔ دہشت گردی کے لیے مستعمل انگریزی لفظ "Terror" دراصل فرانس سے آیا ہے جو خود لاطینی لفظ ہے اور تاریخی طور پر انقلابِ فرانس کے بعد ۱۷۹۵ ء میں میکسمیلن روبیسپیرے (Maximilien Robespierre) کی انجمنِ یعقوبی (Club des Jacobins) کے کارناموں کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، انجمنِ یعقوبی نے اپنی تعریف کے لیے خود اس لفظ کی تشہیر کی اور ۱۷۸۹ء—۱۷۹۹ء کا زمانہ "دہشت" اور "خوف" کا زمانہ قرار پایا، تاہم انگریزی معنی کا ذمہ دار انگریز سیاستدان ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) ہے جو انقلابِ فرانس اور دہشت گردی کا سخت مخالف تھا۔ تاریخ انسانی میں رونما ہونے والی ہر قسم کی دہشت گردی کے نتائج انتہائی اندوہناک اور قابل عبرت ثابت ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی تاریخ عالم کے ان گنت ابواب ان سانحات سے بھرے پڑے ہیں۔ درندگی اور سفاکی نے بشری روپ دھار کر کئی بے گناہ اور معصوم انسانوں کو

موت کے گھاٹ اتارا اور انسانی اخلاقیات اور اقدار کو پس پشت ڈال کر قتل عام کیا گیا۔ دنیا کا وہ گروہ جو امن و آشتی کے گن گاتا تھا، اُسی نے نوع انسانی کے بخیے ہی ادھیڑ کر رکھ دیے۔ ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہٹلر نے جب ۱۹۳۳ء میں چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو اس نے نازیوں کی حکمت عملی صادر کرنے اور آمریت کے قیام میں کوئی دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایمر جنسی نافذ کی اور پریس اور اظہار رائے پر پابندی لگا دی گئی۔ لوگوں کی ذاتی زندگیاں خطرے میں پڑ گئی۔ ان کی گفتگو حتٰی کہ ان کی ڈاک وغیرہ تک بھی افسران بآسانی پڑھ سکتے تھے اور کسی وارنٹ کے بغیر ہی ان کے گھروں کی تلاشی لی جا سکتی تھی۔ ہٹلر نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دہشت گردی کے راستے اختیار کیے، لوگوں کو مختلف طرح کے لالچ دے کر ان کو یونیفارم پہنا دیئے گئے۔ یہ ضمنی پولیس اہل کار سڑک پر نکل کر نازی حکومت کے مخالفین کو مارنے لگ گئے۔ جرمن لوگ ان پولیس والوں کے خوف سے محض خاموشی دھار لیتے تھے۔ مگر دل سے نازیوں کی حالت حمایت نہ کرتے تھے۔ نازیوں نے ۲ مئی ۱۹۳۳ء میں تجارتی یونینوں پر قبضہ کیا۔ اسٹارم ٹروپرز (ایس اے) نے پولیس کے ساتھ مل کر تمام عہدے سنبھال لیے، محنت کشوں کی آزاد نمائندگی ختم کر کے نازی تنظیم کو جرمن محنت کشوں کی تنظیموں میں ضم کر دیا۔ ہٹلر نے چرچ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ اس طرح ویٹیکن جو کہ بطور آزاد مملکت کے فرائض سرانجام دے رہی تھی، نے ہٹلر کی حکومت کو رسمی طور پر جائز قرار دیا۔ مختلف طے پائے گئے معاہدوں کے باوجود نازیوں نے عیسائی مذہبی اور ثقافتی تنظیموں، اسکولوں اور اداروں پر ظلم و ستم جاری رکھا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء کو جب روس نے پوری طاقت سے افغانستان پر حملہ کیا تو دنیا نے یہ محسوس کیا کہ یہ کمیونزم کا دوسرا گھوڑا ہے۔ جس طرح تاشقند، بخارا اور سمرقند کو تاراج کر چکا، اسی طرح افغانستان میں بھی مکمل طور پر قابض ہو سکے گا۔ مگر افغانیوں نے اس نے بے لگام گھوڑے کو لگام لگانے میں کامیابی حاصل کر لی:

> "کمیونزم کا شاید اصل مقصد تھا ہر قوم کی آزادی اور نوآبادیاتی نظام سے ایشیاء و افریقہ کو نجات دلانا مگر روس کی کمیونسٹ پارٹی اقتدار ملنے کے بعد مفاد پرستی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اور سوویت یونین پر روسی آمریت غالب آتی چلی گئی اور وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں کو اپنی غلامی کے جال میں پھنسالیا۔" (۱۲)

امریکہ نے ویتنام میں ظلم کے پہاڑ ڈھائے۔ اس ملک کے زیادہ تر مکین بدھ مت، تاؤمت اور کنفیوشس کے پیروکار تھے۔ کسی بھی مذہب پر عمل نہ کرنے والے لوگوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمان اور عیسائی بھی چند ایک تھے۔ ۱۷۸۸ء میں ویتنامیوں نے منگول حملہ آور قبلائی خان کو شکست

دی تھی فرانس نے ۱۸۵۸ء میں اس کو اپنی نو آبادی بنالیا۔ جاپان نے جنگ عظیم دوم میں ویت نام پر اپنا تسلط قائم کیا اور اسی دور میں ہو چی منہ کی قیادت میں ویت نام کے قوم پرستوں نے مسلح چھاپہ مارا اور جنگ کی ابتداء کی۔ ہو چی منہ نے ویت نام کی کمیونسٹ پارٹی کو منظم کیا اور اس کے حریت پسندوں میں ۱۹۴۵ء میں جاپان کی کٹھ پتلی حکومت کے بنائے گئے شہنشاہ باؤ والی کو اقتدار چھوڑنے کے لیے مجبور کر دیا۔ فرانس نے ہو چی منہ کی کمیونسٹ پارٹی کو کچلنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا، لیکن ویت نام کی حریت پسند تنظیموں کے ہاتھوں فرانس کو شکست ہوئی۔ ۱۹۵۴ میں جنگ بندی کے معاہدے طے پا گئے۔ ۱۹۶۴ء میں امریکی فضائیہ نے ویت نام پر حملے شروع کر دیے۔

"دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانس اور امریکہ کے خلاف ویت نام کی جنگ طویل قومی جنگ تھی۔ آزادی کے لیے سب سے بڑی مسلح جدوجہد امریکی فضائیہ کے حملوں میں ہزاروں ویت نامی موت کی نیند سو گئے اور اس طرح امریکہ ویت نام کی جنگ میں براہ راست شامل ہو گیا۔"(۱۳)

ویت نام کی جنگ میں امریکہ کے اڑتالیس ہزار فوجی مارے گے۔ جنوبی ویت نام کی کٹھ پتلی حکومت کے مرنے والے فوجیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ جب کہ ہلاک ہونے والے شہریوں کی تعداد دس لاکھ تھی۔ اس جنگ میں صرف جنوبی ویت نام کے بے گھر ہونے والوں کی تعداد کا تخمینہ ۶۵ لاکھ لگایا گیا تھا۔ تین برس میں امریکہ نے ویت نام پر اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار حملے کیے۔ ۶۷ لاکھ ۲۷ ہزار ٹن بم گرائے اور وہاں کے باغات اور کھیتوں کو تباہ کرنے کے لیے ایک کروڑ نوے لاکھ گیلن تباہ کن مادہ خارج کیا اور زہریلی دوائیں چھڑکیں تاکہ ان کا اثر سو برس تک رہے۔ اس سارے منظر نامے میں ایک کروڑ کے لگ بھگ لوگ بے گھر ہوئے اور نوے لاکھ بچے یتیم ہو گئے۔ چھتیس لاکھ بانسٹھ ہزار لوگ ہلاک ہو گے۔ پندرہ لاکھ بچے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مگر حالات جوں کے توں ہی رہے۔ یہ خون ریزی تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام ہوا اور اس کے بعد ہی امریکہ اور اسرائیل کی مشترکہ دہشت گردی میں لاکھوں لوگ مارے گئے ۔ فلسطینیوں کے قتل پر امریکہ اسرائیل کی معاونت کر رہا ہے۔ اس طرح اسرائیل دہشت گردی دراصل امریکی دہشت گردی کی دوسری شکل ہے۔ امریکہ اور جرمنی نے ۱۹۹۲ء میں یوگو سلاویہ کو تقسیم کیا تو وہاں بھی دہشت گردی کا آغاز ہو گیا۔ بعد ازاں بوسنیا میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ جس کے نتیجے میں سال ۱۹۹۵ء میں تین سے پانچ لاکھ لوگ مارے گئے۔ امریکی فوج نے فیول ایئر بم، کروز میزائل اور کلسٹر بم سے یوگو سلاویہ پر حملہ کیا۔ جس میں دو لاکھ تیس ہزار شہری جان کی بازی ہار گئے۔ کلسٹر بموں کے نتیجے میں

لاکھوں افراد زندگی بھر کے لیے معذور اور مفلوج ہو گئے۔ بے شمار لوگ اپنی جانیں بچا کر محفوظ مقامات کی جانب بھاگ گئے۔ مگر راستے میں ہی قتل ہو گئے۔ کوسوو پر قبضہ کر کے آج بھی وہاں قتل عام جاری ہے۔

صدر جارج ایچ ڈبلیو بش (George H.W. Bush) نے عراق پر حملہ کیا تھا۔ آج تک بھی اہل عراق آگ اور خون میں نہلائے جا رہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء سے اب تک نو لاکھ سے دس لاکھ لوگ مارے جا چکے ہیں۔ ہر طرف موت کا سناٹا ہے۔ اس جنگ میں مائع یورینیم میزائل، فیول بم اور کلسٹر بموں کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ مائع پورینیم بم کے نتیجے میں کئی لوگ کینسر کا شکار ہو رہے ہیں۔ زہریلی فضا اور آب و ہوا میں سانس لینے سے اب تک دو لاکھ لوگ جاں بحق ہو گئے ہیں اور ہزاروں بچے معذوری کا شکار ہیں۔

مختلف ممالک کی اس طرح کی دہشت گردی کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ جس میں اقتدار کی ہوس، حکم رانی کی خواہش وغیرہ کے نتیجے میں لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ جس کا ازالہ ممکن ہی نہیں۔ سپر پاور بننے کی خواہش میں تمام بڑے ممالک انسانیت کی دھجیاں ہی بکھیر دیتے ہیں اور مظلوم ملکوں اور قوموں کی حالت زار کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ اس سارے عمل میں نسلوں کی نسلیں ہی تباہ ہو گئیں مگر طاقت ور کے سامنے کسی نے بھی ان ممالک کے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کی۔ جبر کی یہ صورت دہشت گردی کی کریہہ ترین صورت حال ہے۔ جس کی وجہ سے آغاز سے اب تک لاکھوں، کروڑوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔

ستمبر ۱۹۸۰ء کو عراق کے صدر صدام حسین نے امریکی اشارے پر ایران کے خلاف جنگ شروع کی جس کے نتیجے میں ۲۰ لاکھ مسلمان مارے گئے۔ صدام کو اس کا پچھتاوا ہوا تو امریکہ اس کا دشمن ہو گیا۔ امریکہ نے اس پر حملے کرائے اور پھانسی چڑھا دیا۔ عراقی عدالت کے امریکی غلام ججوں نے اس کو ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶ء کو تختہ دار پر چڑھایا۔ افغانستان کی سر زمین کو امریکہ نے روس کے خلاف استعمال کیا اور روس کے جاتے ہی وہ اہل افغانستان پر ہی حملہ آور ہو گیا ہے اور ان کو دہشت گرد کہہ کر بدنام کرتا رہا ہے۔

> "یہ نکتہ اہم بھی ہے اور پر اسرار بھی کہ بڑی طاقتوں کے لیے شروع سے ہی افغانستان پُر کشش کیوں رہا ہے۔ انیسویں صدی میں روس اور برطانوی طاقتیں اس پر قبضے کے منصوبہ بناتی رہیں۔ روس سے پہلے برطانوی سامراج انیسویں صدی میں شاہ شجاع کو لے کر افغانستان سے داخل ہوا اور کابل پر قابض ہو گیا۔"(۱۴)

دہشت گردی پر قانونی اور سیاسی بحث کی پہلی کوشش کی تاریخ ۱۹۳۷ میں لیگ آف نیشن کے سر جاتی ہے۔ جب عالمی دہشت گردی کی کوئی خاص تعریف وضع کرنے کی کوشش کی گئی تاہم اس وقت کے فکری

تنازعات کے سبب اس ضمن میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور بات اقوامِ متحدہ تک جا پہنچی جو کہ وہ بھی کوئی کارہائے نمایاں انجام نہ دے سکی، اگرچہ اس حوالے سے کوئی ۱۲ بین الاقوامی قراردادیں موجود ہیں، پہلی قرارداد ٹوکیو میں ۱۹۶۳ء میں منظور ہوئی جس کا تعلق جہازوں کی ہائی جیکنگ اور سول ایوی ایشن کی سلامتی سے تھا جس کے بعد ایسی ہی دیگر قرار دادیں منظور ہوئیں۔ تاہم امریکہ پر ہونے والے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں نے گویا ٹھہرے تالاب میں پتھر پھینک دیا اور کئی قرار دادیں منظور ہوئیں جس میں ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء کو دہشت گردی کی روک تھام کے لیے منظور ہونے والی اقوامِ متحدہ کی قرارداد ۱۳۶۸ء اور پھر اسی ماہ ۲۸ ستمبر کو منظور ہونے والی وہ قرارداد شامل ہے جس میں امریکہ کو بغیر حدود و قیود کے دہشت گردوں کے خلاف طاقت کے استعمال کی کھلی اجازت دے دی گئی۔ یہ سچ ہے کہ دہشت گردی کی روک تھام کے نام پر مبہم تعریفوں پر مبنی قوانین کا انبار تخلیق کیا گیا اور پھر عالمی پیمانے پر دہشت گردی کے خطرات کو ڈرانے، لوگوں کا منہ بند کرنے، شخصی آزادیوں کو سلب کرنے یا اپوزیشن کو دبانے کے لیے استعمال کیا گیا، دہشت گردی کے خلاف جنگ نے خوف اور لوگوں کی جاسوسی کو باقاعدہ ایک صنعت کی شکل دے دی ہے جس سے لوگوں کے درمیان بھروسے اور اخوت جیسی انسانی اقدار متزلزل ہوئی ہیں۔ دہشت گردی سے متاثرہ ممالک میں افراد کی شخصی اور جمہوری آزادیاں متاثر ہوتی ہیں، یعنی دہشت گردی کے خلاف جنگ بعض شخصی آزادیوں اور جمہوری اقدار کی قربانیاں مانگتی ہے جو کہ مغرب میں عالمگیریت کی اساس ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس جنگ میں عوام الناس کی آزادی کا خیال رکھا جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ دہشت گردی کے مفہوم کو مزاحمت سے الگ رکھا جائے تاکہ دونوں میں ابہام پیدا نہ ہو۔

د۔ دہشت گردی کے محرکات

دہشت گردی کسی بھی ریاست یا معاشرے کو درپیش خطرات میں سب سے سنگین خطرہ تصور کی جاتی ہے۔ یہ کسی بھی ملک کی بقاء اور سلامتی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ یہی معاملہ پاکستان کو درپیش ہے۔ دہشت گردی مسئلہ پاکستان کے لیے مسلسل لمحہ فکریہ ہے۔ دنیا میں انسانی جان کا شاید کوئی مول نہیں۔ یہ انمول ہے۔ سو برس کی عمر تک پہنچ کر بھی انسان میں مزید زندہ رہنے اور جینے کی جستجو ہوتی ہے۔ انسان ہر حال میں زندگی کا مقابلہ کرنے کی سعی کرتا ہے چاہے اسے بھوک، پیاس، بیماری اور غربت و افلاس جیسے مسائل اور تکالیف کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے پھر آخر وہ کون سے محرکات یا وجوہات ہیں جو زندگی کی سختیوں کو ہر حال میں جھیلنے والے انسان کو جو کہ اپنی زندگی کو سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، ساری حقیقتیں جانتے ہوئے بھی بارود سے

بھری خود کش جیکٹ زیب تن کر لیتا ہے اور خوشی خوشی انتہائی سفاکی کے ساتھ نہ صرف دوسرے انسانوں بلکہ اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کر لیتا ہے۔ آج دہشت گردی کے ہیولے سے ترقی یافتہ ممالک بھی خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ حملے کہیں بھی، کسی بھی مقام پر اور کسی بھی وقت ہو سکتے ہیں۔ اور اس سارے عمل میں انسان ہی ملوث ہیں جو کہ دوسرے انسان سے جینے کا حق ہی چھین لیتے ہیں۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ دہشت گرد کسی ماحول اور حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور وہ کون سے عوامل ہیں جو ایک معصوم انسان کو انسانیت سے گرے ہوئے فعل کا مرتکب کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان محرکات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ غربت و جہالت

۲۔ بے روزگاری

۳۔ پست معیار زندگی

۴۔ عدم استحکام

۵۔ مذہبی انتہا پسندی

۶۔ سیاسی جماعتوں کے مفادات

۷۔ صوبائی تعصب

۷۔ دہشت گرد تنظیموں کی فنڈنگ

۹۔ دہشت گردی کے سد باب کے لیے مناسب حکمت عملی کا فقدان

۱۔ غربت و جہالت

دہشت گردی کے فروغ میں غربت و جہالت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دہشت گردی ایک طبقاتی مسئلہ ہے جس سے دنیا کے لوگ خصوصا غریب طبقہ زیادہ متاثر ہے۔۔ شعور اور آگہی کا فقدان معاشرے کو تنزلی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ تعلیم سے ذہن روشن ہوتا ہے جب کہ جہالت تمام برائیوں کو جنم دیتی ہے جس میں نفرت، انتہا پسندی، ظلم، عدم برداشت اور جرائم وغیرہ عام برائیاں ہیں۔ پاکستان میں شرح غربت زیادہ ہونے کی وجہ سے دہشت گردی جیسے مسائل تواتر سے جنم لے رہے ہیں۔ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے مگر یہ جمہوریت بھی محض امیر طبقے یعنی "ایلیٹ کلاس" کی ہی خدمت کرتی ہے۔ اور اس جمہوریت کا حصہ بھی وہی لوگ بنتے ہیں جنہوں نے ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کی ہو۔ اس جمہوری نظام میں غربت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آج کے حالات میں ایک مڈل کلاس انسان بہت مشکل سے ہی گزر اوقات کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ دو وقت کی

غیرت کی روٹی کھانے کے لیے بھی لوگ ترس رہے ہیں۔ اگر ہم پاکستان کی صورتحال کا جائزہ لیں تو ابتداء میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ازبک اور چیچن باشندے قیام کی غرض سے آئے اور ان لوگوں نے مقامی آبادی سے کرائے پر مکان حاصل کیے اور وہیں کے مقامی لوگوں کو اجرت دے کر اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ ان باشندوں کے پاس دولت کی کمی نہ تھی اس لیے انہوں نے وہاں کے غریب عوام کو پیسے کا لالچ دے کر ایک طرح سے خریدنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کے جنوبی وزیرستان میں اس طرح اپنے قدم مضبوط کیے۔ غریب اور بے روزگار لوگوں کو اچھی آمدنی میسر آگئی اور ان کے حالات بہتر ہو گئے۔ اسلحہ کا استعمال وہ لوگ پہلے ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ ساتھ ساتھ ان چیچن اور ازبک باشندوں نے ان کو تربیت دینا شروع کی اور ان کو ٹریننگ میں یہ سکھایا جانے لگا کہ ان کا مشن کیا ہے اور کس طرح اس میں کامیابی حاصل کرنی ہے۔ ان معصوم لوگوں کو تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ وہ کسی بیرونی قوت کے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہیں۔ غربت کی نچلی سطح پر ہونے کے باعث وہ لوگ تو بس اپنا پیٹ پالنے کی غرض سے ان لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بن گئے۔ اس سارے گھناؤنے کھیل کی اصل وجہ وہاں کی مقامی آبادی کی غربت تھی۔ اگر یہی لوگ برسر روزگار ہوتے اور ان کے ہاں غربت وافلاس کے ڈیرے نہ ہوتے تو وہ یقیناً دہشت گردوں کو ان علاقوں میں افرادی قوت نہ ملتی۔ مگر ان لوگوں نے وہاں کی آبادی کی غربت اور تنگدستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہی وہاں پر قیام کیا اور دہشت گرد پیدا کیے۔

> "جہالت دہشت گردی کی وجوہات میں سے اہم وجہ ہے۔ عام طور پر دہشت گردی کا مسئلہ ان ممالک میں سامنے آتا ہے جہاں شرح خواندگی کم ہو۔ سرکاری ذرائع کے مطابق پاکستان میں اس وقت لٹریسی ریٹ ۵۸ فیصد ہے۔"(۱۵)

جو لوگ اپنا نام لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ وہ خواندہ کے زمرے میں آتے ہیں اب اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں درحقیقت شرح خواندگی کس سطح پر ہو گی۔ تعلیمی شرح کی کمی سے کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی اکثریت دینی علم سے بھی ناواقف ہے۔ اسی جہالت کی بنا پر دہشت گردی کے فروغ میں اضافہ ہوا ہے۔ جنت اور حوروں کے تصور لے کر لوگ خودکش حملوں کی آگ میں کود گئے اور بہت بڑی تعداد میں جانی ومالی نقصان کا باعث بن گئے۔

۲۔ بے روزگاری

دور حاضر میں بے روزگاری ترقی پذیر ممالک کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس بیروزگاری نے نوجوان نسل کو نہ صرف مختلف جرائم میں ملوث کر دیا ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان خودکشی کرنے پر مجبور ہو

گئے ہیں۔ جب تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انسانوں کا استحصال ہونے لگے، تو فارغ دماغ شیطان کا گھر ہی ہوتا ہے ۔ یہی نوجوان غلط کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں، غیر قانونی دھندوں میں پڑ کر جائز ناجائز طریقے سے پیسہ کماتے ہیں۔ کیونکہ آخر پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اسی چیز کا سب سے زیادہ فائدہ شر پسند اور ملک دشمن عناصر کو ہوتا ہے۔ یہ لوگ نوجوان نسل کو پیسے کا لالچ دے کر خرید لیتے ہیں اور ملک میں دہشت گردی کرنے پر اکساتے ہیں۔ یہ لوگ نوکریاں نہ ہونے پر حالات سے دلبرداشتہ ہو کر انہی کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں اور مستقبل سنوارنے کے بجائے ملک کی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ بے روزگاری کا شکار لوگ سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ جب مناسب روزگار ہی فراہم نہ ہو تو ناجائز ذرائع سے ہی پیسے کا حصول ممکن بنانے کے لیے نوجوان لڑکے خودکش حملے تک کر جاتے ہیں۔ پاکستان بے پناہ مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ ان مسائل نے ملک کی سالمیت کو بھی چیلنج کیا ہے۔ آج دہشت گردی کا مسئلہ جس طرح پاکستان کے لیے سب مسائل میں سر فہرست ہے، اس مسئلے کو جن مسائل نے جنم دیا ہے ان میں سے ایک بے روزگاری ہے ملک کے بہترین اداروں سے فارغ التحصیل نوجوان ہاتھوں میں ڈگریاں لیے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں۔ مگر ملک کو جن اقتصادی اور معاشی مسائل کا سامنا ہے، وہاں اچھی ملازمتیں تلاش کرنا ناممکن ہے۔ سرکاری اداروں میں بھی نوکری ملنا دشوار ہے کیونکہ حکومت کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں کہ نئے آنے والوں کو قابل عزت روزگار فراہم کیا جا سکے۔ پاکستان میں بڑھتی ہوئی آبادی بھی بیروزگاری میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔

۳۔ پست معیارِ زندگی

دنیا میں ہونے والی دہشت گری کے زیادہ تر واقعات پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو دہشت گردی میں ملوث لوگوں کا تعلق پست معیار زندگی سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ زندگی کی بیشتر نعمتوں اور آسائشوں سے بہت زیادہ محروم ہوتے ہیں اور لالچ اور ہوس میں نہ صرف بے قصور اور معصوم انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں بلکہ خود اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور دنیا و آخرت دونوں تباہ کر لیتے ہیں۔ جب معاشی صورت حال بدتر ہوتی ہے تو لوگ غربت کی زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر راستہ اپنانے سے گریز نہیں کرتے۔ انہی لوگوں کو جب کوئی قوت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی ہے اور روپے پیسے کا لالچ دے کر کوئی غلط کام کرنے کا مطالبہ کرتی ہے تو وہی لوگ بے دھڑک گناہ کی دلدل میں کود پڑتے ہیں۔ پست معیارِ زندگی بھی دہشت گردی کے فروغ میں ایک اہم محرک ہے۔

دہشت گردی کے فروغ میں سب سے زیادہ خود کش حملوں کا ہاتھ ہے۔ ان حملوں پر نوجوان لوگ بخوشی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ غربت کے ستائے ہوئے اور تعلیم سے محروم ان لوگوں کو یہی یقین دلایا جاتا ہے کہ حملے کے بعد جنت ہی مقدر ہے۔ ان ضعیف الاعتقاد لوگوں کا اعتقاد اس بارے میں اتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ ان حملوں میں دوسرے انسانوں کے ساتھ ساتھ خود کے جسموں کے بھی چیتھڑے اڑا لیتے ہیں۔ ان بے وقوف لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خود کشی اسلام میں حرام ہے اور اس کے بعد جہنم مقدر ہے اور ایک انسان کا قتل پورے عالم اسلام کے قتل کے برابر ہے۔ ان اسلامی احکامات کے ذریعے ہی ان لوگوں کو قائل کیا جائے تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں اور دہشت گردی میں ملوث طاقتوں کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ عدم استحکام

وہ ملک دہشت گردی کا شکار ہوتے ہیں جو عدم استحکام کا شکار ہوتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہی ہر طرف سے ایسے حالات پیدا کیے گئے تاکہ یہ ملک مستحکم نہ ہو پائے۔ پاکستان جمہوریت کے نام پر قائم ہوا تھا۔ مگر آمریت کا شکار ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اسے عدم استحکامی کا شکار ہونا پڑا۔ جمہوریت اور آمریت کے اپنے اپنے معاملات ہوتے ہیں۔ جمہوریت کا سارا دارومدار عوام پر ہوتا ہے جبکہ آمریت چند گروہوں یا طبقوں تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے عوام اور ان مخصوص گروہوں کے مابین معاشی عدم مساوات کا فروغ ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ملک میں بدامنی، انتشار، دہشت گردی معاشی عدم استحکام اور ریاستی اداروں میں تصادم آئین اور حلف سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ ملکی وسائل اور زرِ مبادلہ ملک کے مخصوص طبقات میں ہی تقسیم ہو کر محدود ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے عوام تک وسائل اور دولت کی منصفانہ رسائی ناممکن ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ آج ایک بھیانک صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ غریب عوام مہنگائی میں پستے چلے جا رہے ہیں اور دو وقت کی روٹی کا حصول بھی محال ہے۔ عام ضروریات زندگی مثلاً صاف پانی تک لوگوں کو میسر نہیں۔ سرکاری اسپتالوں میں مریضوں کے لیے بنیادی سہولیات کا فقدان ہے اور ادویات اور علاج انتہائی مہنگا ہے۔

آج پاکستان کی معیشت بتدریج تنزلی کی طرف جا رہی ہے۔ یہاں کے عوام تیسری دنیا کے لوگوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں مثلاً سندھ میں تھر میں قحط سالی کی وجہ سے سینکڑوں لوگ غذائی قلت کا شکار ہو کر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی سہولیات کا معیار بھی کچھ خاص نہیں۔ ایک جمہوری ملک میں مختلف طبقات کے درمیان اتنا بڑا تضاد ہی دراصل اس ملک کے عدم استحکام کا باعث بنتا ہے۔ یہ صرف نام کی ہی

جمہوریت ہے جو صرف امیروں اور طاقتور لوگوں کے لیے ہی آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ اس جمہوری ملک میں اساتذہ، انجینئرز یادانشوروں کے لیے اور دیگر تعلیم یافتہ لوگوں لے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے پاکستان آج اس موڑ پر آ ٹھہرا ہے جہاں کی معیشت تباہی کے دہانے پر ہے۔ بنیادی سہولیات کے فقدان اور بیروزگاری کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ تذبذب اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ایسی سرزمین میں شدت پسندی کو فروغ مل رہا ہے اور عوام میں غم و غصہ اور تعصبات جنم لے رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگ باآسانی غلط کاموں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور دہشت گردوں کے ہاتھوں استعمال ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں قانون تک فروخت ہو جاتا ہے چنانچہ انصاف کی عدم دستیابی بھی کسی ملک میں انتشار کی فضا برپا کر دیتی ہے۔ کیوں کہ جب کسی بے گناہ شہری کو انصاف کے لیے بار بار قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود بھی کچھ نہ میسر آئے تو پھر اس انسان کا ذہن انتقام اور بدلے کے جذبات کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور وہ قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر بنا کسی جزا سزا کی پرواکیے بدلہ لینے کے لیے خود ڈٹ جاتا ہے اور یہی حالات فساد کو جنم دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں انصاف میں تاخیر بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ سالہا سال عدالت میں مقدمات چلتے ہیں جس سے وقت اور پیسہ دونوں کا ضیاع ہوتا ہے مگر اس کے باوجود بھی ضرورت مندوں کو انصاف فراہم نہیں ہوتا جب کہ مخالف فریق طاقت اور حیثیت کے بل بوتے پر اثر ورسوخ کا استعمال کر کے اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں اگر کسی ملک میں انصاف کی فراہمی مشکل ہو جائے تو اس ملک کی جڑیں خود بخود کمزور ہو جاتی ہیں۔ اس ملک میں انتشار، بدامنی، غربت، فسادات اور قتل وغارت جیسے واقعات بہت عام ہو جاتے ہیں جس سے اس کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور امن وسلامتی کی جگہ عدم استحکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔

۵۔ مذہبی انتہا پسندی

معاشرے میں امن و سکون کو تباہ کرنے میں دہشت گردی کا بنیادی کردار ہے۔ دہشت گردی کی ایک اہم وجہ مذہبی انتہا پسند اور عدم برداشت ہے جس میں کسی دوسرے مذہب یا مسلک سے منسلک لوگوں کی رائے کا احترام نہیں کیا جاتا بلکہ مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کو غلط قرار دینے پر ہی زور دیتے ہیں اور بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی یہ لوگ انتہا پسندی میں اس قدر آگے چلے جاتے ہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کو کافر تصور کر کے واجب القتل قرار دیتا ہے۔

مذہبی انتہا پسندی معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ کے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ خاص کر مذہبی انتہا پسندوں اور فاشسٹوں کی محاذ آرائی نے سوسائٹی میں تصادم اور ٹکراؤ کی صورتحال پیدا کر دی ہے۔ انتہا پسند

صرف مذہب سے وابستہ لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تقریباً ہر طبقہ فکر میں سرایت کر گئی ہے ایک جانب مذہبی انتہا پسندوں کا گروہ اسلام کے نام پر بے گناہ اور معصوم انسانوں کو ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے اور دوسری طرف وہ لبرل فاشسٹ ہیں جن کی نظر میں ٹوپی، پہننے اور داڑھی رکھنے والا ایک سیدھا سادا انسان دہشت گرد ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

"ہماری تبلیغ و دعوت اور اصلاحی کوششوں کو بے کار کرنے اور تفرقہ اور جنگ وجدل کی خلیج کو وسیع کرنے میں سب سے زیادہ دخل اس کو ہے کہ آج کل اہلِ قلم علماء نے عموماً دعوت واصلاح کے پیغمبرانہ طریقوں کو نظر انداز کر کے صحافیانہ زبان اور فقرے چُست کرنے ہی کو بات میں وزن پیدا کرنے اور موثر بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اس سے کسی خطاکار یا گمراہ کی اصلاح کی کبھی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ اصلاح کی بجائے دلوں میں دشمنی کے بیج بوتا ہے اور عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے۔" (۱۶)

معاشرتی ناہمواری، غربت، انتہا درجے کی بے روزگاری اور انصاف کی عدم فراہمی بھی انتہا پسندی کے فروغ کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ رہی سہی کسر خستہ حال معیشت نے پوری کر دی ہے۔ جو معاشرہ غربت کی لکیر عبور کر جائے اور وہاں نچلے متوسط طبقات کے لیے اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم جیسے اخراجات پورے کرنا محال ہو جاتا ہے اس لیے وہ لوگ اپنے بچوں کو عصری تعلیم کے بجائے مدرسہ کی تعلیم دینا زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ مدرسوں میں بچوں کے لیے کھانا اور رہائش مفت ہوتے ہیں۔ جس سے بہت سے گھرانوں کے لیے گزراوقات کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ مگر ہمیں اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ بعض دینی مدارس مذہبی انتہا پسندی پھلانے کا سبب بن رہے ہیں۔ دنیا میں جب کوئی دینی مدرسہ یا مسجد تعمیر ہوتی ہے تو حکومت کی جانب سے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسا کوئی نظام نہیں۔ ان معاملات میں حد سے زیادہ کوتاہی برتی جانے کی وجہ سے بھی فرقہ وارانہ فسادات اور ناخوشگوار حالات رونما ہوتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے لاکھوں لوگ جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں مسلک سے متعلق اختلافات کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں مگر ہمارے معاشرے میں شدت پسندی کا عنصر حاوی ہے۔ اسی شدت پسند کی وجہ سے معاشرے میں فرسٹریشن بڑھتا جا رہا ہے۔ وسائل سے محرومی کی وجہ سے معاملات مزید سنگین ہو جاتے ہیں۔

انتہا پسندی نے جہاں بہت سے مسائل جنم دیئے ہیں۔ان مسائل کے حل کے لیے اعتدال پسندی نا گزیر ہے۔ ہمارے ہاں عقائد کے اختلافات کو خرد مندی سے قبول کر لیا جائے اور دلائل کے ذریعے بات کی جائے تو مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ سیاسی جماعتوں کے مفادات

مختلف ممالک کی سیاسی جماعتیں اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے متفرق ہتھکنڈوں کا استعمال کرتی ہیں۔ بعض اوقات وہ دہشت گردی کے واقعات کی پشت پناہی کر کے اپنے مفادات کی تکمیل کرتی ہیں۔ مثلاً امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بے پناہ پیسہ لگایا ہے اور کھربوں ڈالر اس مقصد کے لیے استعمال کر چکا ہے۔ وہاں کا اہلِ اقتدار طبقہ اپنی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑتا اور اپنی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اگر یہی رقم پسماندہ ممالک پر لگاتا تو شاید اس کا فائدہ زیادہ ہوتا۔ اسی طرح قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر ذاتی مفادات کے حصول کی وجہ سے دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے جو کہ لمحۂ فکریہ ہے۔

پاکستان ایک پسماندہ اور ترقی پذیر ملک ہے۔ جس کی عوام کا استحصال اس ملک کی سیاسی قوتوں کے ہاتھوں نہایت بے دردی سے ہو رہا ہے۔ جو سیاسی جماعت اقتدار کی کرسی پر بیٹھتی ہے وہ اپنے تمام وعدے بھلا کر عوام کا خون نچوڑنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ تمام سیاسی قائدین عوام سے ووٹ لے کر، ان کے حقوق پامال کر کے، انہی کے پیسے سے اپنے مفادات حاصل کر کے اپنی مدت پوری کر کے بینک بیلنس بنا کر یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں یا باقی زندگی عوام کے پیسے سے بنائی گئی دولت میں عیش و آرام سے بسر کر لیتے ہیں۔ ان کو پوچھنے والا یا احتساب کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی سیاسی جماعتیں اگر اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر ملک کی باگ ڈور ایمانداری سے سنبھالیں تو پاکستان دنیا کے نقشے پر مضبوط ترین ترقی یافتہ ملک کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ مگر حکمران اگر عوام سے ہمدرد ہوں تو ہی ایسا ممکن ہے۔ حالات اس کے برعکس ہیں۔ اگر سیاسی جماعتیں عوام سے مخلص ہو کر ان میں علمی شعور و آگہی پیدا کرنے کی حامی ہوتیں تو بجٹ میں سے ایک خطیر رقم تعلیم کے لیے مختص کی جاتی تاکہ لوگوں کی جہالت دور کی جا سکے اور پاکستان کے عوام کو ایک قابل عزت اور تعلیم یافتہ باشعور شہری بنایا جا سکے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ کیونکہ عوام کو لاعلم اور بے شعور رکھنا ان حکمرانوں کے مفاد میں ہے۔ اگر عوام کو شعور آجائے تو یہ لوگ کہاں سے اتنا مال بنا سکتے ہیں؟ اس لیے وہ بجٹ میں کم سے کم پیسہ تعلیم کے لیے مختص

کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں ان سادہ لوح عوام کو مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر انہی کا استحصال کرتی ہیں جو کہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔

۷۔ صوبائی تعصب

دہشت گردی کا ایک محرک صوبائی تعصب بھی ہے۔ ہمارے ملک میں صوبائی تعصب حد سے زیادہ ہے۔ ہر صوبہ اپنے مفاد کی باتیں کرتا ہے۔ جبکہ وہ ملک ترقی کرتے ہیں جن کے عوام صوبائی مفاد کے بجائے قومی مفاد کو ترجیح دیں۔ قوم، رنگ، نسل اور زبان کو زیادہ فوقیت دی جاتی ہے۔ چھوٹے صوبوں کی طرف سے ہمیشہ بڑے صوبوں پر اپنے حقوق کا پامالی کا الزام لگاتے ہیں جبکہ صوبائیت پرستی کے فروغ میں بیرونی طاقتوں کا بھی ہاتھ ہے۔ صوبائی تعصب سے ملک میں انتشار جنم لیتا ہے۔ اور بطور قوم ترقی کرنے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات اور اغراض و مقاصد کے حصول کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس لیے قومی عناد اور فرقہ واریت میں اضافہ ہوتا ہے۔ امریکہ نے افغانستان اور عراق پر حملے تو کر دیے مگر اس سے اس کے مخالفین میں بھی اضافہ ہوا۔ اکیسویں صدی میں دہشت گردی کی اصطلاح کے پوری انسانیت پر غالب اثرات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ اس نے تمام انسانوں کو خوف وہراس میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس اصطلاح کا مخصوص سیاسی و معاشرتی پس منظر ہے۔ مگر اکیسویں صدی میں اس کے معانی و مفاہیم زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ اس کی معنویت نے کسی خاص طبقے کے لیے اپنا رخ مختص کر لیا ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب کوئی مسلک نہیں ہوتا۔

امریکہ آج ایک عالمی سپر پاور بن چکا ہے۔ اس کی حمایت کرنے والے اسے محض ایک ملک نہیں بلکہ ایک دستورِ حیات کا نام دیتے ہیں۔ یہ ملک جغرافیائی حوالے سے تو اہم ہے ہی، اس کی معاشرتی، ثقافتی اور اخلاقی اقداری حدود بھی ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں کا سب سے زیادہ اثر ان ممالک پر پڑا جو اس سے بہت ہی زیادہ دور ہیں۔ ان ممالک میں افغانستان، پاکستان اور عراق شامل ہیں۔ ان ممالک کے باسیوں نے اس صدمے کو برداشت کیا۔ خاص طور پر ان لوگوں نے جن کی وہاں مستقل سکونت تھی۔ کوسوں دور رونما ہونے والے اس واقعے نے پاکستان کی معیشت، سیاست اور امن و سلامتی پر عالمگیر اثرات مرتب کیے۔ جن کو اگر منفی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ۹/۱۱ کے واقعہ میں کوئی پاکستانی ملوث نہ تھا۔ مگر اس واقعے نے پاکستان پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اس حملے کے نتائج کا براہ راست خمیازہ بھگتنا پڑا۔ افغانستان پر امریکہ کی طرف سے حملے ہوئے جن کا پاکستان پر بھی اثر ہوا۔ طالبان کے مخالف اور حمایتی سامنے آ گئے۔ ہر طرف سے پاکستان پر عالمی دباؤ بڑھ گیا۔ قوم دو طبقات

میں منقسم ہوئی۔ایک طرف امریکہ کے روشن خیال حمایتی اور دوسری طرف طالبان کی انتہاپسندی کے مخالف، دلائل کی بجائے اسلام اور کفر یا حق و باطل کی جنگ قرار دینے لگے اور نظریہ جہاد کو اپنے معانی و مفاہیم کی رو سے پیش کرنے لگے۔امریکہ نے آہستہ آہستہ اپنا رویہ جارحانہ کر دیا۔ جس کے رد عمل میں اس کے مخالف بھی پیدا ہونے لگے۔

پاکستان میں بیرونی طاقتوں کے شر پسند مقاصد کی وجہ سے صوبائی تعصب کو ہوا دی جارہی ہے تاکہ تمام دنیا کے سامنے پاکستان کی غلط تصویر پیش کی جائے۔ وہ ملک جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔اسی میں اسلامی اقدار کی پامالی فروغ پارہی ہے۔ قوم، مذہب، ملت، الغرض اس طرح کے انہی سب باتوں میں ذاتی عناد اور دشمنی کو سامنے رکھا جاتا ہے۔جب کسی معاشرے میں تعصب جنم لے لیتا ہے تو اس کی جڑیں کمزور ہوتے ہوتے کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔اس سے حالات میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور دہشت گردی کو فروغ ملتا ہے۔ ہم پاکستان کی تاریخ میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے علاوہ دیگر آفات کے نمایاں اثرات دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان پر مختلف تنازعات کی مد میں عالمی دباؤ بڑھتا جارہا ہے۔دہشت گردی کے واقعات کی وجہ سے آج پاکستان غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ہم اپنے گھروں میں محفوظ نہیں۔اس کے علاوہ مسئلہ کشمیر کی وجہ سے بھارت باقی ممالک کی جانب سے دباؤ بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ سارے عوامل ملک کی سالمیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دہشت گردی کا مسئلہ صرف پاکستان تک محدود تو نہیں مگر آئے روز رونما ہونے والے دہشت گردی کے واقعات نے پاکستان کا نام دنیا بھر میں بدنام کر دیا ہے۔ کوئی پاکستانی خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو، پاکستان میں ہونے والے واقعات سے لوگ اس کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گویا جو دہشت گرد پاکستان کے امن کو تباہ کر رہے ہیں وہ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک پاکستانیوں کے لیے بھی حالات پیچیدہ کر رہے ہیں۔ان کا کوئی مذہب تو ہے نہیں ورنہ اگر یہ مسلمان ہوتے تو سو بار اسلام کی تعلیمات پر غور کرتے۔ اس کے علاوہ جب بھی دنیا کے کسی کونے میں کوئی سانحہ یا دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوتا ہے تو الزام فوراً مسلمان پر ہی لگتا ہے۔ غیر مسلموں کے نزدیک اسلام انتہاپسندی کا دین ہے۔ان کے سامنے اسلام کا غلط تاثر دینے والے یہ نام نہاد مسلمان ہیں جو جہاد کے خود ساختہ معنی بنا کر دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہو کر تمام اہلِ اسلام کا دنیا کے سامنے غلط تاثر پیش کر رہے ہیں جو کہ صحیح نہیں۔

۸۔ دہشت گرد تنظیموں کی فنڈنگ

عصرِ حاضر میں دہشت گردی میں ملوث تنظیموں کی سرپرستی کرنے والے ممالک اب دنیا بھر میں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تمام ممالک ان تنظیموں کی فنڈنگ اور پشت پناہی کے حوالے سے ایک دوسرے پر الزامات لگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف مختلف ممالک دہشت گردی کی مخالفت کرتے ہیں۔ دوسری طرف الزام لگانے والے یہی ممالک بھی دہشت گردی کے فروغ میں کہیں نہ کہیں ملوث پائے گئے ہیں۔ ان ممالک میں جرمنی، فرانس اور برطانیہ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح طالبان کی تشکیل ۹/۱۱ کے بعد وجود میں آئی اور ان کی پشت پناہی میں امریکہ کا ہی ہاتھ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ دہشت گردی کو ناسور کہنے والے ہی دراصل خود بھی اپنے مفادات و مقاصد کے حصول اور بالادستی قائم کرنے کے لیے دہشت گرد تنظیموں کو استعمال کرتے ہیں۔

دہشت گردی میں ملوث تنظیموں کو ملنے والی فنڈنگ سے تنظیموں کے پاس جدید ٹیکنالوجی کا اسلحہ، آلات جراحی کے ساتھ ساتھ روپے پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں شامل تمام افراد کو بھرپور مالی معاونت کی بھی یقین دہانی کرائی جاتی ہے اور مرنے کے بعد بھی ان کے خاندانوں کی امداد کا وعدہ کر کے ان سے جائز و ناجائز ہر کام کرایا جاتا ہے۔ اس طرح ان تنظیموں سے وابستہ لوگ بلا جھجک، ظلم و استبداد کی گہری کھائیوں میں کود پڑتے ہیں جس کا نتیجہ آگ اور خون کی ہولی کا کھیل نوع انسانی کے قتل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مگر یہ بات قابل غور ہے کہ اعلیٰ پیمانے پر ہونے والی تباہی میں ملوث یہ تنظیمیں کہاں سے اتنے وسائل لاتی ہیں۔ اس کے پیچھے ایک بات بالکل عیاں ہے کہ جب تک ان تنظیموں کو کسی قوت کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہو سکتیں جہاں پر جس ملک کے ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول ہو، وہاں وہ ملک منظرِ عام سے غائب ہو کر ان تنظیموں کے ذریعے دہشت گردی کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۹۔ دہشت گردی کے سدباب کے لیے مناسب حکمتِ عملی کا فقدان

دہشت گردی کا مسئلہ کسی مخصوص قوم، معاشرے کے یا علاقے تک محدود نہیں بلکہ اس نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی ہے۔ گذشتہ عرصے میں ۴۰ ممالک کے سربراہوں نے ایک ریلی منعقد کی جس میں دہشت گردی کے خلاف مختلف قرار دادیں بھی پاس کی گئیں جن کا مقصد یہ باور کرانا تھا کہ دہشت گردی قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں مختلف ممالک کے سربراہان دوسرے ممالک کے دورے بھی کر

رہے ہیں تاکہ اس مسئلے کے سد باب کے لیے اقدامات کیے جا سکیں۔ اس مقصد کے لیے متاثرہ ملکوں کی سرحدوں کی نگرانی کی جارہی ہے اور دہشت گردوں کی سرپرستی اور فنڈنگ روکنے کے لیے مختلف اقدامات کیے جارہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی دہشت گردی کے واقعات میں کمی نہیں آئی۔ ان تمام حالات سے قطع نظر تمام ممالک اب تک کوئی واضح حکمتِ عملی تیار نہیں کر سکے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دہشت گردوں کا سب سے بڑا ہتھیار خود کش حملے ہیں۔ جن کا سدِ باب سب سے زیادہ ضروری ہے۔ تمام ممالک کی حکومتیں خود کش حملہ آوروں کو گرفتار کرنے پر ہی ساری توجہ مرکوز کر دیتی ہیں اور بعض اوقات اگر خود کش حملہ آور قبل از وقت زندہ حالت میں گرفتار ہو جائیں تو محض اسی بات کو ہی کامیابی سمجھ لیا جاتا ہے۔ مگر دہشت گردی کے اصل محرکات واسباب اور اس کی روک تھام پر توجہ مبذول نہیں کی جاتی۔ جب تک دنیا کے تمام ممالک دہشت گردی کے خلاف کوئی مناسب حکمت عملی تیار نہیں کریں گے، تب تک آئے روز دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے رہیں گے اور انسانیت کا قتل جاری رہے گا۔

ہ۔ دہشت گردی کی مختلف جہات

دہشت گردی کی بے شمار اقسام اور صورتیں ہیں۔ جن میں دہشت گردی کے مرتکب افراد، طبقہ، گروہ یا عالمی طاقتیں اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کے پیش نظر دہشت گردی کسی نہ کسی صورت یا جہت میں ملوث نظر آتی ہیں۔ کوئی بھی دہشت گرد انسانیت، مذہب، اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر چند روپوں یا مال و دولت کے لئے آگ اور خون کی ہولی کھیل کر قیمتی جانوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اگر اس سب کے پیچھے کوئی خاص نظریہ کارفرما ہو تو اس دہشت گردی کی دماغی حالت پر شک گزرتا ہے کیونکہ ایک صحیح العقل انسان کبھی بھی کسی بے قصور اور معصوم انسان کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ یہ سب کوئی ذہنی مریض ہی کر سکتا ہے۔ جو اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر معصوم لوگوں کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ پاکستان کے حالات پر اگر غور کیا جائے تو معاشی ناہمواری دہشت گرد کا سب سے بڑا سبب ہے۔ پاکستان میں اشرافیہ کا ایک طبقہ پوری مملکت پر حاوی ہے۔ وہی طبقہ تمام انسانوں کی قسمت کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایسی پالیسیاں اور لائحہ عمل وضع کرتا ہے کہ جس میں عدل و انصاف اور معاشی ہمواری کی توقع کرنا محال ہے۔ یہ طبقہ اپنے جیسے امراء کے لئے تو مراعات اور آسانیوں کے حالات پیدا کر دیتا ہے۔ مگر ایک مڈل کلاس اور غریب طبقے کے لئے دو وقت کی روٹی حاصل کرنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب انسان غربت و افلاس کی کھائی میں گر جائیں اور ان کے لئے باعزت طریقے سے دو وقت کی روٹی کا حصول بھی مشکل ہو جائے تو اس کا نتیجہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کی صورت میں سامنے آتا

ہے۔ایسے معاشرے میں صرف اور صرف بغاوت اور نفرت کے جذبات ہی ابھرتے ہیں۔ غریب انسان کی نہ تو معاشرے میں کوئی عزت ہوتی ہے اور نہ ہی قدر، تو ایسے لوگ اپنی جان کی پروا نہیں کرتے ۔ نہ ہی کسی دوسرے کی جان ان کے لئے قیمتی ہوتی ہے۔ جائز ناجائز طریقے سے پیسہ کمانا ہی ان کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ یا پھر مخصوص نظریہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے جس میں وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔

دہشت گردی کی مختلف صورتیں اور جہات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ انفرادی دہشت گردی

۲۔ گروہی دہشت گردی

۳۔ مذہبی دہشت گردی

۴ ۔ نسلی دہشت گردی۔

۵۔ ریاستی دہشت گردی

۶۔ لسانی دہشت گردی

۷۔ سیاسی دہشت گردی

۸۔ بین الاقوامی دہشت گردی

۹۔ معاشی دہشت گردی

۱۰۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے دہشت گردی

۱۱۔ آبی دہشت گردی

۱۔انفرادی دہشت گردی

وہ افراد جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور مفادات کے لیے مجرمانہ ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں اور دہشت گردی جیسے گھناؤنے فعل میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ یہ افراد زیادہ تر نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں یا پھر اپنے کسی ذاتی انتقام کی خاطر ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ معصوم اور بے گناہ انسانوں کو اپنے ذاتی مفادات کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ لوٹ مار جیسے فعل میں ملوث لوگ نہتے شہریوں کو موت کی آغوش میں دھکیل دیتے ہیں آئے دن چوری اور رہزنی کے واقعات میں ایسے سینکڑوں لوگ اپنی جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ بعض اوقات معاشرے میں عدم استحکام اور ناانصافی، محرومی اور ذہنی انتشار بھی انفرادی دہشت گردی کا سبب بنتے ہیں۔ لالچ اور حوس کے مارے لوگ اتنی کم قیمت پر خودکش حملے کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ لیکن

ایک ہی فرد کئی گھرانوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔اور پورا معاشرہ بے بسی کی تصویر بن جاتا ہے جس سے ملک کے حالات سنگین ہو کر ترقی کے بجائے تنزلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دور جدید میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث زیادہ تر کم عمر لڑکے ہیں۔جو کہ ابھی تک شعور کی بالیدگی تک نہیں پہنچے ہوتے۔ان کے ذہن ناپختہ ہوتے ہیں مگر جرأت اور بے باکی باشعور لوگوں کی نسبت ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ان کو آسانی سے مغلوب کیا جاسکتا ہے اور اوچھے ہتھکنڈوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس وقت ملک کے جو حالات ہیں ان میں کوئی بھی شہری مکمل طور پر محفوظ نہیں ہے۔دہشت گرد ملک کے نظام کو مکمل طور پر مفلوج کر دیتے ہیں۔انفرادی دہشت گردی کو آج کے دور میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ "تشدد" علامات اور اظہار میں واقع ہونے والی نمایاں تبدیلیوں کا اظہار ہے جو انفرادی دہشت گردی کی اصطلاح کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک ہے کیونکہ اسے ایک تحریک کی طرح اپنایا گیا تھا۔

پوری دنیا میں حالات تشویشناک صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔اس عفریت پر قابو پانا محال ہوتا جارہا ہے۔پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔بعض بیرونی عناصر اس کو امن کا گہوارہ بنانے کے بجائے اس کے امن و سکون کو برباد کرنے پر مصروف ہیں۔کم عمر اور معصوم بچوں کو برین واشنگ کر کے جنت اور حوروں کا لالچ دے کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ملک کے حالات کو ابتر کر دیا جاتا ہے۔انفرادی دہشت گردی مخصوص خصوصیات کی بنا پر ایک نئے رجحان کی حیثیت سے بہت مشہور ہو رہی ہے۔اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس بارے میں لوگوں کے رجحانات یا پھر نظریات الگ الگ نقطہ نظر کے پیش نظر انفرادی رہتے ہیں۔مسلمانوں میں اب دہشت گردی عروج پر پہنچ چکی ہے۔تمام ممالک مملکت کے مفادات کی مد میں دہشت گردی میں ملوث ہیں۔جبکہ مسلمانوں پر ایک حیرت یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنے کی بجائے خود کو گروہوں میں تقسیم کر لیا ہے اور اخلاقیات تک بھول گئے ہیں۔یہی صورت حال پاکستان کی ہے۔معاشرے میں بڑھتا ہوا ظلم ناانصافی، بدامنی اور غربت وافلاس انفرادی دہشت گردی کو ہوا دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جہالت و پسماندگی، انتہا پسندی اور دین سے دوری انفرادی دہشت گردی کی اصل وجوہات ہیں۔

۲۔ گروہی دہشت گردی

گروہی دہشت گردی میں نسلی، مذہبی اور سیاسی محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔اس میں ملوث وہ گروہ اور طبقات ہیں جو اسلام کو بطور ایک نظام حیات سمجھ ہی نہیں پائے اور اسلام کے اصولوں سے قطعاً نابلد ہیں۔اگر

مذہبی دہشت گردی کا جائزہ لیں اس میں بظاہر اسلام کا پرچار کرنے والے علماء جو کہ درپردہ یہود و نصاریٰ کے دوست بن کر امتِ مسلمہ کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں حق و باطل کے نام پر جنگیں کراتے رہتے ہیں اور کسی ایک گروہ کے حق میں بولتے ہیں تو کبھی دوسرے گروہ کے۔ بہت سی مذہبی تنظیمیں غیر ملکی ہاتھوں میں کھیل رہی ہیں اور ان سے وظیفے لے رہی ہیں۔ اور یہی تنظیمیں ملک میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان مذہبی تنظیموں کے خفیہ ایجنسیوں سے روابط ہوتے ہیں اور ان تنظیموں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

روس اور افغانستان کی جنگ ۱۹۷۹ء میں مسلمانوں نے جہاد کا نعرہ بلند کیا جس میں انہیں پوری مسلم برادری کی حمایت حاصل ہوئی۔ عالم اسلام سے وابستہ جہاد کے حامی جوق در جوق افغانستان آئے اور روس کے سامنے سینہ سپر ہوئے۔ جس کا نتیجہ افغانستان سے روسی افواج کے انخلا ۱۹۸۸ء کی صورت میں ہوا۔ اس جہاد میں حصہ لینے والے زیادہ تر لوگ افغانستان اور پاکستان میں ہی آباد ہو گئے۔ اور قبائلی علاقوں رہائش پذیر ہو گئے قبائلی علاقوں میں لینے والے اپنی لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ یہی لوگ دہشت گردی میں ملوث ہیں ۔ مگر کوئی اس بات پر غور نہیں کرتا کہ ان لوگوں کو دہشت گرد بنانے میں کون سے محرکات کار فرما ہیں۔ اگر امتِ مسلمہ شریعت کے اصولوں کے مطابق قوانین نافذ کرے اور اسلام کو عملی طور پر سمجھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی جائے تو یقیناً ہم اس قسم کی دہشت گردی سے بچ سکتے ہیں۔

گروہی دہشت گردی میں سیاسی دہشت گردی بھی شامل ہے۔ جس میں ایک سیاسی مکتبہ فکر سے وابستہ گروہ دوسرے لوگوں پر اپنی سیاسی رائے مسلط کرتے ہیں جس کی وجہ سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سیاست دان لسانی بنیادوں پر دہشت گردی کرتے ہیں۔ اور تشدد اور جبر کی کاروائیاں کر کے ملکی سالمیت کو نقصان پہنچاتے ہیں تاکہ ملک میں عدم استحکام پیدا ہو مگر ان کی سیاست مضبوط ہو۔

سیاسی دہشت گردی کے علاوہ لسانی دہشت گردی میں ملوث لوگ قومیت کی بنیاد پر ملک میں انتشار پھیلاتے ہیں۔ پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچی قومیت کا پرچار کرنے والے گروہی دہشت گردی کا ایک حصہ ہیں۔ ان گروہی دہشت گردوں کا قلع قمع کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ ملک میں روزگار، صحت اور تعلیم کے یکساں مواقع میسر ہوں اور سیاسی نظام مستحکم ہو اور مستحق لوگوں کو ان کے حقوق کی فراہمی یقینی بنائی جائے۔

۳ ۔ مذہبی دہشت گردی

"دہشت گردی" کی اصطلاح کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ آج کے عہد میں دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں تین طرح کے نظریات کے تحت جدوجہد کی جارہی ہے۔ چند ممالک مذہبی بنیادوں پر مسلح جدوجہد کررہے ہیں۔ توچند میں قومیت کی بنیاد پر یاچند ملک ترقی پسندی، لادینیت یاپھر کمیونزم کی بنیادوں پر جدوجہد کر رہے ہیں۔ مذہبی مسلح کاروائیوں کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت، اسلام اور ہندومت وغیرہ کی تقلید کرنے والے مختلف ادوار میں جدوجہد کرتے رہے۔ مذہبی عسکریت پسند تنظیموں کے مربی ممالک ان گروہ کو اپنے مخالف ممالک کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور بہت بڑے پیمانے پر دہشت گردی پھیلاتے ہیں مثلاً اسرائیلی حکومت نے ایک فلسطینی تنظیم "حماس" کی پشت پناہی اور یاسر عرفات کی تنظیم پی۔ایل۔او کے خلاف استعمال کیا۔ مگر بعدازاں حماس نے اسرائیلی مخالفت کی اور دیگر فلسطینی تنظیموں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ماضی میں جو مذہبی عسکری تنظیمیں یورپی خلیجی ممالک اور امریکہ کی حمایتی تھیں، اس کے لیے ضروری نہیں، وہ ہمیشہ ہی ان کی خیر خواہ رہی ہوں۔ ان مذہبی دہشت گرد تنظیموں کے مربی ممالک کی غلطیوں کا خمیازہ پوری دنیا کو ہی بھگتنا پڑا ہے ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آخر میں ایک مذہبی عسکریت پسند تنظیم القاعدہ قائم ہوئی۔ مگر اس کے بطن سے بے شمار بین الاقوامی تنظیمیں وجود میں آچکی ہیں۔ جو کہ دنیا کے دیگر خطوں میں اپنی کاروائیاں کررہی ہیں۔ اس طرح کا کیشیا کے علاقے چیچن مذہبی دہشت گرد گروہ ہے۔ جو کہ انگوشتیا اور چیچنیا میں دہشت گردی کی کاروائیاں کررہے ہیں۔ برصغیر کے ممالک بنگلہ دیش، برما اور بھارت میں بھی القاعدہ اپنی کاروائیاں کرتی رہتی ہے۔

مذہب اس کائنات کی طاقتور قوتوں میں سے ایک ہے جو کہ انسانی رویوں پر حد درجہ اثر انگیز ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو بے شمار جانیں انہی مذہبی عقائد کی نذر ہو چکی ہیں اور صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ لوگوں میں اکثر اوقات مذہب کے نام پر اس قدر غیر لچک دار رویے سامنے آتے ہیں کہ وہ مذہب کے نام پر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ مگر عقائد میں تبدیلی پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔ عقائد کی بنیاد پر کئی بے گناہ اور معصوم لوگوں کو ہلاک کردیا جاتا ہے۔

جہاں تک مذہبی دہشت گردی کا تعلق ہے تو دنیا کے کسی بھی مذہب اور کسی بھی مسلک میں دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں۔ خاص کر اسلام میں تو دہشت گردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں تبلیغ کے لئے تلوار نہیں بلکہ دلائل، سچائی اور استدلال پر زور دیا گیا ہے۔ دنیا کا ہر مذہب

امن وآشتی کا درس دیتا ہے۔اور فتنے فساد، جبر واستبداد اور تخریبی کاروائیوں کی کسی مذہب میں بھی جگہ نہیں۔ مگر لوگوں میں چند ایسے شر پسند عناصر موجود ہوتے ہیں جو کہ مختلف مذاہب کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔ ان لوگوں کی فتنہ پروری کی وجہ سے دہشت گردانہ عزائم پروان چڑھتے ہیں۔ پاکستان میں ہمیشہ شیعہ سنی فسادات کو ہوا دی جاتی رہی ہے، ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> "مذہبی دہشت گردی میں مذہبی اختلافات میں شدت ہوتی ہے۔ایک گروہ اپنے مذہبی رجحانات کی وجہ سے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل، اور حق کے غلبے کے لئے طاقت کے استعمال کو جائز سمجھتا ہے۔ پاکستان میں شیعہ سنی اختلافات ہمیشہ حساس مسئلہ رہا ہے۔ کسی مناسب افہام و تفہیم نہ ہونے کی وجہ سے تصادم کی صورت پیدا ہوتی رہی۔ تشدد پسند تنظیمیں وجود میں آئیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کے واقعات رونما ہونے لگے۔"(۱۷)

دہشت گردی کے فروغ میں جہاد کے نام پر قائم ہونے والی تنظیموں کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ ان جہادی تنظیموں کی وجہ سے امن وسکون برباد ہو چکا ہے۔ان تنظیموں سے وابستہ لوگ معصوم انسانوں کو ورغلا کر اور بے گناہ طلباء کے برین واش کر کے انہیں دہشت گردی جیسے گھناؤنے کھیل میں ملوث کر دیتے ہیں۔ جبکہ ان دہشت گردوں کے نیٹ ورک کے سربراہ پس پردہ تمام تر کاروائیوں کو خود چلا رہے ہوتے ہیں۔ یہ معصوم اور بے گناہ طالب علم ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور ان کے منصوبوں کی تکمیل کرتے کرتے دیگر سینکڑوں، ہزاروں معصوموں کی جانیں ختم کر کے خود بھی لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ یہ دہشت گرد خود اپنی کمین گاہوں سے باہر نہیں نکلتے۔ان کے خاندان اور وہ خود تو محفوظ ہوتے ہیں مگر ان کے ناپاک عزائم کی وجہ سے کئی خاندانوں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں کسی بھی انسان کی بلاوجہ جان لینا جائز نہیں۔ خون خرابے سے دہشت گردی کی فضا جم لیتی ہے۔ اسلام کے علاوہ بھی دیگر مذاہب کی یہی تعلیمات ہیں۔ اسلام میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ جس نے ایک شخص کی جان لی گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ اسلام میں تحمل اور برداشت کا بار بار درس دیا گیا ہے۔ یہ دین روشن ہے۔ تحمل اور برداشت اگر کسی معاشرے میں نہ رہے تو اس معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو جاتا ہے۔

"امت کا اختلاف اس وقت تک رحمت رہتا ہے جب تک یہ علمی حلقوں اور علماء کے درمیان رہے لیکن جب یہ اختلاف علمی واجتہادی رہنے کی بجائے سیاسی مقاصد، منفعت برداری اور حصول دنیا کے لئے استعمال ہونے لگے تو باعث زحمت بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے امت کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے، ہر گلی محلے میں ایک عام شخص بھی اختلافی مسائل پر گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ فروعات میں الجھ کر لوگ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے ہیں جو باہمی دشمنی میں تبدیل ہو جاتا ہے، مسلمان، مسلمان کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کو کافروں سے بھی بدتر جاننے لگتے ہیں۔"(۱۸)

پاکستان میں مذہبی عدم برداشت کا مسئلہ گھمبیر ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے مغربی ممالک میں پاکستان کو دہشت گرد ملک تصور کیا جاتا ہے اور اسلام کو جارہانہ مذہب سمجھا جاتا ہے۔ جس میں دہشت گردی کو فروغ دینے کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ الزام سراسر غلط ہے۔ پاکستان میں دہشت گرد تنظیموں کی وجہ سے حالات بگڑتے جارہے ہیں۔ شیعہ سنی فسادات میں بے پناہ معصوم لوگ جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر دہشت گردی آج کل عام ہوتی جارہی ہے۔ مذہبی دہشت نے پاکستان کے امن وسکون کو غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ دہشت گردی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی مذموم کاروائیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ جن کی وجہ سے پاکستان کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

ان کی کاروائیوں میں ہزاروں بے گناہ افراد اپنی زندگیاں ہار چکے ہیں۔ یہ لوگ مذہب کی آڑ میں خود مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ اور عبادات میں مشغول بے شمار لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جنہوں نے پاکستان کے امن کو خطرے میں ڈال دیا، یہ تو نہ ہی مسلمان ہو سکتے ہیں اور نہ ہی پاکستانی۔

پاکستان میں اکثر مذہبی اداروں کو مسلکی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ جن سے وابستہ لوگ مختلف عقیدوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ اہل سنت عقیدہ رکھنے والے اپنے قائم کردہ اداروں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اہل تشیع مسلک سے وابستہ لوگوں کے اپنے ادارے ہیں۔ اہل حدیث مکتبۂ فکر کے لوگ اپنے اداروں کو فوقیت دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے افکار اور خیالات میں واضح اختلاف ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے درمیان کبھی بھی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے مسلک کے مطابق پڑھائی جانے والی کتب میں بھی فرقہ واریت کو ہوا دی جاتی ہے اور طلبا و طالبات جب تعلیم مکمل کر کے نکلتے ہیں تو ان میں مذہبی انتہا پسندی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دوسرے فرقوں سے وابستہ لوگوں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں

کرتے۔ضیاءالحق کے دور حکومت میں مذہبی انتہاپسندی کو بہت فروغ ملا۔اسی دور میں فرقہ ورایت حد سے بڑھ گئی۔اس ضمن میں موسیٰ خان جلال زئی لکھتے ہیں:

"ضیاءالحق کے دور میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں جو کاوشیں کی گئیں۔ان سے مذہبی منافرت،فرقہ واریت اور دہشت گردی کو فروغ ملا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے کام کی مختلف مکاتب فکر کے علماء نے مخالفت کی اور کسی بھی ایک مسلک کے نفاذ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں سپاہ صحابہ فقہ ءجعفریہ اور جمعیت اہل حدیث کے سربراہوں کو قتل کر دیا گیا۔ان کے قائم کردہ مدارس کے براہ راست روابط بعض اسلامی ممالک کے ساتھ تھے جنہوں نے ان کے پیسے اور اسلحے کے ذریعے مدد کی۔ان ممالک سے ملنے والی رقوم کے بعد ہر فرقے نے مدارس کو چلانے کے لئے ایک تنظیم قائم کرلی۔ دیوبندیوں نے وفاق المدارس، بریلویوں نے تنظیم المدارس العربیہ، اہل حدیث نے وفاق المدارس سلفیہ، اہل تشیع نے جامعہ محمدیہ المنتظر اور جماعت اسلامی نے رابطۂ مدارس اسلامیہ کے نام سے تنظیمیں بنالیں۔" (۱۹)

مذہبی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مختلف طبقات اور لوگوں کو سر جوڑ کر دہشت گردی کے خاتمے کے لئے کوئی حکمت عملی تیار کرنی پڑی گی۔ہر مذہب میں انتہاپسند لوگ موجود ہوتے ہیں جو کہ فرقہ واریت کو فروغ دیتے ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔وقت وقت کی بات ہے۔ایک دور میں عبادت گاہوں کو امن و آشتی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔لوگ آپس میں اتفاق و محبت سے رہتے تھے۔اس ضمن میں تصدق حسین لکھتے ہیں:

"تاریخ شاہد ہے اور مغربی دنیا نے اسے تسلیم کیا ہے کہ سلطنت عثمانیہ میں مسلمان اور عیسائی سیر و شکر ہو کر زندگی گزارتے تھے۔ ہم اس موضوع کے حوالے سے جب اپنے وطن عزیز پر نظر ڈالتے ہیں تو دہشت گردی کی وارداتوں میں فرقہ واریت کا ہاتھ ہی کارفرما نظر آتا ہے۔ مساجد،امام بارگاہیں اور گرجے غیر محفوظ ہو گئے ہیں جو کبھی امن و سلامتی اور تحفظ کے ایسے مقامات ہوتے تھے جن کے باہر نہ کبھی مسلح گارڈ کھڑے کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی نہ کسی عبادت گاہ کے اندر عبادت میں مصروف لوگ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔"(۲۰)

اسلام میں دہشت گردی ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔تاریخ میں مسلم فاتحین اور حکمرانوں کے اچھے اخلاق اور اعمال کے قصے بھرے پڑے ہیں۔ مگر آج کا دور اس عظیم دور سے بالکل مختلف ہے۔آج انسان اعلیٰ اقدار کو پس پشت ڈال کر خرافات میں پڑ چکا ہے۔اخلاق حسنہ کا فقدان ہونے کی وجہ سے تخریب کاری کو فروغ مل رہا ہے۔ دہشت گردی کے فروغ میں فرقہ واریت کا بھی اہم کردار ہے۔امام بارگاہوں اور مسجدوں میں سیکیورٹی کے باوجود بھی لوگ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔دہشت گردی میں اضافے کی ایک خاص وجہ عدل وانصاف کا فقدان ہے۔

جن کو عدل وانصاف نہیں ملتا تو وہ دہشت گرد تنظیموں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ان کی مذہبی تعلیم، خوف خدا سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ پیسے کی خاطر یا انتقام کی خاطر دوسروں کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اس حوالے سے مذہبی رہنماؤں اور پیشواؤں کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔وہ اگر چاہیں تو اپنے اپنے فرقے کے افراد کو فروعی اختلافات ختم کر کے دوسرے فرقوں کے لوگوں سے مل جل کر امن وآشتی سے زندگی گزارنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔عدالتوں میں انصاف بلا امتیاز ملنے لگے اور قانون سب کے لئے یکساں ہو جائے۔

عصر حاضر میں اہل مغرب جو کہ عدل وانصاف اور انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار بنے ہوئے ہیں، وہی لوگ مذہب کو بنیاد بنا کر انسانیت سوز مظالم میں پیش پیش ہیں۔ان کے ظلم وستم کی داستانوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔یہ لوگ مذہب کی آڑ میں بوڑھوں بچوں اور عورتوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ان کے خیالات میں دنیا کے سامنے کوئی اور رائے ہوتی ہے جبکہ پس پردہ کوئی اور ایک مغربی خاتون کرسٹینا جو کہ افغانستان کی جنگ میں قید ہوئی تھی۔وہ انٹرویو میں کہتی ہے کہ :

"بچوں کا خوف اور پٹیوں میں زخمی لپٹا ہوا دیکھنا اب میرے بس کی بات نہیں ہے۔"(۲۱)

کرسٹینا کی اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کہ مذہب کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنا کر کچلا جا رہا ہے۔ فی زمانہ دنیا کے تمام رہبانی مذاہب میں بھی دہشت گردی کو کسی صورت جائز نہیں قرار دیا گیا نہ ہی کسی بات کو بنیاد بنا کر اس اجازت دی گئی ہے۔

دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں امن کا درس ملتا ہے جبکہ اسلام تو نام ہی امن کے مذہب کا ہے۔اس میں رحم دلی، الفت ومحبت، اور امن وآشتی کا درس دیا گیا ہے۔اسلام محبت اور بھائی چارے کا دین ہے۔ جس میں کسی انسان کو دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔دہشت گردی اسلام میں کریہہ

ترین عمل ہے جس کو سخت گناہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس میں ظلم و بربریت اسلام کے درس کے منافی ہے۔۹/۱۱ کے واقعہ میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے یعنی اسلام،عیسائیت اور یہودیت کے پیروکاروں کی جانیں ضائع ہوئیں۔اور پوری انسانیت کو ضرر پہنچا گویا دہشت گردوں کا کوئی دین یا مذہب نہیں ہوتا۔وہ مذہب کی تعلیمات سے بے بہرہ ہو کر انسانیت سوز مظالم کر کے دنیا میں بھی گنہگار ہوتے ہیں اور بعد میں بھی جہنم واصل ہوں گے۔کیوں کہ جہاد کے نام پر دہشت گردی کرنے والے مسلمان تو کجا،انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں۔

۴۔نسلی دہشت گردی:

نسل کی بنیاد پر کی جانے والی دہشت گردی کو نسلی دہشت گردی کہا جاتا ہے۔دنیا میں نسلی دہشت گردی اس وقت عروج پر ہے۔نسل پرستی کی بنیاد پر خاندان کے خاندان قتل کر دیے جاتے ہیں۔رنگ و نسل کی بنیاد پر لوگوں کی تضحیک و تذلیل عام ہے۔نسلی تعصب کی بنا پر مسلمانوں کو بھی بہت کچھ سہنا پڑ رہا ہے۔امریکہ میں مسلمان اپنی بقاء اور شناخت کے امریکہ چیلنج سے دوچار ہیں۔

"اگر سفید نسل پرست تنظیم کو کلبس کلان (kkk) کی دہشت گردی سیاہ فام امریکیوں اور دوسری نسل ورنگ کے لوگوں کے قتل اور ان کے گھروں کو جلانے والے ریکارڈ کے باوجود سفید نسل کے تمام لوگوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تو پھر واہمہ کی بنیاد پر جس کی ابھی تصدیق بھی نہ ہو سکی ہو کہ 11 ستمبر کے واقعہ کے اصل ملزم کون ہیں؟پوری مسلم قوم کو دہشت گرد کیوں قرار دیا گیا۔"(۲۲)

پاکستان میں اقلیتوں پر اگر حملہ کیا جائے تو اس کی بازگشت پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے جبکہ غیر مذاہب میں مسلمانوں کا قتل عام کسی کے لئے اہمیت نہیں رکھتا۔مگر بد قسمتی سے پاکستان کو آج جو حالات درپیش ہیں۔ان میں دہشت گردی سر فہرست ہے۔اس ملک میں دہشت گردی اپنی آخری حد کو چھو رہی ہے۔اس ملک میں ریاست کا وجود سوالیہ نشان بنتا جارہا ہے۔عوامی حقوق جیسے صحت، تعلیم، روزگار اور رہائش کے مسائل کی ذمہ داری سرانجام دینا تو بہت دور کی بات ہے۔یہاں تو امن وامان کا قیام بھی ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔آج اس ملک میں رہنے والے بالکل محفوظ نہیں رہے۔لوگوں کے ذہنوں میں ایک خوف سرایت کر گیا ہے کہ آنے والے لمحات میں وہ سانس لے بھی رہے ہوں گے یا نہیں۔وہ لوگ جو بظاہر تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں اور ریاست کے مختلف اداروں میں ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں،انہی میں سے کسی بھی وقت دہشت گرد برآمد ہو جاتے ہیں۔یہ لوگ عام لوگوں میں رہ کر ہی منصوبہ بندیاں کرتے ہیں اور بہت آسانی سے لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ کھیل جاتے ہیں۔

عام مسلمانوں کو کافر قرار دینے کا کام جہادی تنظیمیں ہی نہیں کر رہیں بلکہ تبلیغ کے شعبہ سے منسلک جماعتیں اور لوگ دین سے ناآشنا، سادہ لوح اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو ذہنی و فکری حوالے سے کافر سمجھنے اور کہنے کی طرف لے جاتی ہیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات دیگر مسالک سے وابستہ لوگوں کو واجب القتل قرار دے کر فتوے دے دیئے جاتے ہیں اور اس طرح بے گناہ لوگوں کو بم دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ اور خودکش حملوں میں موت کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

عام لوگوں کی تکفیریت مسلک عقیدے اور لوگوں کو گناہ گار قرار دے کر کی جاتی ہے۔ کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شریعت پر عمل پیرا نہیں اور کسی کو اقلیت ہونے کی بنا پر قصوروار بنا دیا جاتا ہے۔ مثلاً برما میں ہونے والا مسلمانوں کا قتل عام نسلی بنیادوں پر کیا گیا کیونکہ وہاں کے مسلمان اقلیت کی صورت میں قیام پذیر ہیں۔ ان کو مسلمان ہونے کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا اس وقت گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ فاصلے سمٹ چکے ہیں۔ لہذا کسی بھی ملک کا تنہا رہنا آج کے دور میں ممکن نہیں۔ نہ صرف مسلم ممالک بلکہ غیر مسلم ممالک کے ساتھ تجارت اور دیگر معاہدے کرنا ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی مسلم ملک کسی غیر مسلم ملک کے ساتھ تعلقات استوار کرتا ہے تو دیگر مسلم ممالک اس پر کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگانے والوں کی جانب سے سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

> ترجمہ:- " اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے دوستی رکھے گا، تو وہ انہی میں سے ہو گا۔ "(۲۳)

مگر حقیقت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار سے تعلق ولایت تو جائز نہیں مگر ان کے ساتھ معاہدات و معاملات جائز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ معاہدات کیے اور صحابہ کرام نے بھی ان کے ساتھ تجارت کی۔ احادیث کی روشنی میں کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ حسن سلوک بھی جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

> ترجمہ:- "اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں فرماتا کہ تم ان کافروں سے حسن سلوک کرو، جنہوں نے تم سے دین کے مقابلے میں جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ "(۲۴)

آج جبکہ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے اور دیگر سیاروں پر حکمرانی کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے تو یہی انسان قانون اپنے ہاتھ میں لے کر بنی نوع انسان کی قسمتوں کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ دہشت گردی کی تباہی سے انسان کی طرف سے ہی دوسرے انسان کو ضرر پہنچتا ہے جسے دیکھ کر انسانیت لرز اٹھتی ہے۔اس صورت حال میں ہر مذہب اور ہر طبقے کے انسان متاثر ہوتے ہیں۔ دھماکے میں ایک بم گرا کر ہزاروں انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل کر رکھ دیا جاتا ہے اور بوڑھے والدین کے سامنے ان کے جوان بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے جو کہ ظلم کی انتہا سے آگے کا درجہ ہے۔

۵۔ریاستی دہشت گردی

ریاستی دہشت گردی کچھ اہداف کو مد نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ جن میں سے پہلا ہدف کسی ریاست یا مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے اپنا ماتحت بنانا ہے۔ دوسرے ہدف میں اس کے وسائل پر اپنا تسلط قائم کرنا دہشت گردوں کا مقصد ہوتا ہے۔ برما کی ریاست رخائن عصر حاضر میں ریاستی دہشت گردی کی زندہ مثال بن گئی ہے۔ برما میں مسلم خاندان کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ روہنگیا کے مسلمان ظلم و بربریت کی مثال بن کر رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں کو اقلیت سمجھ کر ان کا قتل عام کیا جارہا ہے۔ عورتوں کو سر عام بے آبرو کیا جاتا ہے اور بوڑھوں اور بچوں کو عمارتوں میں قید کر کے ان کو زندہ جلایا جارہا ہے۔ تقریبا دو سے تین لاکھ روہنگیا قبائل برما سے ہجرت کر کے دوسرے ممالک مثلا بھارت اور بنگلہ دیش وغیرہ میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ برما اور بنگلہ دیش کے درمیان کا دریا ان کے خون سے سرخ ہو چکا ہے اور ان کی لاشیں دریا برد کر دی جاتی ہیں۔ان کا قصور محض اتنا ہے کہ وہ اسلام کے پیروکار ہیں اور برما میں اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے تا حال مسلمانوں کو مذہبی بنیادوں پر قتل کیا جارہا ہے۔ کئی لوگ ان فسادات میں معذور ہو کر ساری زندگی کے لئے بے کار ہو کر رہ گئے ہیں۔ تقریبا گیارہ لاکھ کی آبادی جبر و استبداد اور دہشت گردی کا شکار ہو گئی ہے۔

آج کا انسان ترقی کی اعلیٰ منازل طے کر کے اوج ثریا کو چھو رہا ہے۔اور جھوٹ سچ کا اندازہ کرنے میں اس کو جب کہ کوئی دقت پیش نہیں آتی کیونکہ وہ فکر و فلسفہ کی گہرائیوں کو چھو چکا ہے۔ مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ آج کا انسان دلیل و براہین کے بجائے گولی کے زور پر اپنی بات منوانا جانتا ہے۔ ظالم اور مظلوم جو اپنے سے طاقتور انسانوں کے ظلم و ستم سہتا ہے۔ مگر اس کا بدلہ وہ اپنے سے کمزور سے لیتا ہے اور وہی مظالم دہرا کر وہ دوسرے انسانوں کو ضرر پہنچاتا ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ایک کم سے کم درجے پر فائز آدمی سے لے کر اشرافیہ یعنی وزراء ،امراء سبھی قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ ریاستی اداروں کے ذریعے عوام کو خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ عام لوگ ہی طاقتور لوگوں کے قہر و جبر کا نشانہ بنتے ہیں۔ حکمران طبقے ہی دراصل آج کے دور میں محفوظ تصور کیے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر عوام پر دہشت گردی میں ملوث حکمران اور طاقتور لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں اس خطے میں سامراجی بغاوت کے تحفظ کی پاداش میں اور ایک خاص نظریے کی مد میں دہشت گردی کو ابھارا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں غریب کے حقوق تو پامال ہیں ہی، ساتھ ہی اس کی جان بھی محفوظ نہیں۔ دہشت گردی کے رجحان کو اس حد تک پختہ کر کے ابھارا گیا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک مخصوص نظریے کے طور پر راسخ کیا جا چکا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ دہشت گردوں کو مختلف سماجی و سیاسی گروہوں نے اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لیے اور اپنے مخالفین کو پسپا کرنے کے لیے استعمال کیا جس کی وجہ سے دہشت گردوں کو مزید شہہ مل گئی۔ اور حکومت نے بھی اس پر قابو پانے میں لاپرواہی برتی اور اس سے نمٹنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے۔ یہ بات برحق ہے کہ دہشت گردوں کا نہ تو مذہب سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی انسانیت سے۔ دہشت گردی کا قلع قمع کرنے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی ملک اسے قبول کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتا بلکہ دوسرے پر الزام بازی کرتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ملک میں غیر مبہم قانون سازی کا قیام عمل میں لایا جائے اس کے لیے عوام اور حکومت کے درمیان مضبوط اور خوشگوار روابط ہونا ناگزیر ہے۔ نوجوانوں کو دہشت گردوں کا آلہ کار بننے سے روکنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے لیے بھی امن کمیٹیوں ایجوکیشن سسٹم بہترین کرنا ضروری ہے۔ ملک میں جب ادارے مضبوط ہوں گے تب ہی ریاستی دہشت گردی سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے گا۔

پاکستان میں ریاستی دہشت گردی کے کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ خاص کر پاک بھارت تنازعات جو مقبوضہ کشمیر میں آئے روز جاری رہتے ہیں، ان کا پاکستان کی سالمیت پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بھارت کے خلاف معصوم کشمیری سراپا احتجاج رہتے ہیں بھارت کی طرف سے عوامی احتجاج کو طاقت کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مزاحمت کم ہونے کی بجائے زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ کئی بار اٹھایا جا چکا ہے کہ کشمیریوں کو ان کے حقوق عطا کیے جائیں۔ رائے شماری کے لیے بھی قرار دادیں پیش کی گئیں اور یہ مطالبہ کیا گیا کشمیری عوام کو ان کے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے دیا جائے تاکہ اس خطے میں امن و امان کا قیام

عمل میں لایا جاسکے۔ مگر لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ عالمی طاقتوں نے بھارت کو منفی مفادات کے حصول کے لیے یہ بات باور کرادی ہے کہ وہ عالمی طاقت بن سکتا ہے۔ امریکہ نے چین کا مقابلہ کرنے کے لیے بھارت سے ساجھے داری بنالی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کشمیر کے معاملے میں بھارت ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے مذاکرات کے دروازے بھی بند ہو گئے ہیں۔ بھارت یہ معاملہ کشمیری عوام کی دسترس سے دور رکھ کر کرنا چاہتا ہے اور کٹھ پتلی قیادت کو اپنا آلہ کار بنا کر اپنے اشارے پر نچا رہا ہے۔ کشمیر میں تحریک آزادی تو کب سے جاری ہے جس نے واضح طور پر بھارت سے اپنی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ کشمیری عوام کی طرف سے احتجاجوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ جن کو روکنے کے لیے بھارت کی طرف سے ناجائز طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بھارت کی طرف سے مقبوضہ کشمیر میں کرفیو نافذ کر دیا جاتا ہے اور دیگر نظام زندگی کو بھی معطل کر دیا جاتا ہے تاکہ دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہو کر رہ جائے اور دنیا میں یہ حالات منظر عام پر ہی نہ آئیں۔ بے گناہ کشمیریوں پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ جاری ہے۔ جو کہ ریاستی دہشت گردی کی بدترین مثال ہے۔ اس طرح کی دہشت گردی میں مسلمانوں کو ان کا حق مانگنے پر موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہے۔ مسلمان عورتوں اور بچیوں کی عصمت دری کی جارہی ہے۔ معصوم بچوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے ان کو شہید کیا جارہا ہے، عورتوں کے سہاگ اجاڑے جارہے ہیں۔ بھارت اس بات کو سمجھنے سے گریز کر رہا ہے کہ بندوق کی نوک پر کشمیر کا مسئلہ حل کرنا ممکن نہیں۔ عالمی طاقتوں کے دباؤ پر موجودہ اور سابق حکومتیں اپنے فرائض سرانجام دینے سے کتراتی ہیں۔ آئے روز احتجاجی مظاہرے کیے جاتے ہیں۔ جن کو روکنے کے لیے بھارت کی جانب سے طاقت کا ناجائز استعمال کیا جاتا ہے۔ نہتے کشمیریوں پر بے جا ظلم پر مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے حامی سیاست دان بھی بھارت کے مظالم اور آپریشن کو ریاستی دہشت گردی کہتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے جو سب سے ضروری بات ہے وہ یہ کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف نوجوانوں کی قوت مدافعت کو مضبوط کرنا ہے۔ اس ضمن میں خارجی عناصر کو بھی اہم کردار ادا کرنا ہوگا اور بیرونی طاقتیں جو کہ آج ساری دنیا کے کنٹرول کر رہی ہیں وہ بھی مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مصلحت پسندی سے کام لیں تاکہ بے گناہ نہتے لوگوں پر عرصہ دراز سے ہونے والے مظالم کا سلسلہ رک سکے اور آنے والی نسلوں کو ایک محفوظ اور بے خوف مستقبل حاصل ہو جائے۔

ریاستی دہشت گردی میں قوموں کو معاشی طور پر بدحال کر دینے کی سازشیں کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے بنیادی حقوق اور مراعات سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ اور بالآخر دہشت گردوں کے نرغے میں

پھنس جاتے ہیں پاکستان میں بلوچستان میں ریاستی دہشت گردی کی واضح مثال ملتی ہے۔ پاکستان میں جمہوریت قائم ہونے کے باوجود بلوچستان کے عوام بنیادی سہولیات زندگی سے یکسر محروم ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ اپنی ہی سر زمین سے بے دخل ہیں۔ اسی طرح عرصہ دراز سے فلسطین کے لوگوں پر یہودی اپنا تسلط قائم کر کے ان پر ظلم وستم کی انتہا کر رہے ہیں۔ اس طرح کی دہشت گردی دنیا کے امن وآشتی کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ کیوں کہ ریاستی دہشت گردی کے ذریعے انسانوں کے بنیادی حقوق کی پامالی کی جاتی ہے ریاست میں لوٹ مار، لوگوں کی املاک پر قبضہ، خون خرابہ اور زمین پر فساد انگیزی جیسے واقعات کسی ریاست کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہیں۔ ریاستی دہشت گردی کی ہر باشعور انسان اور معاشرہ مذمت کرتا ہے۔ تاکہ ریاست کو مستحکم کیا جاسکے۔

۶ ۔لسانی دہشت گردی:

زبان کی بنیاد پر کی جانے والی دہشت گردی کو لسانی دہشت گردی کہا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں دہشت گردی کی یہ قبیح صورت کئی بار وقوع پذیر ہو چکی ہے۔ دنیا کے کئی خطوں میں علاقائیت و زبان کی وجہ سے فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستان بھی ان ممالک میں شامل ہے۔ جبکہ یہ ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا جس کی تعلیمات کی رو سے تمام مسلمان برابر ہیں۔ رنگ و نسل کی بنیاد پر فخر کرنا یا ذات پات کی بنا پر کسی کو حقیر سمجھنا اسلام کی تعلیمات نہیں۔ رنگ و نسل کا امتیاز دیگر مذاہب میں عام ہے اور ذات پات پر فخر بھی اور مذاہب میں کیا جاتا ہے۔ مگر اسلام میں اس بات کی ہر گز گنجائش نہیں کہ انسانوں کو زبان یا پھر رنگ و نسل کی بنیاد پر کم تر سمجھا جائے۔ اسلام میں تفریق کا کوئی تصور موجود نہیں۔ کسی عربی کو عجمی پر یا کسی عجمی کو عربی پر فوقیت محض تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے ہر جگہ برابری کا درس دیا ہے۔ جو لوگ ان باتوں کو جواز بنا کر دیگر انسانوں کی تذلیل کرتے ہیں وہ اسلامی تعلیمات کی سراسر نافرمانی کرتے ہیں۔ اسلام میں قبائل کا وجود بھی صرف اور صرف پہچان کے لیے ہے نہ کہ غرور اور تکبر کے لیے۔ مگر آج کا انسان ان تعلیمات کو بھلا کر دنیا کی لغویات میں مشغول ہو گیا ہے۔ آج کا انسان تقویٰ و پرہیز گاری کی بنا پر انسانوں کو ممتاز نہیں سمجھتا بلکہ مال و دولت اور رنگ و نسل اور زبان کی وجہ سے دوسرے کو افضل اور قابل قدر سمجھتا ہے۔ پاکستان میں زبان اور علاقائیت کے نام پر کئی جگہ پر لوگ مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں اور زبان کی بنیاد پر دہشت گردی عام ہوتی جارہی ہے۔ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، پوٹھوہاری وغیرہ جیسی زبانیں پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ ایک زبان کے لوگ علاقائیت کی بنا پر باہم متحد ہو کر دوسری زبان والے کو کمتر سمجھ کر اس کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ کراچی میں سندھی اور پنجابی کا آپس میں جھگڑا عام

ہے۔اسی طرح کوئٹہ میں بلوچ قبائل پنجابیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ مہاجر بھی سندھیوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں اور لسانی بنیادوں پر ٹارگٹ کلنگ کی جاتی ہے۔ کئی کئی دن تک شہروں کے نظام زندگی مفلوج ہو جاتے ہیں۔ جان ومال کا نقصان ہوتا ہے اور کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔مارکیٹوں اور گھروں کو جلادیا جاتا ہے جس کا سارا نقصان ملک کی ترقی کو ہی پہنچتا ہے۔ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> "لسانی دہشت گردی بہت خطرناک ہے کیوں کہ اس میں نہ صرف ملکی استحکام خطرے میں پڑ جاتا ہے بلکہ ملک بھی داؤ پر لگ جاتا ہے۔ لسانی گروہ کسی بھی وقت دشمن ملک کا آلہ کار بن کر ملکی سالمیت کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بعض لسانی گروہ کھلم کھلا ملک کے ٹوٹنے کی باتیں کرتے ہیں اور اس کی ایک مثال بنگلہ دیش کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔"(۲۵)

دہشت گردی خواہ کسی قسم کی بھی ہو اُس کے اثرات دور رس ہوتے ہیں اور اس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

۷۔سیاسی دہشت گردی:

کوئی سیاسی جماعت، تنظیم یا گروہ اپنے سیاسی اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لیے دہشت گردی کا سہارا لیتے ہیں۔ اور مختلف طرح کے پر تشدد طریقے اپنا کر لوگوں میں خوف و ہراس اور بے سکونی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ مقاصد کے حصول کے لیے مختلف طرح کی حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے۔ اور حکومتی لائحہ عمل کے خلاف مختلف قسم کے پروپیگنڈے اختیار کیے جاتے ہیں۔ حکومتی نظام کو مفلوج کرنے کے لیے لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے۔اور جنگ وجدل اور انتشار کی فضا قائم کی جاتی ہے۔

جان رچرڈ تھیکرے (John Richard Thackrah) سیاسی دہشت گردی کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

> "Political terrorism is a special form of clandestine undeclared and unconventional warfare waged without humanitarian restrain or rules-"(۲۶)

سیاسی دہشتگردی کے پس پردہ بے شمار مقاصد پنہاں ہوتے ہیں۔ جس میں منظم منصوبہ بندی اور مربوط نظام کو مدِ نظر رکھ کر منصب پر فائز سیاسی جماعتوں یا پھر سیاسی نظام کے خلاف متحد ہو کر ان کو بالکل کمزور کر دیا

جاتا ہے۔ اور مخالف جماعتیں اس بات کا فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ مگر ملک میں جمہوری نظام معطل اور مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> "سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کوئی سیاسی جماعت، گروہ یا تنظیم تشدد کاروائیوں کے ذریعے ملک میں خوف و ہراس پیدا کرتی ہے، مقاصد کے حصول کے لیے حکومتی پالیسی پر نکتہ چینی کا آغاز کیا جاتا ہے، احتجاجی جلسے جلوس کر کے مذہبی، مسلکی اور لسانی اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے اور اسے سیاسی جنگ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، اسے سیاسی دہشت گردی کہتے ہیں۔"(۲۷)

ڈاکٹر خالد علوی نے سیاسی دہشت گردی کے حوالے سے جن نکات کی نشاندہی کی ہے عموماً یہی وہ نکات ہیں جو سیاسی دہشت گردی کو تقویت دیتے ہیں۔ معصوم لوگوں کو غلط راستے پر چلا کر اُن کی سوچ و چار کی سطح بدل کر رکھ دیتے ہیں اور اپنے مقاصد کو پورا کر لیتے ہیں۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف احتجاج اور نعرے بازی کو عام کر دیتے ہیں اور دنگا فساد برپا ہو جاتا ہے۔

۸۔ بین الاقوامی دہشت گردی:

جب بین الاقوامی تبدیلیاں درکار ہوں عالمی پالیسی نظام کی تبدیلی مقصود ہو یا پھر عالمی سطح پر کوئی کھیل کھیلے جا رہے ہوں تو ان مقاصد کے حصول کے لیے واقع ہونے والی دہشت گردی بین الاقوامی دہشت گردی کہلاتی ہے۔ یہ دہشت گردی وسیع کینوس پر کی جاتی ہے جس میں نقصان کی شرح بھی بہت وسیع تر ہوتی ہے۔ مثلاً ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساقی پر ایٹمی حملہ کیا تھا یا ورلڈ ٹریڈ سینٹر ۹/۱۱ کا واقعہ بین الاقوامی دہشت گردی کے ضمن میں آتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ہی امریکہ جیسی سپر پاور کو نامعلوم لوگوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے اس کی طاقت کا طلسم ماند پڑنے لگا تو اس نے گھبرا کر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ افغانستان کو امریکہ اور نیٹو نے بمباری کا نشانہ بنا دیا، افغانستان میں بوڑھے، بچے، نوجوان اور خواتین کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ گھر اجڑ رہے ہیں۔ معصوم لوگوں کو بغیر کسی قصور کے ظلم کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ اس ملک میں روس کے بعد امریکہ کا وحشیانہ رقص جاری ہے۔ مغرب کی اقوام بھی اس وحشیانہ رقص میں برابر کی شریک ہیں۔ یہ انسانیت کے دشمن لوگ ہیں۔ مغربی دنیا نے اسی جذبہ کے تحت ہی ہٹلر کے خلاف شور مچا

یا تھا کہ لوگ امریکہ کے ان بم دھماکوں کو بھول جائیں جو اس نے جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی میں کیے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے کہ:

"جو انسان جسم کو قتل کرتا ہے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں بل کہ اس سے ڈرو جو جسم و روح دونوں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔"(۲۸)

بین الاقوامی دہشت گردی میں کئی ممالک شامل ہیں۔ جن میں کئی ممالک کے ادارے یا حکومتیں دہشت گردی کے مددگار ہیں اور طاقت کے زور پر دیگر ممالک کو ہدف بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۹/۱۱ کا سانحہ بین الاقوامی دہشت گردی کا واقعہ ہے۔ کیوں کہ اس سے متاثر مختلف ممالک کے باسی تھے۔ اس سانحے کی منصوبہ بندی اور مالی اعانت بیرون کے مضمرات عالمی سطح کے تھے۔ بین الاقوامی دہشت گردی میں کسی بھی حملہ کرنے والی تنظیم کو ایک ملک میں منتقل کیا جاتا ہے مگر دوسرے ملک میں منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی غیر ملکی باشندے کو اپنے ہی ملک میں قتل کر دینا بھی بین الاقوامی دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔

"کوئی بنیادی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک امریکہ اپنی ترجیحات، اپنی فکر، اپنے بین الاقوامی نشانے، اپنی پالیسیوں اور حکمت عملی کا رُخ مسلم دشمنی کی طرف سے موڑ کر صلیبی جنگ کی نفرت انگیز سیاست سے باہر نہ آجائے۔"(۲۹)

بنیادی طور پر جب ریاستی دہشت گردی بدترین شکل اختیار کرتی ہے تو وہ بین الاقوامی دہشت گردی کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے۔ بین الاقوامی دہشت گردی میں جب ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ کرتا ہے تو اس کے پیچھے بے شمار ذاتی اغراض و مقاصد پنہاں ہوتے ہیں خاص کر معاشی وسائل اور ذرائع کا حصول اس ملک کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر جب ۲۰۰۱ء میں حملہ کیا گیا تو دو ٹاور زمین بوس ہو گئے تھے۔ امریکہ نے اس واقعے کا ذمہ دار اسامہ بن لادن اور القاعدہ کو ٹھہرایا۔ اور ان کے خلاف باقاعدہ کاروائیوں کا آغاز کیا۔ "Operation Infinite Justice" کے نام سے مہم شروع کی گئی جس میں امریکہ نے افغانستان میں گرینڈ آپریشن کیا۔ تب پاکستان نے یہ سوچ کر امریکہ کی مدد کی حامی بھر لی کہ یہ معاملہ اسامہ بن لادن کی گرفتاری پر ختم ہو جائے گا، مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ امریکہ کے افغانستان میں حملوں سے پاکستان کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ افغانستان سے طالبان پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پناہ لے رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عنبرین جاوید لکھتی ہیں۔

"پاکستان اور افغانستان کے درمیان دنیا کی سب سے بڑی سرحد موجود ہے اور اس کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہے۔ امریکہ کے افغانستان پر حملہ کے بعد القاعدہ اور طالبان کی ایک بڑی تعداد نے اس سرحدی علاقے کی طوالت سے فائدہ اٹھایا اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں اپنے ٹھکانے بنا لیے جس سے پاکستان میں بھی دہشت گردی کا آغاز ہو گیا۔"(۳۰)

افغانستان میں شروع ہونے والی جنگ نے پاکستان میں دہشت گردی کی صورت اختیار کر لی۔ جس کے اثرات پورے ملک پر پڑے اور نتیجتاً اس کا خمیازہ بے شمار معصوم لوگوں کو بھگتنا پڑا۔

"افغانستان پر حملے کے بعد پاکستان میں وسیع پیمانے پر ہنگامے اور فسادات شروع ہو گئے۔ پہلے ہی روز کوئٹہ میں یونیسف کی عمارت، چار بینک تین سینما گھر، تھانہ اور پٹرول پمپ نذرِ آتش کر دیے گئے۔ کراچی، لاہور اور دوسرے شہروں میں پتھراؤ کے واقعات ہوئے، اسلام آباد میں امریکن سینٹر کے باہر مظاہرہ ہوا۔ ان ہنگاموں میں ایک شخص ہلاک اور سو سے زائد زخمی ہوئے۔"(۳۱)

دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمان عالمی طاقتوں کے عتاب کا شکار ہیں۔ ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان مظالم سے آج عراق، فلسطین، شام، افغانستان اور کشمیر دنیا میں سب سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ ایک منظم دہشت گردی کے تحت مسلمانوں کو ٹارگٹ کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو دنیا میں دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اسلام کو شدت پسند مذہب کے طور پر دکھایا جا رہا ہے۔ مغرب کی اسی دہشت گردی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مشہور دانشور نام چومسکی نے ۲۰۰۱ء میں ریڈف کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

"امریکہ ان عالمی طاقتوں اور رئیس قوموں کا سرغنہ ہے جو چھوٹی قوموں پر دہشت گردی مسلط کر رہی ہیں۔ امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جسے نکارگوا میں دہشت گردی پھیلانے کے الزام میں عالمی عدالت انصاف نے مجرم ٹھہرایا۔"(۳۲)

زیادہ تر دہشت گردی کی باگ ڈور ان ممالک یا اقوام کو سونپی جاتی ہے جو طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں۔ ان ممالک کا مقصد دوسرے کمزور ممالک پر اپنا تسلط قائم کر کے ان کو محکوم بنانا ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی سطح پر

جو بھی دہشت گردی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں ان کو عالمی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے جس کی وجہ سے صورت حال روز بروز گھمبیر اور خوفناک ہوتی جارہی ہے۔

جب دہشت گردی انفرادی، ریاستی اور بین الاقوامی سطح سے تجاوز کر جائے تو وہ عالمی دہشت گردی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دنیا میں آج دہشت گردی نے جو خوفناک صورت حال اختیار کر لی ہے وہ لمحہ فکریہ ہے۔ عالمی طاقتوں نے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف محاذ کھول دیا ہے اور ہر طرح سے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے۔ ان کا قتلِ عام کیا جارہا ہے تاکہ وہ کمزور پڑ جائیں اور تعداد میں کم ہو جائیں۔ جہاں تک عالمی دہشت گردی کا تعلق ہے اس ضمن میں مغربی قوتوں اور امریکہ کے اشتراک سے مسلمانوں کو شدید تحفظات لاحق ہیں۔ عالمی سطح پر دہشت گردی کا سب سے بڑا محرک ناانصافی اور سیاسی انتشار ہے۔ فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر پر ہونے والے حملے اور مظالم عالمی طاقتوں کے باہم اتحاد کی وجہ سے شدت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ انسانیت سوز مظالم پر کوئی بھی طاقت نوحہ کناں نہیں بلکہ وہ تو ایک خاص قسم کا غلبہ حاصل کر کے تمام کمزور ملکوں اور اقوام کو اپنا دستِ نگر بنانا چاہتے ہیں۔ امریکہ اور دیگر اتحادی ممالک کے اس قبضے اور تسلط سے مسلمانوں میں امریکہ اور یورپ کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ برطانیہ نے ناانصافی کر کے کشمیر اور فلسطین کے مسائل کھڑے کر دیئے اور دنیا میں امن کو برباد کر دیا اور جو طاقتیں انصاف اور امن کی دعویدار ٹھہری تھیں۔ انہوں نے بھی ان مسائل کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی اور معصوم اور بے گناہ انسانوں کے جانی و مالی نقصان پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ان مسائل کے لیے اقوام متحدہ تک آوازیں اٹھائی گئیں جس کے حل کے لیے کئی قرار دادیں پاس ہوئیں۔ امن معاہدے طے پائے گئے مگر ان سب کے باوجود بھی امریکہ، یورپ، فرانس اور روس نے اپنے ناجائز اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی کو ہی بہتر سمجھا۔

اس سب کے پیچھے ان کے ذاتی مقاصد پوشیدہ ہیں۔ اس عالمی بے حسی کی وجہ سے ان کمزور اور مجبور انسانوں کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں۔ ہر کوئی طاقتور کے عتاب سے خوفزدہ ہو کر چپ سادھنے پر مجبور ہے اور کوئی بھی جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کی سکت نہیں رکھتا اس صورت حال کے پیش نظر ان مفلوک الحال علاقوں کے لوگوں کو اپنی جنگ خود لڑنی پڑ رہی ہے۔ ان معصوم لوگوں نے امن کے حصول کے لیے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے ان علاقوں میں آگ اور خون کی ہولی تسلسل سے جاری ہے۔ آزادی کے متوالوں نے بوسنیا ہرزگوینا، چیچنیا، افغانستان، شام، عراق، فلسطین اور کشمیر میں مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ امریکہ اور روس بھی ایک وقت میں ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے۔ روس نے جب افغانستان پر رسائی

حاصل کی تو امریکہ نے اس خطے میں آزادی کے متوالوں کے لیے تربیتی کیمپ قائم کئے، اور ان کی مالی معاونت کی اور بھاری اسلحہ فراہم کیا اور بعد میں افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ خانہ جنگی کی صورت حال انہی حالات کی وجہ سے قائم ہوئی۔ جو لوگ بیرونی جارحیت کے خلاف سینہ سپر ہوئے تھے وہی اقتدار کے نشے میں دھت ایک دوسرے کے بیری بن گئے۔ جو اسلحہ روسی جارحیت کے خلاف استعمال کیا جارہا وہی ایک دوسرے پر استعمال کیا جانے لگا۔ اسی انتشار اور افراتفری کے دوررس نتائج برپا ہوئے۔ اسی خانہ جنگی کا نتیجہ طالبان کے وجود کی صورت میں سامنے آیا۔ یہی صورت حال بوسنیا ہرزگوینا اور چیچنیا میں پیش آئی جہاں مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کی گئی۔ انسانوں کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ اور خواتین کی آبروریزی کی گئی۔ اجتماعی قبریں بنائی گئیں۔

درحقیقت عصرِ حاضر میں دہشت گردی کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ عالمی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ عالمی سطح پر اسے کنٹرول کرنے کے لیے کوششیں درکار ہیں۔ افغانستان آج دہشت گردی کا گڑھ بن چکا ہے۔ یہاں پر طالبان، داعش اور القاعدہ تک ہی دہشت گرد تنظیمیں محدود نہیں بلکہ اور بے شمار گروہ بھی برسر پیکار ہیں۔ اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ یہی دہشت گرد ایک نیٹ ورک کے ذریعے دنیا کے ہر خطے میں پھیلے جارہے ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں آگے ملکوں نے اسی بات کا فائدہ اٹھایا ہوا ہے اور وہی ملک انہی دہشت گردوں کو ہتھیار اور اسلحہ فراہم کر کے ڈھیروں دولت کمارہے ہیں۔ دہشت گردی کے واقعات کی مذمت کے بجائے حوصلہ افزائی کر رہے ہیں تاکہ ان کی جیب گرم رہے۔ اس کے علاوہ عراق اور شام میں ہونے والی تباہی سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ ان ممالک کے مختلف حصوں پر قابض دولت اسلامیہ سے بہت سے ممالک کی اہم کمپنیاں تیل خریدتی رہی ہیں اور بہت کم قیمت پر انہیں تیل سپلائی کیا گیا، اس کے بارے میں سب ممالک کو خبر ہونے کے باوجود کسی نے مخالفت نہیں کی، دہشت گردی کے عالمگیر مسئلے کو، جو کہ اب ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر جنگل میں آگ کی طرح بڑھتا جارہا ہے اور افغانستان ہو یا مشرق وسطیٰ، امریکہ ہو یا یورپ، یا پھر شمالی یا وسطی افریقہ، تمام خطوں کے ممالک میں عرصہ دراز سے جاری خانہ جنگی پہ قابو پانے کے لیے مشترکہ کاوشوں اور لائحہ عمل کی ضرورت ہے تاکہ دنیا کے کسی بھی خطے پر بسنے والے انسان خود کو محفوظ سمجھ سکیں۔

۹۔ معاشی دہشت گردی

خطہ ارض پر بنی نوع انسان ہزارہا سال سے الگ الگ تہذیبوں، مذاہب، عقائد اور حکومتوں سے جڑا ہوا ہے۔ قدیم انسان کسی نہ کسی وجہ سے آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کی حکومتوں کا نظام اور معیشت زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء پر منحصر تھا۔ اگر ماضی بعید پر نگاہ دوڑائی جائے تو اس دور میں روپیہ پیسہ تو وجود میں نہ آیا تھا۔

غاروں میں رہنے والے انسان بھی آپس میں لین دین تو کرتے تھے مگر ان کا طریقہ کار آج کے طریقہ کار سے قدرے مختلف تھا۔ لوگ اشیاء کے بدلے اشیاء کا تبادلہ کر کے قیمت چکاتے تھے۔ ماضی میں سارا معاشی نظام روپے پیسے کے بجائے سونے چاندی اور دیگر نادر اور قیمتی اشیاء کے ذریعے چلتا تھا۔ اس دور میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ معاشی نظام برقرار اور پائیدار سمجھا جاتا تھا کیوں کہ سونے چاندی کی قدر و قیمت برقرار رہتی تھی اور سالوں تک سونے یا چاندی کو زمین میں بھی دفن کر دیا جائے تو نکالنے کے بعد بھی اس کی قیمت برقرار ہی رہے گی۔

زید حامد لکھتے ہیں:

> "ایک انسان سونا لے کر زمین میں دبا دے اور اگر سو سال بعد اسے نکالے تو بھی تو اس کی قدر میں کمی نہیں ہو گی کیوں کہ سونے کی قدر و قیمت برقرار رہتی ہے۔ سونے اور چاندی کی اس خوبی کی وجہ سے وہ معاشی نظام پائیدار تھا۔ اگر کوئی بادشاہ منڈی میں دولت لانا چاہتا تھا تو اسے سونا کہیں سے ڈھونڈ کر لانا پڑتا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ بے دریغ دولت یک دم مارکیٹ میں ڈال دی جاتی۔ اگر دشمن ملک آپ کی کرنسی بنانا چاہتا تھا تو اسے بھی سونے کے سکے ہی بنانے پڑتے تھے اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی بھی ردی کاغذ چھپوا لیتا اور کرنسی کا پی کر لیتا چنانچہ دنیا کا سب سے پائیدار معاشی نظام ایک ایسا نظام ہی ہو سکتا ہے جس میں کرنسی کی قدر میں کمی نہ ہو یعنی ایک ایسا نظام کہ جس میں کرنسی کی اصل قدر اسکے اندر ہو۔"(۳۳)

تاریخ انسانی میں ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں کہ دنیا کی معیشت میں نقلی کرنسی کا وجود عمل میں آئے اور بینکاری کے نظام دوسرے ممالک کے ہاتھ میں ہو۔ آج ہماری دولت بیرونی ہاتھوں کے دست نگر ہے۔ اور جب مغربی ممالک میں حالات خراب ہوتے ہیں یا کوئی مسئلہ درپیش آتا ہے تو اس سے دہشت گردی کے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ مغرب کا تسلط آج ساری دنیا پر قائم ہو چکا ہے اور افسوس کے ساتھ ہم بھی اس کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا مذہبی، معاشی اور عدالتی نظام یکسر بدل کر رہ گیا ہے اور ہماری آنے والی نسلیں بھی مغربی نظام سے مرعوب ہو کر اسی کی علمبردار نظر آتی ہیں۔ کسی بھی سوسائٹی میں معیشت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشی نظام میں صیہونی نظام آج کل رائج ہے۔

اسٹاک مارکیٹ کا نظام سب سے پہلے صیہونی منظر عام پر لائے۔ یہ نظام آج بھی تقریباً صیہونی ہی چلا رہے ہیں۔ مختلف ادارے مارکیٹ میں اپنے شیئرز لے کر آتے ہیں اور مختلف لوگوں کو یہ شیئرز بیچتے ہیں۔ اس طرح وہ اس ادارے کے رکن بن جاتے ہیں۔ ان حصص کی خرید و فروخت میں بروکرز کا اہم کردار ہوتا ہے جو کہ صرف اور صرف کمیشن پہ کام کرتے ہیں۔ اور دونوں فریقوں کے مابین باہم رابطے کی ذمہ داری سرانجام دیتے ہیں۔ اگر ادارے کی کارکردگی اچھی ہو تو منافع کی شرح بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات غلط خبریں بھی گردش کرنے لگتی ہیں کہ کسی کمپنی کے حصص گرنے والے ہیں تو اس سے اس کمپنی کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جب ملکی حالات بدل رہے ہوں تو حصص کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے تو سرمایہ دار حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ شیئرز خرید لیتے ہیں اور کچھ عرصے بعد مہنگے داموں منافع کے ساتھ وہ مارکیٹ میں شیئرز بیچ دیتے ہیں۔ یہ عمل "ڈے ٹریڈنگ" کہلاتا ہے۔ زید حامد لکھتے ہیں:

> "یہ اصل میں جوا ہے۔ یہ لوگ شیئرز کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کا اندازہ بالکل ایسے لگاتے ہیں جیسے گھوڑوں کی دوڑ میں شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ کہ کون سا گھوڑا جیتے گا۔ اور کون سا ہارے گا۔ پھر کوئی شرط جیت جاتا ہے اور کوئی ہار جاتا ہے۔ لہٰذا اسٹاک مارکیٹ بھی ایسے ہی ایک جوا ہے۔۔۔۔۔ اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے (بیرش) یا (بلش) جیسے الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے جس سے مراد تیزی یا مندی ہے۔"[۳۴]

جب کہ اسلامی معاشی نظام کا دارومدار بیت المال پر ہوتا ہے جو کہ ایک فلاحی ادارہ ہوتا ہے۔ بیت المال کا نظام نہایت ہی منظم ہوتا ہے۔ جس میں نقد روپے پیسے کے علاوہ اشیائے روزمرہ بھی موجود ہوتی ہیں۔ یہ مال تمام مسلم برادری کی مشترکہ ملکیت ہوتا ہے اور ضرورت مندوں کے لیے بوقت ضرورت ایک بینک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نظام بہترین معاشی نظام کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ضرورت مندوں کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے اور کسی کی ترقی کا پہیہ بھی رکنے نہیں پاتا اور دولت بھی گردش میں رہتی ہے۔

اگر کہیں بھی معاشی نظام جمود کا شکار ہو جائے یا پھر کسی ملک کی معیشت کا پیسہ رک جائے تو حالات ابتری کی طرف جانے لگتے ہیں۔ اس سے معاشی دہشت گردی وجود میں آتی ہے۔ معاشی دہشت گردی سے مراد یہ ہے کہ کسی ملک یا ریاست میں اختیارات کا ناجائز فائدہ یا استعمال کر کے ملک کی ترقی کو نقصان پہنچایا جائے اس سے معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر قانونی طور پر مال و دولت اکٹھا کرنا اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرنا بھی معاشی دہشت گردی کہلاتا ہے۔ غلط لوگوں کی مالی معاونت کرنا، جس کی وجہ سے ملک کی

معیشت کو نقصان پہنچے تو یہ بھی معاشی دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔اس کی وجہ سے لوگوں میں احساس محرومی پیدا ہوتی ہے اور اسی وجہ سے فتنہ جنم لیتا ہے، جس طرح دہشت گردی کا تدارک ناگزیر ہے۔ اسی طرح کسی ملک میں معاشی دہشت گردی کی روک تھام بھی از حد ضروری ہے۔آج سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے غریب ذلیل ہو رہے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ غریبوں کا استحصال کرنے پر ڈٹ گیا ہے۔ جعلی ادویات اور مہنگائی بھی معاشی دہشت گردی کی مد میں آتے ہیں۔ڈاکٹر جو کہ انسان کے مسیحا سمجھے جاتے تھے، آج وہی لوگ جعلی ادوایات اور مہنگا علاج مہیا کر کے انسان کے قاتل بنے بیٹھے ہیں۔ وہ لوگ انسان کی زندگی داؤ پر لگا کر اپنا مالی فائدہ دیکھتے ہیں۔ جعلی مشروبات کی ترسیل بھی آج زوروں پر ہے۔الغرض ہر طرح سے معیشت کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ناپ تول میں کمی اسلام میں سختی سے منع ہیں جب کہ آج یہ سب مسلمان بھی کر رہے ہیں اور اسلام کی تعلیمات کو بھول کر اپنا فائدہ ہی دیکھتے ہیں۔آج حالات اس حد تک گھمبیر ہو چکے ہیں کہ پاکستان کا سرمایہ دار طبقہ پاکستان میں سرمایہ لگانے سے ڈر رہا ہے کیوں کہ جہاں اتنی معاشی دہشت گردی ہو، وہاں کون خود کو خسارے میں ڈالتا ہے۔

خان محمد عاطف لکھتے ہیں:

> "اگر آپ کے بچے آپ کی آنکھوں کے سامنے مر رہے ہوں۔آپ پر اقتصادی پابندیاں ہوں اور وہی لوگ جنہوں نے پابندیاں لگائی ہیں، آئیں اور بچوں کی لاشوں سے گزر کر مجسموں کی آرائش کرنے لگیں تو آپ کیا کریں گے۔"(۳۵)

پاکستان میں معاشی دہشت گردی عروج پر ہے اور اس کے فروغ میں سب سے زیادہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کا ہاتھ ہے۔اس سب کی ذمہ داری قانون نافذ کرنے والے اداروں پر عائد ہوتی ہے۔آج پاکستان اسلامی فلاحی ریاست بننے کی بجائے نہ جانے کس ڈگر پر چل رہا ہے۔جب کہ مغرب میں آج بھی حضرت عمر کے قائم کردہ قانون کی پیروی کی جاتی ہے تاکہ معاشی نظام کو منظم اور مربوط کیا جا سکے۔جب کہ پاکستان کی حالت اس کے برعکس ہے۔ ہمارے ہاں ریاست سے وابستہ نمائندے بس اپنے اثاثہ جات بنا رہے ہیں اور عوام کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ لوگ بنیادی سہولیات سے بھی محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ حکومت کی عدم دلچسپی کی وجہ سے لوگ غربت کی نچلی سطح کو چھو رہے ہیں۔ان کو طب، تعلیم اور دیگر روزمرہ کی سہولتیں تک میسر نہیں۔آج جب کہ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔ ہمارے ہاں صاف پانی تک بھی انسانوں کی پہنچ سے دور ہے۔

"گزشتہ ۶۹ سالوں میں پاکستان کے حکمران طبقے نے کبھی بھی عوام الناس کی ان بنیادی ضروریات اور ان کے حل پر توجہ نہیں دی۔ ملک میں خود ساختہ مہنگائی پیدا کر کے انسانوں کو حیوانوں کی طرز پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور انسانیت کی شاید اس سے زیادہ تضحیک نہیں کی جاسکتی۔ بھوک، افلاس، غربت، بڑھتی ہوئی مہنگائی پیدا کر کے اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بے روزگاری کے ہاتھوں فاقہ کشی کا شکار ہونے والے اور پاکستان میں تقریباً چار کروڑ افراد غذائی قلت کا شکار ہوئے ہیں۔ حالاں کہ تمام شہریوں کے کھانے پینے، علاج معالجے کے ساتھ ساتھ تعلیم کی ذمہ داری فلاحی مملکت پر عائد ہے۔"(۳۶)

اسلامی قوانین کی رو سے تمام شہریوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل ایک جیسے حقوق حاصل ہیں۔ مغربی ممالک بھی اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ یہ ممالک حقوق العباد پر بہت زور دیتے ہیں تاکہ عوام ترقی کر سکے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ان کو بنیادی ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ تمام ترقی یافتہ ممالک میں بیروزگار لوگوں کو الاؤنس دیے جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں معاشی نظام کی ابتری کی سب سے بڑی وجہ رشوت اور ذاتی مقاصد کے حصول کی خاطر اختیارات کا ناجائز استعمال ہے۔ یہاں کے اشرافیہ نہ تو ٹیکس ادا کرتے ہیں اور نہ ہی اس معاملے میں ان سے باز پرس کرنے والا کوئی ہے۔ بھتہ خوری جیسی لعنت آج کے معاشرے میں معاشی نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس کا نقصان نہ صرف ملک و قوم بلکہ عام شہری تک کو ہو رہا ہے۔ جن اداروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ یہ سب کنٹرول کریں، وہی ادارے اس طرح کی خرابیوں میں ملوث نظر آتے ہیں۔ اس سب کا اثر ملک کی ترقی پر پڑتا ہے اور معاشی دہشت گردی کو فروغ ملتا ہے۔ معاشی دہشت گردی کا مقصد ملک میں عدم استحکام کی فضا پیدا کر کے ملکی ترقی میں رکاوٹیں حائل کرنا ہے۔ آج ملک کے بڑے بڑے شہر اور صنعتی و تجارتی مراکز معاشی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہیں۔ اس کے اثرات ریاست کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور وہ بجائے مستحکم ہونے کے کمزور پڑ جاتی ہے۔

اگر ہم دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں، ہمیں لوگوں کی قابل ترس حالت دکھائی دے گی۔ زیادہ تر لوگوں کی تعداد ہمیں کسمپرسی کا شکار دکھائی دے گی۔ آج ترقی پذیر ممالک قرضوں کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ سود کی شرح مسلسل بڑھنے کی وجہ سے بے شمار ممالک کا دیوالیہ نکل رہا ہے۔ قرضوں کی ادائیگی محال ہو چکی ہے۔ مشہور کالم نگار یاسر محمد خان لکھتے ہیں:

"میں نے ایک کھلے سمندر میں ایک دیو ہیکل کارگو جہاز کھڑا دیکھا۔ جہاز پر بڑے بڑے سائرن لگے تھے۔ جہاز کے گرد سمندری پولیس کی موٹر بوٹس کھڑی تھیں۔ جب ہم لوگ جہاز کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ جہاز سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر پولیس نے لوہے کی ایک زنجیر بچھا رکھی ہے۔ میں نے اپنے دوست سے اس کے بارے میں پوچھا۔ دوست نے بڑے بڑے الفاظ جو اس جہاز پر لکھے تھے، ان کی طرف اشارہ کیا کہ یہ نیسلے کا جہاز ہے اور یہ جہاز ابھی تیار خوراک سمندر میں پھینکے گا۔ میں نے پوچھا یہ خوراک سمندر میں کیوں پھینکی جا رہی ہے؟ کیا یہ خراب ہے؟ اس نے کہا یہ خوراک سو فیصد خالص ہے۔ مگر کمپنی کا خیال ہے کہ اگر یہ خوراک دنیا کی مارکیٹ میں آ گئی تو اس سے اس کی مصنوعات کی قیمتوں میں کمی ہو گی۔ اس لیے ہر سال یہ کمپنی اس طرح کے تین چار جہاز غرق کرتی ہے اور پوری دنیا ان کمپنیوں کے قدموں میں سسک رہی ہیں۔"(۳۷)

یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ایک جانب یہ لوگ حقوقِ انسانی کے علم بردار نظر آتے ہیں تو دوسری جانب معاشی دہشت گردی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

"اگر دنیا میں صرف ایک کمپنی نیسلے چاہے تو پوری دنیا کے غریبوں کو تین سال تک مفت کھلا سکتی ہے۔ لیکن ان کا ہدف چوں کہ انسانیت کی خدمت نہیں بلکہ منافع ہے۔ اس لیے زیادہ منافع کی خاطر یہ کمپنی کروڑوں ٹن خوراک سمندر میں غرق کر دیتی ہے۔"(۳۸)

پاکستان میں سیلاب کی وجہ سے سالانہ کروڑوں اربوں روپے کا خسارہ ہوتا ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق اس وقت پانی کا کثیر حصہ ضائع ہو رہا ہے۔ ڈیم نہ ہونے کی وجہ سے آبی ذرائع کی عدم دستیابی ہے۔ جس کی وجہ سے ۳۵ ملین ایکڑ پانی سمندر میں ضائع ہو رہا ہے۔ اگر ڈیم بنا لیے جائیں تو پانی کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ سیلاب اس لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ پانی کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں ملتی۔ ان سیلابوں کی وجہ سے ہزاروں لوگ ہر سال اپنے گھروں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

"ہر سال شہریوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پاکستان کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں، قصبوں اور دیہی علاقہ جات میں رہائش پذیر ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے ہماری معیشت کا ایک بڑا حصہ زراعت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ لیکن سیلاب کی وجہ سے

بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصان کے ساتھ ساتھ املاک، زراعت، اجناس ضائع ہو جاتی ہیں اور یوں کسانوں کی سال بھر کی کمائی پانی میں بہہ جاتی ہے۔ لیکن مجال ہے کہ اب تک اس سنگین مسئلے کا حل ہماری حکومتوں نے ڈھونڈنے کی کوشش تک نہ کی ہو۔ اگر پاکستان میں بڑا ڈیم بننے میں رکاوٹ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم چھوٹے ڈیم بنانے سے بھی اب تک قاصر ہیں۔"(۳۹)

اس وقت پاکستان کی معیشت تباہی کے دہانے پر ہے۔ پٹرول کی قیمتیں آئے روز تجاوز کر جاتی ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج میں روپے کی قدر و قیمت مسلسل گر رہی ہے۔ جس سے شدید بحران پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ ماضی میں بھی ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جگہ جگہ احتجاج کیے گئے تھے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق صرف ایک دن میں چودہ ارب کی رقم نکالی گئی۔

"۱۸ اپریل ۲۰۰۸ء کو ایس سی ۱۰۰ انڈیکس ۱۵۶۷۶ پوائنٹس کے ساتھ ملکی تاریخ کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکا تھا لیکن اس کے باوجود تمام سرکاری اور بڑے نجی مالیاتی اداروں کی جانب سے مارکیٹ کو سپورٹ نہ کرنا انتہائی حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ شکوک و شبہات کو بھی جنم دیتا ہے۔ ۱۸ اپریل کو کراچی اسٹاک ایکسچینج میں حصص کی مالیت ۴۷۹۱ ارب روپے رہ گئی تھی۔ یوں کراچی مارکیٹ کے سرمائے میں مجموعی طور پر ۳۰ یا ۳۵ فیصد کمی واقع ہو چکی ہے۔۔۔۔۔۔ ملک کی معاشی سیاسی حالات اور امن وامان کی خراب تر ہوتی ہوئی صورت حال نے اس بحران کو جنم دیا ہے۔ اس کے علاوہ نو منتخب جمہوری حکومت کی ڈانواں ڈول پوزیشن کو بھی اس کی بڑی وجہ قرار دیا جا رہا ہے۔"(۴۰)

آج دہشت گردی کے عفریت نے جس طرح لوگوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں بالکل اسی طرح معاشی دہشت گردی کا جن بھی بے قابو ہوتا جا رہا ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری، غربت و افلاس کی وجہ سے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ عوام میں بے سکونی اور انتشار کا باعث بھی یہی بنیادی مسائل ہیں۔ مفلسی انسان کو کفر کے قریب کر دیتی ہے اور جب حالات اس نہج پر پہنچ جائیں کہ دو وقت کی روٹی کا حصول مشکل ہو جائے تو انسان تمام حدیں پار کر جاتا ہے۔ اس کے لیے صحیح غلط کی پہچان کرنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ آج ہمیں معاشی دہشت گردی کو کنٹرول کرنے کے لیے مناسب حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ غریب عوام جن کے حقوق کا مسلسل استحصال ہو رہا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے کوشش کرنا حکومت وقت کا اہم فریضہ ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے ناجائز منافع خوروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کی ضرورت ہے۔ وزارت صحت عامہ والے بھی اس

جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ مہنگی ادویات مارکیٹ میں موجود تو ہیں مگر عام آدمی کی پہنچ سے دور ہیں۔ جو کمپنیاں ڈاکٹروں کے ساتھ معاہدے کرتی ہیں یا پھر ان کو مالی فائدہ پہنچاتی ہیں، ڈاکٹر بھی انہی کی ادوایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اشیائے خورد ونوش میں ملاوٹ بھی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس سے لوگوں کی صحت کو خطرے میں ڈالا جارہا ہے۔ اور انسانی جانوں کے ساتھ کھیلا جارہا ہے۔ اس لیے مجرموں کے خلاف کاروائی کرنا حکومت کا فرض ہے کیونکہ "Justice delayed is justice denied"

ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کو محض لوٹا ہے اور لوٹا ہوا مال غیر ملکوں کے بینکوں میں چھپایا ہے۔ اگر ان کی لوٹ کھسوٹ کی رقم واپس ملک میں لائی جائے اور ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر کے ان کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے تو اس سے بھی ملکی معیشت کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔ آج کل منی لانڈرنگ کی وجہ سے عام لوگوں کا معاشی قتل کیا جارہا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق پاکستان کی اڑھائی سو ارب ڈالر سے زائد رقوم بیرون ملک بینکوں میں پڑی ہیں۔

۱۰۔ذرائع ابلاغ کے ذریعے دہشت گردی:

موجودہ دور جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے اور دورِ جدید میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ساری دنیا میں میڈیا کی جنگ چھڑ گئی ہے۔ ہر کوئی اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے میڈیا کا سہارا لے رہا ہے۔ اس وقت دہشت گردی کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کو بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ آج سارا عالمی میڈیا مغربی قوتوں کے کنٹرول میں ہے۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کہیں پر حضرت محمد ﷺ کے (نعوذ باللہ) کارٹون نشر کر کے امتِ مسلمہ کو تکلیف پہنچائی جارہی ہے۔ تو کہیں اسلام کو دہشت گرد مذہب ثابت کرنے کے لیے فلمیں بنائی جارہی ہیں۔ جن میں مسلمانوں کا بطور دہشت گرد تعارف کرایا جاتا ہے۔

> "ابلاغی دہشت گردی کے ذریعے مسجدوں کے میناروں کو تشدد اور درندگی کی علامت قرار دینے کے لیے باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ اس مقصد کے لیے یہودی بلیٹن اے۔ڈی۔ ایل(۱) نے اپنے افتتاحیہ میں یہ سرخی لگائی۔ حماس۔ اسلامی جہاد اور الاخوان امریکہ کے لیے تشدد کا خطرہ ہیں۔"(۲) ٹائمز نے اپنے پہلے صفحے پر مسجد کے مینار کو بندوق کی نالی کی طرح تشدد اور درندگی کا مظہر بتایا ہیں۔(۳) نیوز ویک نے یہ خبر وارننگ کی طرز پر دی :ہوشیار! خبردار مسلمان مجاہدین آرہے ہیں۔(۴) فرانسیسی رسالہ "دی پوائنٹ" نے

صفحہ اول پر ایک نقاب پوش خاتون کو اپنے ہاتھوں میں بندوق اٹھائے ہوئے بتایا اور عنوان یہ دیا کہ صنفِ نازک بھی تشدد کی علمبردار ہے۔(۵)علاؤالدین کے موضوع پر بنائی جانے والی کارٹون فلم کا مقصد امریکی بچوں کو بچپن ہی سے اسلام کے بارے برا تاثر دینے میں اسلام کے خلاف نفرت بھرنا ہے۔"(۴۱)

عہد حاضر میں دہشت گردی میں ملوث تنظیمیں نوجوان نسل کو مختلف طریقوں سے راغب کر کے اپنی تنظیموں میں بھرتی کر رہی ہیں۔ آج کل نوجوان نسل کو گمراہ کرنے کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا لیا جارہا ہے۔ اس کے ذریعے مختلف پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی اہمیت آج ناگزیر ہے۔ مگر بعض لوگ یا گروہ سوشل میڈیا کو منفی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دہشت گردی میں سوشل میڈیا کو بطور سہولت کار استعمال کیا جارہا ہے۔ حکومت اس پر قابو پانے کے لیے مختلف قوانین رائج کر رہی ہے اور سائبر کرائم سیل قائم کر دیا گیا ہے۔ تاکہ سوشل میڈیا پر ہونے والی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔

۹/۱۱ کی دہشت گردی کے واقعہ کے بعد دنیا بھر کے ابلاغی ذرائع کے کردار میں نمایاں تبدیلی آئی۔ خاص کر امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی چینلز نے نئے قوانین اور ضابطہ اخلاق رائج کیے۔ اسی طرح بمبئی حملوں کی کوریج پر بجٹ کے بعد انڈیا کے ٹی وی چینلز اور میڈیا نے ایک نئے ضابطہ اخلاق پر اتفاق رائے کیا۔

کسی ملک کے نوجوان اس کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ اس ملک کے مستقبل کے معمار یہی نوجوان ہوتے ہیں۔ جن پر اس ملک کی ترقی یا تنزلی کا دارومدار ہوتا ہے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ آج میڈیا کا سہارا لے کر نوجوان نسل کے ذہنوں کو بدلا جارہا ہے اور دہشت گردی اور انتہا پسندی کی طرف راغب کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ازحد ضروری ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خاتمے کے لیے میڈیا کو ایک مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔

موجودہ دور میں کی جانے والی دہشت گردی میں اکثر اوقات انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی مختلف سائٹس استعمال کی جاتی ہیں۔ دہشت گرد تنظیمیں اپنی ذاتی سائٹس بناتی ہیں۔ ان سائٹس کی مدد سے انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ سوشل ویب سائٹس: سوشل ویب سائٹس کی مدد سے دہشت گرد تنظیموں نے بے شمار لوگوں کی بھرتیاں کیں۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس سارے عمل میں چیٹنگ رومز کا اہم کردار ہے۔ جہاں

دہشت گرد سادہ لوح لوگوں کے لیے جال بچھاتے ہیں اور اپنی باتوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے دہشت گرد اپنے افکار اور آئیڈیالوجی کی تشہیر کرتے ہیں۔

۲۔ معلومات تک رسائی: انٹرنیٹ کی دنیا معلومات کا گہرا سمندر ہے۔ جس سے تمام لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں مگر دہشت گردی سے منسلک لوگ انٹرنیٹ کو غلط پراپیگنڈے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات حاصل کرتے ہیں اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں۔

۳۔ الیکٹرانک وسائل کے ذریعے تخریبی منصوبوں کی پلاننگ: دہشت گرد تنظیمیں اپنی تخریبی کاروائیوں کی تکمیل کے لیے انٹرنیٹ کی مدد لیتی ہیں اور دہشت گردی کرنے سے پہلے مکمل پلاننگ کرتے ہیں۔ وہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے ہی آپس میں رابطے کر کے مختلف کاموں کی ذمہ داریاں سونپتے ہیں اور کاروائی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ سارے امور ای میلز، چیٹ رومز اور دیگر الیکٹرانک وسائل کے ذریعے پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

۴۔ باہمی رابطہ:۔ لوگوں کے درمیان رابطے کا بہترین ذریعہ دورِ حاضر میں انٹرنیٹ ہی ہے۔ اس کے ذریعے میلوں دور بسنے والے آپس میں آسانی سے رابطے میں رہتے ہیں، اس بات کا فائدہ دہشت گردوں کو بھی پہنچا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے وہ بآسانی رابطے میں رہتے ہیں اور کہیں بھی کوئی تخریبی کاروائی کرنے کا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔ وہ معلومات آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اور تصاویر اور دستاویزات کے ذریعے دہشت گردی کر سکتے ہیں۔

۵۔ فنڈ اور دولت کا حصول:۔ دہشت گرد پیسہ اور فنڈ اکٹھے کرنے کے لیے بھی انٹرنیٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ سوشل میڈیا کے ذریعے لوگوں کو اپنے چنگل میں پھنسا کر بآسانی خطیر رقم ہتھیا لیتے ہیں۔ سوشل ویب سائٹس کے ذریعے عام لوگ ان کے تشدد کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ دہشت گرد عیار ذہن کے مالک ہوتے ہیں اور وہ اپنی بیمار اور تکفیری سوچ لوگوں کے گھروں تک منتقل کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے متعدد واقعات رونما ہو رہے ہیں اور بہت سے معصوم لوگ ان لوگوں کی پر تشدد کاروائیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ جو کہ قابل فکر بات ہے۔

سوشل میڈیا نے آج انسان کی زندگی قطعاً بدل کر رکھ دی ہے۔ مختلف سائٹس کے متعارف ہونے کے بعد حالات نے الگ ہی کروٹ لی ہے۔ دہشت گرد اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے معصوم لوگوں کو

نشانہ بناتے ہیں۔اس سب کے لیے وہ سوشل میڈیا کا سہارا لیتے ہیں اور معصوم ذہنوں میں زہر انڈیل دیتے ہیں بہت سے لوگ لاشعوری طور پر ان کا شکار ہو رہے ہیں۔ دہشت گرد حملے کرنے کے لیے بھی سوشل میڈیا کی مدد لیتے ہیں۔آج کل مشکوک اکاؤنٹس کی مانیٹرنگ کی جارہی ہے۔

دورِ حاضر میں ذرائع ابلاغ یا میڈیا خواہ وہ سوشل ہو یا پرنٹ،ان کی اہمیت سے گریز ممکن نہیں۔ بعض لوگ آج اس کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔خاص کر مغربی ممالک اس سے بھرپور طریقے سے استفادہ ہو رہے ہیں۔ ساری دنیا کے ابلاغی ذرائع ان کی دسترس میں ہیں۔ یہ ممالک دنیا کو میڈیا کے ذریعے اپنے مطابق چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ جو چاہیں،لوگوں تک وہی پہنچ رہا ہے۔لوگوں اور عمارتوں کی تصاویر یا پھر کارٹون،یہ سب ان کا معمول بن چکا ہے۔

> یہودی بلیٹن اے۔ڈی۔ایل نے اپنے افتتاحیہ کی یہ سرخی لگائی "حماس" اسلامی جہاد اور "الاخوان" امریکہ کے لیے تشدد کا خطرہ ہیں۔ٹائمز نے پہلے صفحے پر مسجد کے مینار کو بندوق کی نالی کی شکل میں پیش کیا اور اس پر یہ عنوان لگایا کہ "مساجد کے مینار بھی بندوق کی نالی کی طرح تشدد اور درندگی کا مظہر ہیں۔ نیویارک نے یہ خبر وارننگ کی طرز پر دی۔"(۴۲)

سائنس کے میدان میں بے پناہ ترقی نے جہاں انسان کے لیے بہت سی آسانیاں مہیا کی ہیں،وہیں اس کے لیے مشکلات کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔ مگر انسانی تاریخ میں سب روزِ اول سے ہوتا آرہا ہے کہ جیسے جیسے ٹیکنالوجی نے ترقی کی ویسے ویسے انسانی زندگی میں کئی مسائل نے بھی جنم لیے۔آج ٹیکنالوجی نے ترقی کے پہیے کو مزید تیز رفتار کر دیا ہے۔ تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور خطرات اور خدشات بھی اسی رفتار سے بڑھتے جارہے ہیں۔ جہاں انسان کو زندگی کی بیش بہا سہولیات مہیا ہوئی ہیں،وہاں اس ٹیکنالوجی نے انسان کو خطرات کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔آج کا انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں ہونے والی ساری سرگرمیوں کو دیکھ سکتا ہے۔ان پر نظر رکھ سکتا ہے اور لوگوں کی گفتگو کو بآسانی ریکارڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آج کے زمانے میں لوگوں کے لیے خطرات بڑھتے جارہے ہیں۔

دورِ حاضر میں انٹرنیٹ کو نہایت خطرناک قرار دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ موبائل فون کو بھی ماہرین نے انسان کے لیے مشکلات کا سبب گردانا ہے۔ کسی بھی شخص کی نگرانی اور جاسوسی آج انہی ذرائع ابلاغ کی وجہ سے بہت آسان ہو گئی ہے۔مزید برآں جن لوگوں کی جاسوسی کی جارہی ہوتی ہے،انہیں اس بارے میں کانوں کان

خبر تک نہیں ہوتی اور وہ ان سہولیات کو بے دریغ طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ان کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ بظاہر نظر آنے والی یہ سہولیات ان کی زندگیوں کو کسی گہرے خطرے میں مبتلا کر سکتی ہیں۔ان کی گفتگو اور دیگر افعال کی کوئی نگرانی کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس سب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ان کے خلاف اکٹھا کیا جانے والا ریکارڈ کسی بھی وقت ان کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اور مختلف طریقوں سے انہیں کسی بھی غلط کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے یا پھر انہیں بلیک میل کرنے کے لیے بھی یہ سب کیا جاتا ہے۔

کسی دور میں جاسوسی یا نگرانی کے کام ریاستی ادارے کیا کرتے تھے۔مگر جدید ٹیکنالوجی نے یہ سب عام آدمی کی دسترس میں بھی دے دیا ہے۔آج یہ کام نجی اور تجارتی ادارے بھی بآسانی کر سکتے ہیں۔فیس بک کے بارے میں امریکہ کی کسی سیاسی شعبے کی کنسلٹنسی پر صارفین کو معلومات مہیا کرنے کا الزام ہے۔اس ضمن میں تقریباً ۵ کروڑ سے زیادہ صارفین کا ڈیٹا لیک ہونے کا خدشہ ظاہر کیا گیا۔جس کے بارے میں تحقیقات کی جا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ فیس بک جو کہ سماجی رابطوں کی سب سے مقبول ویب سائٹ سمجھی جاتی ہے۔اس پر بھی صارفین کا ذاتی ڈیٹا اور معلومات لیک کرنے کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔اس بارے میں صارفین کے حقوق کے علمبردار ادارے فیڈرل ٹریڈ کمیشن (ایف۔ٹی۔سی) نے فیس بک انتظامیہ کے خلاف معلومات لیک کرنے پر فوری کاروائی شروع کر دی ہے۔ان تحقیقات کے عمل میں آتے ہی اسٹاک مارکیٹ میں فیس بک کے شئیرز کو ۴۰ ارب ڈالر کا خطیر نقصان ہوا ہے۔جس پر مبصرین اور ماہرین نے نہایت تشویش کا اظہار کیا ہے۔بہت سے لوگ فیس بک کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے ہیں۔جن میں امریکہ کی ری پبلیکن پارٹی سے تعلق رکھنے والے ارکان سر فہرست ہیں۔ایری زونا کے سینٹر جیف فلیگ کے مطابق نجی معلومات مہیا کرنا یا انہیں لیک کرنا نہایت سنگین عمل ہے۔بعد ازاں سینٹر مارکو روبیو نے بھی اس طرح انکشافات افشا ہونے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

جدید دور میں چھوٹے بچوں کو انٹرنیٹ کے ذریعے ہراساں کرنے کا عمل بھی کافی تیز ہو رہا ہے۔اس کے علاوہ ویڈیو گیمز کے ذریعے نوجوانوں کو غیر صحتمندانہ سرگرمیوں میں ملوث کیا جا رہا ہے۔اس طرح کی ویڈیو گیمز انٹرنیٹ پر مقبول ہو رہی ہیں جن میں نوجوان ذہنوں کو منفی سرگرمیوں کی طرف راغب کر دیا جاتا ہے۔یہاں تک کہ نوجوان ان برے لوگوں کے ہاتھوں مین کھلونا بن جاتے ہیں اور خودکشی تک کرنے کو قبول کر لیتے ہیں۔حال ہی میں ویڈیو گیمز کے ذریعے بہت سے لوگ ٹاسک پورے کرتے کرتے اپنی جان کی بازی ہار گئے۔

۱۱۔آبی دہشت گردی:

کرہ ارض پر انسانی آبادی میں بے پناہ اضافے کے باعث قدرتی وسائل میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔انسان کے نت نئے تجربات نے بھی قدرتی وسائل کو انسانی کھپت کے مقابلے میں کم کر دیا ہے۔آج دنیا میں پانی کی کمی کا مسئلہ زور پکڑتا جارہا ہے۔خاص طور پر پاکستان میں آبی وسائل روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں بہنے والے دریا بھارت سے آتے ہیں۔اور بھارت نے پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں کا پانی روک لیا ہے اور ڈیم بنا کر اپنا پانی ذخیرہ کرنا شروع کر دیا ہے جبکہ یہ دریا پاکستان تک پہنچنے سے پہلے ہی خالی ہو جاتے ہیں۔بھارت کی آبی دہشت گردی کی وجہ سے پاکستان کی زمینیں بنجر ہوتی جارہی ہیں۔ دریا سوکھتے جارہے ہیں۔ ویسے تو دنیا بھر میں پانی کے مسائل موجود ہی ہیں مگر پاکستان میں یہ مسئلہ سنگین صورتحال اختیار کرتا جارہا ہے۔آج پاکستان میں آبادی کا تقریباً ۸۵ ٪ حصہ پینے کے صاف پانی سے بھی محروم ہیں۔پاکستان ان ممالک میں شامل ہے جو اپنی مجموعی قومی آمدنی کا بہت ہی کم حصہ پانی کی فراہمی اور نکاسی آب جیسے مسائل پر خرچ کرتے ہیں۔ جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ نکاسی آب کا بہتر نظام نہ ہونے کی وجہ سے آلودگی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جس کی وجہ سے ہر سال پاکستان میں باون ہزار بچے اسہال اور ہیضہ جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔پیٹ کی موذی بیماریوں کی وجہ سے متعدد افراد ہر سال جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں پانی کا بحران شدت اختیار کرتا جارہا ہے، جس کی وجہ دراصل بھارت کی آبی دہشت گردی ہی ہے۔ آبی دہشت گردی کی وجہ سے ہر سال ملک میں سیلاب بھی آتے ہیں۔انڈیا نے پاکستان کو آج تک دل سے تسلیم نہیں کیا اور دہشت گردی کے مختلف ہتھکنڈے ہمیشہ سے استعمال کرتا ہی آیا ہے۔ جس کے باعث پاکستان کے چاروں صوبوں میں دہشت گردی اور تخریب کاری کے واقعات آئے روز رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پاکستان آج بھی نظریاتی و جغرافیائی جنگ کا سامنا کر رہا ہے۔امریکہ اور افغانستان جنگ کا سب سے بڑا فائدہ بھارت حاصل کر رہا ہے اور اس کی سازشوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پاک چین منصوبے (سی پیک) کی وجہ سے بھارت نے اپنی دشمنی میں اضافہ کر دیا ہے۔ کشمیر پر مظالم کی داستان تو کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں۔انڈیا نے پاکستان کی طرف آنے والے ندی نالوں پر ڈیم بنانے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ تیزی سے جاری و ساری ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے لہلہاتے کھیت بھی بنجر ہوتے جارہے ہیں۔انڈیا کی آبی دہشت گردی کی وجہ سے پاکستان میں سیلاب کی صورت میں بھی بہت زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ہر سال برسات میں شدید بارشوں کی وجہ سے بھارت پاکستان میں پانی چھوڑ دیتا ہے اور سندھ طاس معاہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔اس معاہدے میں یہ بات واضح

طور پر کی گئی تھی کہ پاکستان کی طرف آنے والے پانی کو بھارت کسی صورت نہیں روکے گا۔ مگر بھارت سارے کے سارے پانی کو اپنے قبضے میں لینے کی مذموم کوشش کرتا رہتا ہے۔ ۱۹۶۰ ء میں جو پاک بھارت معاہدہ ہوا تھا ،اس میں سندھ ، چناب اور جہلم کا زرعی پانی پاکستان کے حصے میں آیا۔ جبکہ ستلج ،بیاس اور راوی کا پانی انڈیا کے حصے میں آیا۔ مگر آج صورتِ حال اس سے قدرے مختلف ہے۔ انڈیا پاکستان کی طرف آنے والے سارے کے سارے پانی کو روکنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہے۔ تاکہ پاکستان کے لوگ ایک ایک بوند کو ترسیں اور پاکستان کی زمینیں بنجر ہو جائیں، پاکستان کی ترقی کا پہیہ رک جائے اور ملک میں عدم استحکام اور قحط کی سی صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ بھارت پاکستان کے ایٹمی منصوبوں کو تو ناکام نہیں بنا سکا۔ اس بات کا بدلہ وہ آبی دہشت گردی کی صورت میں لے رہا ہے اور پاکستانی دریاؤں پر ڈیم بنا کر پاکستان کی زرعی زمین کو مکمل طور پر بنجر کر کے صحراؤں میں بدلنا چاہ رہا ہے۔ آج پاکستان میں پانی کی سطح مسلسل نیچے ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے کئی مسائل نے جنم لیا ہے۔ بھارت کی آبی دہشت گردی کا زور توڑنے کا واحد حل یہی ہے کہ پاکستان میں پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے ڈیم بنائے جائیں کیوں کہ ہر سال پانی کا کثیر ذخیرہ سمندر کی نذر ہو جاتا ہے اور ڈیم نہ ہونے کی وجہ سے پانی ضائع ہو جاتا ہے۔ دریا سوکھنے کی وجہ سے پانی کی سطح بھی نیچے چلی گئی ہے جس کی وجہ سے سنکھیا کی آمد شروع ہو گئی ہے اور لوگوں میں جگر، گردے، یرقان کینسر اور پیٹ کی موذی بیماریوں کی افزائش ہونے لگی ہے۔ بھارت کی آبی دہشت گردی کی وجہ سے ہم پینے کے صاف پانی سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ زمینیں سوکھ رہی ہیں اور آبی حیات بھی ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بھارت کی آبی دہشت گردی کو روکنے کے لیے بین الاقوامی عدالتوں میں آواز اٹھائی جائے اور ہر ممکن طریقے سے پانی کی قلت پر قابو پانے کی کوششیں کی جائیں۔ تاکہ آنے والی نسلوں کی خطہ ارض پر زندگیاں محفوظ بنائی جا سکیں۔ اس سارے معاملے میں اب ذرا سی غفلت یا مصلحت پسندی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ تاکہ ہم سب کا آنے والا کل محفوظ اور روشن ہو۔

"پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز "میں سیکیورٹی کی صورتحال کا جائزہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> "گزشتہ سال کے مقابلے میں ۴۲ فیصد زیادہ، کل ۲۰۷ دہشت گرد حملے ہوئے۔ پاکستان میں سال ۲۰۲۱ء میں پانچ خودکش دھماکے بھی ہوئے۔ مختلف قوم پرست باغی، مذہبی طور پر متاثر عسکریت پسند اور متشدد فرقہ پرست گروپوں کے مطابق، ان حملوں میں تمام ۳۳۵ افراد ہلاک ہوئے۔ ان حملوں میں ۵۲ فیصد اضافہ ۲۰۲۰ء میں اس طرح کے حملوں میں ہلاک ہوئے اور مزید ۵۵۵ افراد زخمی ہوئے۔ مذہبی طور پر متاثر عسکریت پسند گروہ جیسے تحریک طالبان

پاکستان (ٹی ٹی پی)، مقامی طالبان گروپس، اور اسلامک اسٹیٹ خراسان (IS-K) وغیرہ۔ مجموعی طور پر کل ۱۲۸ دہشت گرد حملے ہوئے جن میں ۲۳۶ افراد ہلاک اور ۲۷۸ زخمی ہوئے۔ مختلف بلوچی اور سندھی قوم پرست باغی گروپوں نے ۷۷ حملے کیے جبکہ ۲۰۲۰ء میں ایسے ۴۴ حملے ہوئے۔ جس میں ۹۷ افراد ہلاک اور ۲۵۵ زخمی ہوئے۔ دریں اثناء، اس کے مقابلے میں ۲۰۲۰ء میں سات، ۲۰۲۱ء میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے دو حملے ریکارڈ کیے گئے۔ زیادہ سے زیادہ جانیں اور دیگر افراد کو زخمی کرنے کی تصدیق ہوئی۔ سیکیورٹی فورسز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ ۲۰۲۱ء میں دہشت گرد حملوں میں ہلاکتوں کی تعداد بشمول ۱۷۷ ہلاک اور ۲۱۸ زخمی؛ ان ۱۷۷ ہلاک ہونے والوں میں ۶۵ فوجی اہلکار تھے۔ ۵۳ پولیس اہلکار؛ ۴۸ ایف سی مرد؛ ۶ لیویز؛ ۴ غیر متعینہ نیم فوجی سپاہی؛ اور ایک رینجرز اہلکار۔ اسی طرح ۱۲۶ شہری حملوں میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ۳۲۸ زخمی ہوئے۔ ۳۲ عسکریت پسند مارے گئے اور نو زخمی ہوئے، یا تو خودکش دھماکوں میں یا سیکیورٹی میں کچھ حملوں کے بعد فورسز کی جوابی فائرنگ سے۔"(۴۳)

ایک اور تخمینے کے مطابق:

"پاکستان کے شورش زدہ صوبہ بلوچستان میں گزشتہ دہائی میں ۲۸۸۶ دہشت گرد حملے اور ۳۱۸۴ ہلاکتیں ہوئیں۔ جنوب مغربی صوبے میں ۱۷۰۱ عسکریت پسندوں کے حملوں میں ۲۰۴۸ افراد ہلاک ہوئے۔ ۲۰۱۶ء سے ۲۰۲۰ء تک ۱۱۸۵ دہشت گردانہ حملوں میں ۱۱۳۵ افراد ہلاک ہوئے۔ گزشتہ دہائی میں دہشت گردی سے متعلق ۳۱۸۴ اموات میں سے ۲۰۵۸ عام شہری اور ۱۱۲۶ سیکیورٹی اہلکار تھے۔ کوئلے کے کان کنوں کی ٹارگٹ کلنگ کی دنیا بھر میں مذمت کی گئی، جس میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوٹیرس اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر وولکان بوزکر کے دفاتر کی مذمت بھی شامل ہے۔ ہلاک ہونے والے کوئلے کی کان کنوں کے اہل خانہ نے ابتدائی طور پر عسکریت پسندوں کی گرفتاری تک لاشوں کو دفنانے سے انکار کر دیا تھا۔"(۴۴)

وزارت داخلہ کے مطابق پاکستان میں دہشت گردی پاکستانی عوام کے لیے ایک اہم خطرہ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دہشت گردی کی موجودہ لہر ۲۰۰۰ء میں شروع ہوئی اور ۲۰۰۹ء کے دوران عروج پر پہنچ گئی۔ تب سے، پاکستان آرمی کی طرف سے کی جانے والی فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں اس میں زبردست کمی آئی ہے۔ ساؤتھ

ایشین ٹیررازم پورٹل انڈیکس (SATP) کے مطابق پاکستان میں ۲۰۰۹ سے ۲۰۱۷ میں دہشت گردی میں ۸۶ فیصد کمی آئی ہے۔ ۲۰۲۱ میں پاکستان کی دہشت گردی سے منسلک کل اموات (۶۶۴ اموات) کا ۲۹.۴۸ فیصد اکیلے بلوچستان کا تھا۔

۲۰۰۱ سے، پاکستانی فوج نے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) میں دہشت گرد گروہوں کے خلاف فوجی کارروائیوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس حملے نے ان علاقوں اور ملک کے باقی حصوں میں امن قائم کیا۔ متعدد دہشت گرد گروہوں سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد مارے گئے۔ تاہم، کچھ عسکریت پسند افغانستان فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ افغانستان سے، وہ عسکریت پسند سرحد کے قریب واقع پاکستانی فوجی چوکیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ ۲۰۱۷ میں، افغانستان کے چیف ایگزیکٹو عبداللہ عبداللہ نے اعتراف کیا کہ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے افغانستان میں قدم جمائے ہوئے ہیں۔ ۲۰۱۹ میں، ریاست ہائے متحدہ کے محکمہ دفاع نے دعویٰ کیا کہ TTP سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۳۰۰۰ سے ۵۰۰۰ دہشت گرد افغانستان میں موجود ہیں۔ براؤن یونیورسٹی کے واٹسن انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل اینڈ پبلک افیئرز کی رپورٹ کے مطابق دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ۲۳۷۲ پاکستانی شہری اور ۸۸۳۲ پاکستانی سکیورٹی اہلکار مارے گئے۔ مزید برآں، حکومت پاکستان کے مطابق، ۲۰۰۰-۲۰۱۰ تک دہشت گردی کی بالواسطہ اور بالواسطہ اقتصادی لاگت ۶۸ بلین ڈالر تھی۔ ۲۰۱۸ میں پاکستانی اخبار ڈان نیوز نے رپورٹ کیا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی وجہ سے پاکستانی معیشت کو ۲۰۰۱ سے اب تک مجموعی طور پر $۱۲۶.۷۹ بلین کا نقصان ہوا ہے۔

پاکستانی حکام اکثر بھارت اور افغانستان پر پاکستان میں دہشت گردی کی حمایت کا الزام لگاتے ہیں۔ بھارت نے پاکستان کے الزامات کی تردید کی ہے۔ تاہم، افغانستان نے تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) جیسے دہشت گرد گروپوں کو مدد فراہم کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں، امریکہ نے ایک افغان قافلے پر حملہ کیا جو لطیف محسود کو کابل لے جا رہا تھا۔ لطیف تحریک طالبان پاکستان (TTP) کا سینئر کمانڈر تھا۔ افغان صدر کے ترجمان ایمل فیضی نے صحافیوں کو بتایا کہ نیشنل ڈائریکٹوریٹ آف سیکیورٹی (این ڈی ایس) لطیف کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ لطیف ٹی ٹی پی کو فنڈز فراہم کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ ٹی ٹی پی کے لیے کچھ فنڈنگ NDS سے آئی ہو گی۔ این ڈی ایس کے سابق سربراہ اسد اللہ خالد نے اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ پر ٹی ٹی پی سے

تعلق رکھنے والی ایک ویڈیو پوسٹ کی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ بڈھ بیر کیمپ پر حملہ بالکل ٹھیک تھا۔،،(۴۵)

درج بالا بحث سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے خواہ وہ ظلم و ستم کی صورت میں ہو، دہشت پھیلا کر ناجائز طریقے سے مال کے حصول کی صورت میں ہو، قتل و غارت کی صورت میں ہو۔ جائیداد ہتھیانے کی صورت میں ہو، سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے لوگوں کا قتل عام ہو جعلی پولیس مقابلوں میں لوگوں کو مارنے کی صورت ہو، یا ریاست کا اپنے شہریوں پر ظلم کرنے اور انہیں مارنے کی صورت میں ہو، ایسا کوئی بھی عمل جو کسی بھی معاشرے میں فساد پھیلانے کا سبب بنے اور جس سے معاشرے کے بے قصور اور بے گناہ لوگ خوف و ہراس کا شکار ہوں۔ دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے۔

و۔ اردو ادب میں دہشت گردی بطور موضوع:

عہد حاضر میں اردو ادب نے برق رفتاری سے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ ایک طرف وقت کی ضرورت کے تحت نت نئی اصناف وجود میں آرہی ہیں تو دوسری جانب پہلے سے موجود اصناف میں فکری اور فنی ہر دو سطح پر انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ دنیا گاہے گاہے ان تجربات و تغیرات کی لپیٹ میں ہے۔ یہ عہد ابتلاء کا دور ہے۔ ہر جانب مقابلے کی سی فضا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں رجحانات اور تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اردو ادب کی شناحت قائم رکھنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس میں جدید رجحانات اور دیگر عالمی ادب کی برابری پر لانے کے لیے ایک معیاری ادب تخلیق کیا جائے جو ہر سطح پر اپنی ایک شناخت قائم کرے یہی حالات کا تقاضا ہے۔

کوئی بھی شاعر، ادیب یا تخلیق کار اپنی تخلیق کا تانا بانا اپنے معاشرے سے ہی جمع کرتا ہے اور اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے حالات و واقعات کو تحریر کی شکل میں ڈھالتا ہے۔ اگر اسے ماحول میں وحشت، خون، خون خرابہ، بم دھماکے اور لوگوں کی لاشیں ملیں گی تو اس کی تخلیق، اس کی شاعری اس کا افسانہ اور اس کا ناول انہی کی ترجمانی کریں گے۔ اردو ادب نے ان تمام وحشت زدہ واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر تمام اصناف یعنی اردو ناول، افسانے، غزل اور نظم میں پیش کیا ہے۔ دہشت گردی نے دنیائے عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اس میں بسنے والے ادباء، دانش وروں اور شعراء نے اپنی تخلیقات میں ان اثرات کی تصویر کشی کی ہے۔

اردو غزل، نظم اور ناول پر دہشت کے اثرات:

تخلیق کا عمل ایک پیچیدہ اور تہہ دار عمل ہے۔ جس کی ابتداء احساس سے ہوتی ہے اور الفاظ کی شکل اختیار کرتی ہے اس سارے عمل میں بعض دفعہ چند لمحے اور بعض اوقات کئی عشرے لگ جاتے ہیں۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جہاں ۹/۱۱ کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے وہاں اس سانحے نے عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی دور رس اثرات مرتب کیے۔اس تناظر میں بے شمار کہانیاں، ڈرامے ،افسانے اور ناول قلم بند ہوئے۔ پاکستان بھی دہشت گردی کا نشانہ بننے والے ممالک میں شمار ہوتا ہے اور چوں کہ دہشت گردی کے واقعات نے ہماری سر زمین پر براہ راست اثرات ڈالے اس لیے پاکستان میں شعراء اور ادیبوں نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ان تخلیق کاروں کے ہاں بے شمار موضوعات ملتے ہیں جن میں جبر واستحصال، فرقہ وارانہ فسادات اور مختلف نوعیت کے جرائم کا ذکر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں۔

> "یہاں اس بات پر بحث کرنا مقصود نہیں کہ رویہ کس حد تک جائز اور یک طرفہ ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب بھی ملکی سیاست یا معاشرتی زندگی کے افق پر کوئی قابل ذکر واقعہ رونما ہوا اردو ادیبوں نے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے۔"(۴۶)

نائن الیون کے سانحے کے بعد پاکستانی اردو غزل میں فکری سطح پر جن موضوعات کا اضافہ ہوا اور جن کی وجہ سے شعراء کی توجہ خصوصا مبذول ہوئی وہ تمام کے تمام سماجی حقائق کے مربوط حوالوں سے عبارت ہیں۔ ان میں دنیا کی عظیم سلطنتوں کی خواہشات کے پیدا کردہ وہ تمام دکھ بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے چھوٹے ممالک کی ثقافت اور صنعتی و اقتصادی ترقی ،مذہبی روایات اور تہذیبی شعور کو کچلنے کی سازش شامل ہے ۔اس ساری صورت حال میں اقوام متحدہ کا کردار بھی جانب دار رہا۔اس تنظیم نے چھوٹے ملکوں کے حق کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی اور امریکہ اور برطانیہ کو نقشے پر ان کی مرضی کے مطابق چلنے میں مدد کی اور ان کی مکروہ سازشوں کو بے نقاب کرنے کے بجائے ان کا ساتھ دیا۔اس مکروہ عمل میں مسلم ممالک خصوصا عراق اور افغانستان کو نشانہ بنایا گیا اور اب پاکستان کو بھی اس جنگ کا حصہ بنایا۔ دنیا نے نائن الیون کے سانحے کو ٹی۔وی اسکرین پر دیکھا۔ مسلمانوں کے بارے میں دنیا بھر کے میں ایک غلط تاثر قائم کیا خصوصا امریکہ میں بسنے والے تمام مسلمانوں کو دہشت گرد کا ٹیگ لگ گیا۔اس سے پیدا ہونے والے فوری اثرات اور منظر کو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔اس واقعے نے گزشتہ عشرے میں ہماری اقتصادیات ، تہذیب، سماجیات اور سیاست کو بدل کر رکھ دیا، ساتھ

ہی اس نے ہماری تہذیبی اقدار اور اصناف سخن پر گہرے نقوش چھوڑے۔ پاکستان کی مغربی سرحدیں عظیم حادثے کی تپش کئی برسوں تک محسوس کرتی رہی ہیں۔ جوہر میر لکھتے ہیں۔

"عمارت اپنے پاؤں پر کھڑی ہے
تو مٹی سارے گاؤں پر گری ہے
بلندی یوں گری ہے پستیوں پر
کہ جیسے دھوپ چھاؤں پر گری ہے۔"(۴۷)

اس غزل میں مطلع میں گاؤں سے مراد دنیا ہے۔ شاعر نے دنیا کے ساتھ بستیوں، کہکشاوں، بجلی گھٹاؤں، دھوپ، چھاؤں کے الفاظ کو علامتی اور تلازماتی اشاروں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جس میں گہری معنویت پوشیدہ ہے۔

کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں

"عجب شعلہ یہاں دیکھا گیا ہے
فضا سے بھی دھواں دیکھا گیا ہے
بلندی سرنگوں دیکھی گئی ہے
پریشان آسماں دیکھا گیا ہے۔"(۴۸)

غزل کو ہر دور میں پذیرائی ملی ہے۔ یہ اظہار بیان کا مرعوب اور پسندیدہ ذریعہ رہی ہے۔ نائن الیون کے واقعہ اور اس سے پیدا ہونے والے حالات سے مسلسل متاثر ہو رہی ہے۔ ہمارے شعراء نے اس دل دوز واقع کو کثیر الجہت پہلوؤں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے اور سب نے اپنے اپنے انداز میں اس دکھ کا اظہار بھی کیا۔ گزشتہ دہائی میں اگر دیکھا جائے غزل میں اس سانحے کے پس منظر میں خطہ بہ خطہ بدلنے والی صورت حال کے ساتھ ساتھ ایسا خون چکاں شعری تاریخ کا وجود مرتب ہوتا ہے جس میں اس اندوہناک واقعے سے جنم لینے والا ہر ارتعاش مکمل طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ دہائی میں شایع ہونے والی شعری مجموعوں، اخبارات و جرائد اور رسائل میں چھپنے والی غزلیات میں تباہی و بربادی، خوف و ہراس، ہجرت و مسافرت، قتل و غارت گری اور ہزیمت و پامردی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے پر اُمید اور روشن خواب بھی دکھائی دیتے ہیں جو کہ ہر صدق اور حق پرست اہل قلم کا اثاثہ ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا قطعی یقین ہے کہ حق کو باطل کے خلاف بالآخر سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے اور انصاف طلب قومیں ہمیشہ فتح یاب ہوتی ہیں۔ اردو غزل کی طرح اردو نظم

پر بھی نائن الیون کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔اس سانحے کے نتیجے میں پیدا ہونے شعری ادب کی تیسری سطح ان ابدی اور ازلی المیوں کا اظہار ہے۔ جس کی لپیٹ میں پوری امت مسلمہ آچکی ہے۔ یہ دکھ ایک عالم گیر حیثیت اختیار کر چکا ہے اور ظلم و جبر کی یہ سیاہ اندھیری رات اب تک سحر میں نہیں بدل پائی۔افغانستان، عراق اور پاکستان کو اس سانحے سے سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔یہ ممالک بری طرح سے شکست و ریخت کا شکار ہیں اور ان کو مذہبی و سماجی ہر دو سطح پر خطرات لاحق ہیں ان ممالک کی تجارت، صنعت و حرفت، درآمد و برآمد زوال کی آخری حدود کو چھو رہی ہے۔ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہر لحظہ خوف کا شکار ہیں۔اس سانحے نے بری طرح سے ان ممالک کے انتظامی ڈھانچے کو متاثر کیا ہے۔ تقریباً تمام شعراء نے اس سانحے کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر اپنا کرب بیان کیا ہے۔اس میں سے اختر جمال کا قابل ذکر ہے۔ جنہوں نے ہمارے سیاسی و سماجی کرب کو نہ صرف محسوس کیا بل کہ اس دردناک احساس نے ان کے کلام میں جو شعری ترفع عطا کیا ہے وہ قابل دید ہے۔ نظم زمستان کا نوحہ ملاحظہ ہو:

"ابھی پچھلے جنازوں کے نمازی گھر نہیں لوٹے
ابھی تازہ کھدی قبروں کی مٹی بھی نہیں سوکھی
اگر بستی کی خوش بو سانس کو مصلوب کرتی ہے
پس چشم عزا ٹھہرے سر شک حشر بستہ بھی ابھی احساس کا نم ہے۔"(۴۹)

اس نوحے میں شاعر دہشت گردی کا نشانہ بننے والے ان گنت لوگوں کی موت کا ماتم کر رہا ہے۔ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھنے والوں کی قبر کی مٹی ابھی سوکھی نہیں ہوتی کہ ان کے فوراً بعد ہی کوئی اور ایسا سانحہ رونما ہو جاتا ہے۔

"وحید احمد" کا نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔انہوں نے دہشت گردی جیسے موضوع کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے اور لفظ گری اور تمثال سازی میں بہت بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ نظم سرگوشیاں ملاحظہ ہو:

"یہ جو خودکش لوگ
جن کے پیٹ میں بارود کی پیٹی ہے
کیا مریخ سے آئے ہیں؟ کیا زہرہ سے اترے ہیں؟
یہیں کی خاک ہیں یہ اور انہیں کا خون ہیں یہ بچے
پھر ان کے ساتھ روحیں اتنی سرعت سے نکلتی ہیں

کہ عزرائیل کی زنبیل میں کہرام مچا ہے "(۵۰)

یعنی یہ خود کش بمبار بھی اسی زمین کے باسی ہیں مگر ان کی سرکشی اور بربریت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی اور سیارے سے آئے۔ ان کے لیے کسی ذی روح کی جان لینا کوئی کٹھن کام نہیں۔ کسی بھی خود کش حملے میں بے شمار، بے گناہ اور معصوم لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور ایک آن میں ان کی روحیں پرواز کر جاتی ہیں۔

"کشور ناہید" کی نظم طالبان سے قبلہ رو گفتگو کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

"وہ جو بچیوں سے ڈر گئے
وہ یہیں کہیں ہیں قریب میں
انہیں دیکھ لو، انہیں جان لو
انہیں کچھ بھی ان سے بعید
شہر زوال میں۔"(۵۱)

کشور ناہید نے اپنی نظم "سوات کا نوحہ" میں سوات پر طالبان کے تسلط اور ان کے خوف اور دہشت کو موضوع بنایا ہے۔ سوات پر ۹/۱۱ کے سانحہ کے بعد طالبان نے بے پناہ ظلم ڈھائے اور اس پُر امن خطے میں خون کی ہولی کھیلی۔ پاک فوج نے آپریشن کے ذریعے اس خطے کا امن بحال کیا کشور ناہید ان ظالم طالبان کی تصویر کشی اس طرح کرتی ہیں:

"مجھے داڑھی سے چھپے مردانہ چہرے سے خوف آتا ہے
مجھے سفید ٹوپی پہنے مردانہ سروں سے خوف آتا ہے
مجھے معصوم بچوں کے سروں کو مدرسوں میں ہلتا دیکھ کر خوف آتا ہے۔"(۵۲)

یعنی ۹/۱۱ کے سانحہ کے بعد داڑھی والا ہر شخص ہی شک کے زمرے میں آنے لگ گیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں مسجد میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء مستقبل کے دہشت گرد بن جائیں گے۔ اور ان کا برین واش کر کے ان کو اس قبیح فعل کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

اگر اردو ناول کے حوالے سے ہم دیکھیں تو اردو ناول خالص تحقیق عمل سے مربوط ایک گہرا پس منظر رکھتی ہے۔ اردو ناول کی عمر زیادہ طویل نہیں ہے کیوں کہ اردو فکشن کی تحریری ضرورت تو تقریباً ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے مگر اب تک خالصتا تخلیقی نوعیت کے ناولوں کی تعداد گنی چنی ہی ہے۔ نائن الیون کا سانحہ بلاشبہ

اکیسویں صدی کا عظیم سانحہ ہے اور کوئی بھی عظیم ناول نگار اس سانحے سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس واقعے نے دنیا کے معاشی، سماجی اور اخلاقی حالات کا رخ ہی بدل دیا اور اردو ادب میں اس کی عکاسی ملتی ہے۔ اس بات کو کسی طور پر بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ جو ادب اپنے معاشرے اور زمانے کا ترجمان نہ ہو گا۔ وہ تاریخ ادب میں بھی دیر پا نہیں ہو گا۔ مگر اس قسم کے واقعات کو ادب کا موضوع بنتے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسے سانحے مرتب ہوتے ہوتے بھی کچھ عرصہ لیتے ہیں۔ ۹/۱۱ کے تناظر میں جو ناول لکھے گئے ان میں مشرف علی ذوقی کا ناول "پو کے مان کی دنیا" ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں دہشت گردی کو موضوع بنایا گیا ہے اسی طرح اس موضوع کو ۲۰۰۳ء میں بانو قدسیہ کا "حاصل گھاٹ" بیان کیا گیا۔ دہشت گردی کے تناظر میں مستنصر حسین تارڑ کے دو ناول "قلعہ جنگی" اور "خس و خاشاک زمانے" نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں: قلعہ جنگی" سر فہرست ہے۔ اس ناول میں ۹/۱۱ کے واقعے کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ ناول اپنے نام سے لے کر پورے تخلیقی پھیلاو تک اس سانحے کے گہرے نقوش لیے ہوئے ہے یہ ناول ۲۰۰۴ء میں شایع ہوا۔ اس وقت ۹/۱۱ کے سانحے کو بیتے تین برس ہو چکے تھے۔ اس ناول کی کہانی ان طالبان سے منسلک ہے جن کی ملاقات قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں ہوتی ہے یہ سات لوگ مختلف ممالک اور تہذیبوں سے تعلق رکھتے جو کہ ایک دوسرے کو اپنے واقعات بیان کرتے ہیں۔

اس ناول میں جیتے جاگتے انسانوں کے علاوہ ایک گھوڑے کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے جو کہ امریکی بم باری میں زخمی ہے۔ اس ناول میں سات کرداروں کی کہانی ہے جو کہ مختلف ممالک اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں منتقل ہونے کے بعد وہ لوگ ایک دوسرے کے متعلق جاننا شروع کرتے ہیں۔ ناول کی کہانی میں ان طالبان کو موضوع بنایا گیا ہے جن کو ذاتی مفادات کے حصول کی غرض سے تربیت دی گئی اور جب وہ اپنے مذموم عزائم۔ حاصل کر لیے گئے تو ان کو ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا گیا۔ اس ناول میں تنظیم القاعدہ کے مختلف علاقوں پر قبضے کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔ جب نائن الیون کا واقعہ رونما ہوا تو امریکہ نے طالبان اور القاعدہ کو اس کے لیے مورد الزام ٹھہرایا۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری لکھتی ہیں:

> "جب افغانستان پر روس نے حملہ کیا تو ہزاروں عرب ادھر آ نکلے اور القاعدہ سے متاثر ہوئے ۔۔۔ امریکہ اور یورپ کی آنکھوں کے تارے جن کی جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھر دی جاتی تھیں ۔ یہ وہی مجاہدین اور ہیرو تھے جو ۹/۱۱ کے بعد

دہشت گرد بن گئے۔ پہلے یہ جہاد تھا کہ روس مد مقابل تھا اور اب یہ دہشت گردی ہے کہ وہ اپنا دفاع کر رہے تھے۔"(۵۳)

قلعۂ جنگی میں امریکہ افغانستان جنگ میں کرداروں کے ذریعے مزاحمتی رویوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس ناول میں جنگی قیدیوں کی گرفتاریوں اور ان میں سے بعض قیدیوں کے فرار ہونے اور اپنی جان بچانے کے لیے مزاحمت کرنے اور پھر گرفتار کرنے والوں میں سے چند ایک کو مارنے اور اس کے بدلے میں امریکی بمبار طیاروں کی بمباری اور اس کے نتیجے میں تمام قیدیوں کی دردناک موت کے مناظر بیان کیے گئے ہیں۔

"وہ ہراساں ہو گئے کہ اب انہیں اجتماعی طور پر قتل کیا جانے لگا ہے کہ روایت یہی تھی اور جن کے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے نہیں تھے انہوں نے بغاوت کر دی، شمالیوں کو اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو انہیں فتنہ پروری سے روکنے کے لیے باندھ رہے تھے۔۔۔ان کے قتل کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ حواس کھو بیٹھے اور جن کی تلاشی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے ہتھیار نکال کر فائر کرنے لگے۔۔۔دوستم کا پولیس چیف ان کا نشانہ بن گیا۔۔۔ایک امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کے پرخچے اڑ گئے اور پھر ان پر بی ۵۲ کا عتاب نازل ہو گیا۔ قلعے کی دیواروں میں نصب مشین گنوں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا، سب کا سب اگل دیا۔ ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر آسمان سے نازل ہونے لگے اور کچے صحن میں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر انہیں زندہ دفن کرتے گئے۔۔ یہ قیامت تو نہیں تھی پر قیامت سے کم نہ تھی۔۔ بلکہ زیادہ تھی ۔۔۔وہ رزق خاک تھے سو خاک ہوئے۔۔۔یہ کھیل تماشا صرف چند لمحوں کا تھا اور پھر ختم ہو گیا۔"(۵۴)

ناول نگار نے طالبان کی لاچاری اور بے بسی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ قابل دید ہے۔ یہ کائنات ایسے ہزاروں لرزہ خیز واقعات کی گواہ ہے جن کی وجہ سے اقوام عالم انقلاب سے دوچار ہوئیں۔ امریکہ کی سرزمین پر پیش آنے والے اس واقعے نے پوری ملت اسلامیہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ان طالبان کے لیے بھی زمین سی تنگ ہو گئی جنہوں نے دہشت گردی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ امریکیوں نے ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد ان کو ہی اپنا نشانہ بنا لیا تھا۔ وہ نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے اور موت ہی ان کا مقدر بنی۔

جانی اور مرتضی کے چند مکالمے ملاحظہ ہوں:

"تم کشمیر میں بھی تھے؟ مرتضی کی کڑواہٹ یکلخت حیرت میں بدلی۔۔۔۔ہاں ۔۔۔ میں وہاں ایک امریکی ٹورسٹ کے بھیس میں گیا تھا۔ بھیس میں کیا میں تھا ہی امریکی۔۔۔اور کسی نے مجھ پر شک نہ کیا۔تب میں یمن سے عربی سیکھ کر آیا لیکن مجھے اردو ابھی بھی تھوڑی آئی تھی۔ مجھے وہاں جو ساتھی ملے ان سے تو میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ سوری جانی پلیز فار گومی! مرتضی لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ جدھر جانی تھا اُدھر گیا اور اس کے بھوک اور زخموں سے مسمار ہوتے بدن کو آغوش میں لیا ۔ سوری جانی۔۔۔ ہم سب وہ تو نہیں رہے جو کبھی نارمل انسان کی طرح تھے۔ کچھ اور ہو گئے ہیں۔ رنگ و نسل کے تعصبات زائل نہیں ہوتے اور ہمیں شرمندہ کر دیتے ہیں۔ میں بھی شرمندہ ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ہم سب میں سے تم نے بہت کچھ گنوایا ہے۔

اپنے عقیدے، اپنے ماں باپ اور وطن کو ترک کیا ہے۔۔۔۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ سوری جانی!"(۵۵)

اس ناول میں افغانستان امریکہ جنگ اور دہشت گردی کے پورے خطے پر رونما ہونے والے اثرات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس ناول کے کرداروں کے ذریعے مستنصر حسین تارڑ نے مزاحمتی رخ بھی دکھایا کہ جب ضیاء دور میں جن مجاہدین کو امریکہ روس جنگ میں ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا ان کو باقاعدہ اس کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ وہی ہیرو نائن الیون کے بعد دہشت گرد کہلائے گئے ۔ قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود قیدیوں کی دردناک کہانی میں ان کا طالبان کا ساتھ دینے اور بعد میں اپنا دفاع کرنے کی تصویر کشی اس طرح ملتی ہے۔

"ہم وہی مجاہدین اور ہیرو تھے جو ۱۱ ستمبر کے بعد دہشت گرد اور بدترین مجرم بن گئے۔۔۔ پہلے یہ جہاد تھا، کیوں کہ روس مقابل میں تھا اور اب یہ قابل گردن زدلی ہے، کیوں کہ ہم اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ شمال والے ہمیں کبھی نہیں بخشیں گے کیوں کہ ہم نے طالبان کا ساتھ دیا ہے۔ شاید یہی ہماری غلطی تھی ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا لیکن ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔۔۔ بادشاہت میں ہم قدم رکھ نہیں سکتے تھے کہ اس قدم کو۔۔۔ پہلے قدم کو کاٹ دیا جاتا تھا اور ہمارا بقیہ دھڑ بعد میں گرتا۔۔۔ ہم کدھر جاتے ۔۔۔۔ طالبان کو سپورٹ کرنا ہماری مجبوری تھی۔"(۵۶)

قلعۂ جنگی میں موجود طالبان نے اپنی زندگی کو حالات کے سہارے چھوڑ کر نہایت اطمینان کا اظہار کیا ہے ۔ وہ موت کے قریب تر ہونے کے باوجود بھی مطمئن نظر آرہے ہیں۔ شکستہ ترین حالات میں بھی ان کے دل مسرور تھے۔ مگر اس سارے پس منظر کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو ناول نگار کے نزدیک یہ ایک مزاحمتی انداز ہے کہ وہ موت کو قریب دیکھتے ہوئے اور بھوک پیاس میں نڈھال ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو مطمئن کہہ رہے ہیں جن کو جہاد کے نام پر دنیا بھر سے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے پھنسایا گیا اور مطلب پورا ہونے پر ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا گیا۔ اس کے نتیجے القاعدہ نے افغانستان پر قبضہ کر کے اپنی شریعت کا نفاذ کر دیا۔ نائن الیون کا واقعہ جب رونما ہوا تو امریکہ نے طالبان اور القاعدہ پر سارے الزامات عائد کر دیے اور افغانستان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ مزار پر حملہ کے بعد کی عکاسی ناول نگار اس طرح کرتے ہیں:

> "مزار شریف میں ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ انہیں ہانکتے ہوئے قلعہ جنگی میں لے جاتے تھے اور پھر ان کی مشکیں کسی جانے لگیں، پشت پیچھے ہاتھ باندھے جانے لگے تو نروس ہو گئے۔ وہاں دو غیر ملکی ٹیمیں بھی موجود تھیں۔ جن کے کیمرے ان پر تھے۔ وہ ہراساں ہو گئے کہ ان انہوں کو اجتماعی طور پر قتل کیا جانے لگا ہے کہ روایت یہی تھی اور جن کے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے نہیں تھے انہوں نے بغاوت کر دی۔ شمالیوں کو اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو ان کو فتنہ پروری سے روکنے کے لیے باندھ رہے تھے۔ ان کے قتل کا فیصلہ ابھی نہیں تھا ہوا۔ لیکن وہ حواس کھو بیٹھے اور جن کی تلاشی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے ہتھیار نکال کر فائر کرنے لگے۔ دوستم کا پولیس چیف ان کا نشانہ بن گیا۔ ایک امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کے پرخچے اڑ گئے اور پھر ان پر بھی بی ۵۲ کا عتاب نازل ہو گیا۔ قلعے کی دیواروں میں نصب مشین گنوں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کا سب اُگل دیا۔ ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر آسمان سے نازل ہونے لگے اور کچے صحن میں مٹی کے آتش فشاں ابل کر انہیں زندہ دفن کرتے گئے۔ یہ قیامت تو نہیں تھی پر قیامت سے کم نہ تھی بل کہ زیادہ تھی۔ وہ رزق خاک تھے سو خاک ہوئے۔ یہ کھیل تماشا صرف چند لمحوں کا تھا اور پھر ختم ہو گیا۔"(۵۷)

"خس و خاشاک زمانے" ۲۰۱۰ء میں شایع ہوا۔ اس ناول کے ایک باب میں دہشت گردی کے موضوع پر بحث کی گئی ہے جس میں تہذیبوں کے تصادم اور افراتفری کے دور میں گھرے افراد اس بات پر پریشان حال ہیں کہ سارا ماحول دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے اور ان سارے حالات میں کسی بھی سپر پاور کا

کردار کلیدی بن جاتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر فوزیہ چوہدری کا مضمون ۹/۱۱ کے اردو ناول پر اثرات" قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے اردو ناول میں دہشت گردی جیسے موضوع کو خوش آئند قرار دیا ہے۔

" دوسری اصناف ادب کے عکس اردو ناول کے حوالے سے یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ دہشت گردی اور دہشت گرد عناصر کو مکمل طور پر ایک ناول کا حصہ بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہو تو عصری ادب میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ دہشت گردی اور ۹/۱۱ کا واقعہ جس نے دنیا کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی حالات کا رخ بدل کر رکھ دیا ہو، کس طرح ممکن تھا کہ عصری ادب اس کا عکاس نہ ہوتا۔"(۵۸)

اس کے علاوہ محمد الیاس کا ناول "برف" منظر عام پر آیا جس میں مذہبی دہشت گردی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یونس جاوید نے ناول "سونت سنگھ کا لان" تحریر کیا جس میں نائن الیون کے سانحے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں ۹/۱۱ کے بعد پاکستان میں پیش آنے والی غیر یقینی صورت حال بیان کی گئی ہے۔ گویا یہ ناول پاکستان کے عصری واقعات اور سیاسی تاریخ کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔اسی طرح ایم اختر کا ناول "ایک لوسٹوری اور ایک ایٹمی طاقت" کے پلاٹ میں اسامہ بن لادن کی کہانی بیان کی گئی ہے اور ایبٹ آباد میں اس کے مقام اور خفیہ امریکی آپریشن کا مکمل ذکر کیا گیا ہے ان ناولوں کے علاوہ ایک ناولٹ "میں دہشت گرد ہوں" محسنہ جیلانی نے تحریر کیا۔اس ناولٹ میں ایک پاکستانی خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جو بہتر مستقبل کے لیے ساٹھ کی دہائی میں برطانیہ منتقل ہو جاتا ہے۔ مگر سانحہ نائن الیون سے حالات بگڑ جاتے ہیں تو ناول کی مرکزی کردار زرینہ کو بار بار دہشت گرد کا خطاب دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ ذہنی طور پر بیمار ہو جاتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول "صفر سے ایک تک" سائنس فکشن پر لکھا گیا ہے۔ مگر اس میں عمومی طور پر سانحہ نائن الیون کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور ایک فرانسیسی لڑکی کا ذکر کیا گیا ہے جیسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ان ناولوں کے علاوہ آزاد مہدی کا ۹۵ صفحات پر مشتمل مختصر ناول "اس مسافر خانے میں" بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں بلا واسطہ طور پر موضوعاتی اعتبار سے دہشت گردی جیسے موضوع پر بات کی گئی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار خود مصنف ہے جو اپنے دوستوں کو اپنی کہانی اس طرح بیان کرتا ہے:

" میں نے حیران ہو کر کہا اور اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا: پتہ نہیں مذہب میں تشدد کا جواز کیسے تلاش کیا گیا۔۔۔؟ لیکن میں تجھے بتاتا ہوں خدا پرستوں

کارویہ۔انہوں نے یہاں تک ایک دفعہ خدا کی حمایت کر دی کہ مزار شریف میں لاش پر کوڑے مکمل ہوئے تب مردے کو قبر میں اتارنے کی اجازت ہوئی اور یہ مرنے والے کی خواہش تھی کہ مجھے مزار شریف میں دفن کیا جائے یہ شہر مرنے والے کو پسند تھا۔اس کا تقدس اس کے دل میں بہت تھا مگر بیچارے کو یہ خواہش بہت مہنگی پڑی اور مرنے کے بعد بھی پٹتا رہا۔ بھلا ہو امریکیوں کا کہ وہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔انہوں نے ایک بار پھر حجاموں کو استرے قینچی کی اجازت دے دی۔"(۵۹)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دہشت گردی نے پاکستانی معاشرے کو ہر حوالے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے جہاں جانی ومالی نقصان ہوا ہے وہاں سماجی وانفرادی سکون بھی اس دہشت گردی کے ماحول کی نذر ہوا ہے کوئی ایک ادیب تا تخلیق کار بہت زیادہ حساس اور باریک بین ہوتا ہے اور اردو ادب کے سرمائے میں بھی دہشت گردی جیسے انتہائی حساس المیے کو بے شمار ادیبوں، شاعروں اور تخلیق کاروں نے موضوع بنایا ہے۔ اردو ادب کی تمام بڑی اصناف میں دہشت گردی کے اثرات اور واقعات کا ذکر ملتا ہے جس سے اردو ادب میں مختلف موضوعات کا اضافہ ہوا ہے۔

المختصر دورِ جدید میں اگر دنیا کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے دہشت گردی کے مسئلے پر ہی تمام اقوام کی توجہ مرکوز دکھائی دیتی ہے۔ دہشت گردی دنیا کی تمام قوموں، ملکوں اور علاقوں کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھری ہے۔ طاقتور اور کمزور کی جنگ ازل سے جاری ہے جو آج سے قطع نظر قدرے مختلف معانی و مفاہیم اور طریقوں سے چھوٹے پیمانے پر موجود ضرور تھی۔ دنیا بھر کے لوگوں کو آج دہشت گردی جیسے سنگین مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔انسان نے ٹیکنالوجی میں بے حد ترقی کی ہے۔ مواصلاتی نظام بھی جدت اختیار کر گیا ہے۔ گلوبل ویلج بننے کی وجہ سے دنیا میں ترقی بھی بے پناہ ہوئی ہے۔ آئی ٹی کا زمانہ ہے۔ سوشل میڈیا آج بے حد طاقتور حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی برادری کو دہشت گردی جیسے مسئلے سے نبرد آزما ہونے میں ناکامی ہو رہی ہے جو زیادہ طاقتور ہیں وہ غالب ہیں اور جو قدرے کمزور ہیں، وہ مغلوب۔ مطلب "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا حساب چل رہا ہے۔

دہشت گردی کے حوالے سے اگر آج کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کے حالات میں بھی بہت زیادہ فرق آیا ہے۔ خاص طور پر امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ۹/۱۱ حملے کے بعد سے دہشت گردی کا جن بے قابو ہوتا جا رہا ہے یہ مسئلہ بین الاقوامی صورتحال اختیار کر گیا ہے اور پوری دنیا

کے امن وامان کے لیے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ اگرچہ دہشت گردی کی تاریخ بہت قدیم ہے مگر اس کی کوئی حتمی تعریف آج تک بھی ممکن نہیں ہو سکی۔ دنیا بھر میں اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جار ہی ہے تاکہ انسانی جانوں کے ضیاع اور املاک کی تباہی سے بچا جاسکے۔

حوالہ جات

1.Hornby, A. S., & Cowie, A. P. (1995). *Oxford advanced learner's dictionary* (Vol. 1430). Oxford: Oxford university press.P.984

2 https://www.merriam-webster.com/dictionary/terrorism

۳- مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات، نیاایڈیشن، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۶۵۸

۴- مولوی نورالحسن نیئر، نوراللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء ص:۸۰۵

۵- https://www.newageislam.com/urdu-section/basil-hijazi,-new-age-islam/the-concept-of-terrorism--دہشت-گردی-کا-مفہوم/d/113598

۶ The New Encyclopedia vol 11,Anniversory Edition,collier and son company ,new York, page 65

۷- The world Encyclopedia ,vol,19 scott Fetzer company USA1917,p178

۸- Ghatak,S.2010. Threat perception,The policing of dangers from engenics to war on terrorism Lexington books 2010, p16

۹- طاہر القادری، ڈاکٹر، دہشت گردی، (مضمون)، مطبوعہ، ماہنامہ منہاج القرآن۔ منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ستمبر ۲۰۰۱ء، ص۴۲-۴۳

۱۰- انعام الرحمن سحری، دہشت گردی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص، ۴۰-۴۱

۱۱- ایضاً، ص۱۹

۱۲- خان محمد عاطف، افغانستان۔ روسی دہشت گردی سے امریکی دہشت گردی تک، معصومہ اینڈ کمپنی، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۱۰۲

۱۳- ایضاً، ص۲۰۲

۱۴- ایضاً، ص۱۰۵

۱۵- http:/www.pbs-gov.pk/sites/default/files/pslm

۱۶- مفتی محمد شفیع، وحدت امت، مطبوعہ مکتبہ خدام القران، لاہور، س ن، ص۲۷

۱۷ ۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور دہشت گردی، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ۲۰۱۱ء، ص ۳۰-۳۱

۱۸۔ طاہر القادری، ڈاکٹر، فرقہ پرستی کا خاتمہ کیوں کر ممکن ہے، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۹۴۔۹۵

۱۹۔ جلال زئی موسیٰ خان، ۷۳ فرقے کیسے بنے؟، فکشن ہاوس لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵

۲۰۔ تصدق حسین راجا، ڈاکٹر، اسلام اور دہشت گردی، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، جولائی ۲۰۰۸ء، ۱۲

۲۱۔ ہارون یحییٰ، اسلام اور دہشت گردی، مترجم تصدق حسین راجا، ڈاکٹر، فن پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۵ء ص ۱۷

۲۲۔ ص ۱۶۸

۲۳۔ سورۃ المائدہ ۵:۵۱

۲۴۔ سورۃ الممتحنہ، ۸:۶۰

۲۵۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور دہشت گردی، ص ۳۳

۲۶۔ John Richard Thackrah ,Encyclopededia of Terrorism and political violence T.J press , New York,1987,p 60

۲۷۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور دہشت گردی، ص ۳۳

۲۸۔ ص ۱۱۹

۲۹۔ خان محمد عاطف، افغانستان۔ روسی دہشت گردی سے امریکی دہشت گردی تک، معصومہ اینڈ کمپنی دہلی، ۲۰۱۲، ص ۸۷

۳۰۔ Umbreen javaid ,Dr , Pakistan fight Extremism and Terriorism ,Maktaba jaded Pakistan, Lahore, press, 2013,p 29

۳۱۔ مقبول ارشد، القاعدہ، زاویہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۱

۳۲۔ محمد طاہر، دہشت گردی، www.wajood.com ۲۰ جون، ۲۰۱۵ء، 11:10 AM

۳۳۔ زید حامد، معاشی دہشت گردی، برلاس ٹیکس ٹیم، راولپنڈی، اکتوبر، ۲۰۰۹ء، ص ۶-۷

۳۴۔ زید حامد، معاشی دہشت گردی، ص، ۸

۳۵۔ ص ۱۶۶

۳۶۔ نجم الثاقب ، معاشی دہشت گردی کے عوامل www.express.pk، ۲۵ جولائی، ۲۰۱۶ 11:25 AM،

۳۷۔ یاسر محمد خان، معاشی دہشت گردی، (کالم) مطبوعہ، ہفت روزہ، ضرب مومن، کراچی جون ۲۰۰۲ء، ۲۱۔۲۲

۳۸ ۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۹۔ نجم الثاقب ، معاشی دہشت گردی کے عوامل, www.express.pk ۲۵ جولائی، ۲۰۱۶ء ۱۱ : ۲۵ AM

۴۰۔ زید حامد، معاشی دہشت گردی، ص ۱۰

۴۱۔ محمد بن اختر، عالم اسلام پر یہود و نصاری کے ذرائع ابلاغ کی یلغار، دارالاشاعت، اردو بازار کراچی، س۔ن، ص، ۲۹۶-۲۹۴

۴۲۔ پیر محمد اکرام جان قادری ،ڈاکٹر ،جہاد اور دہشت گردی ، جا معہ مدینہ العلم ،اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۳۷۸

۴۳۔ http://pakpips.com,8 Jun,2022,10:10,AM

۴۴ http:// economictime.indiatime.com,15Jun,2022,11:00 AM

۴۵ http.//en .wilipedia.org,12 Jun,2022,10:00AM

۴۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکیڈمی، اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۔۱۲

۴۷۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، ۹/۱۱ کے اردو غزل پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان وادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، ادارہ ادبیات اردو فارسی ولسانیات جامعہ پشاور، ۲۰۱۱ء، ص ۹

۴۸۔ ایضاً، ص، ۱۴

۴۹۔ اختر عثمان، زمستان کا نوحہ، www.urduweb.org>mehfil>thread ۲۰، فروری، ۲۰۱۳ء، 9:10AM

۵۰۔ وحید احمد، سرگوشیاں، مشمولہ، نظم نامہ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۴۴

۵۱۔ کشور ناہید، سوات کا نوحہ، مشمولہ، دنیازاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۱۷۶

۵۲۔ کشور ناہید، طالبان سے قبلہ رو گفتگو، مشمولہ، دنیازاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۹۸

۵۳۔ فوزیہ، چودھری، ڈاکٹر، ۹/۱۱ کے اردو ناول پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، ادارہ ادبیات اردو فارسی و لسانیات، جامعہ پشاور، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۹۷

۵۴۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۵۔۴۶

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۳۔۴۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۵۷۔ ایضاً، ص ۴۴۔۴۵

۵۸۔ فوزیہ، چودھری، ڈاکٹر، ۹/۱۱ کے اردو ناول پر اثرات، مشمولہ، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، ادارہ ادبیات اردو فارسی و لسانیات، جامعہ پشاور، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۵

۵۹۔ آزاد مہدی، اس مسافر خانے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۷۲

باب دوم

دہشت گردی پر لکھے گئے منتخب افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

ابتداء سے ہی اردو ادب کی دیگر اصناف کی نسبت افسانے میں سماجی، سیاسی، تاریخی اور علمی مسائل اور عوامل کا عکس زیادہ مربوط اور گہرا نظر آتا ہے۔ اردو افسانہ نگار اپنے عہد کی کھری حقیقتوں اور سماجی و سیاسی حالات پر تاریخی شہادتیں رقم کرتے رہے ہیں۔ یوں اردو افسانہ اپنے آغاز کے ساتھ ہی داخلی و خارجی مسائل کا ترجمان بن گیا۔ پریم چند کے افسانے سے قبل اور بعد میں ریاستی و تاریخی اور ملکی تموجات کی لہر کو اس طرح افسانے کے قالب میں سمو دیا گیا کہ انہی افسانوں کو مد نظر رکھ کر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے خاص ادوار کی عصری تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات مثلاً مذہبی عناد، فرقہ واریت، نفرت، تعصب، نسلی جنون، تقسیم بنگال، طبقاتی خلیج، قحط بنگال و کانگرس و مسلم لیگ کی سیاست، دو قومی نظریہ، بدیسی تہذیب، شدھی سنگھٹن اور تنظیم اور تبلیغ کی تحریکیں، تحریک خلافت زمیندار، مہاجن، ساہوکار اور سرکاری اہل کاروں کے باہمی جھگڑے، ظلم و بربریت انگریز حکومت کے رویے، آزادی کی تڑپ اور وطن کی محبت الغرض قیام کو اردو افسانے کا موضوع بنایا گیا کیوں کہ یہ اس زمانے کی ضرورت تھی کہ ان خاص حالات و واقعات کو عوام الناس کے سامنے پیش کیا جائے کیوں کہ ادب کہیں آسمان کی ماروائی وسعتوں میں تو تخلیق نہیں ہوتا۔ اس طرح کے تلخ موضوعات سے اردو کہانی میں داستانوں کی رومان بھری فضا حقائق کی تلخیوں کی طرف لوٹی اور یہ مختصر افسانے کا دور آغاز کہلایا۔ حالات کی نوعیت بدلتی جارہی تھی اور زندگی نئے رنگ ڈھنگ اختیار کررہی تھی۔ قدیم قدروں کی اتھل پتھل اور ایک قائم شدہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ اسی لیے اردو افسانہ حقیقت نگاری کے پیرائے میں ڈھل کر اپنے گرد و پیش کے حالات سے جڑتا چلا گیا۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں تاریخی، سیاسی، و سماجی منظر نامہ یکسر بدل گیا تھا۔ یہ دور خواب غفلت سے جگانے کا دور تھا۔ یہ دور قطعاً تغیر و تبدل کا دور تھا اور ایک مکمل سماجی و سیاسی نظام شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ اور اسی کی راکھ سے ایک نئے نظام کی نمو ہو رہی تھی۔ ذیل میں مختلف ادوار میں لکھے گئے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

الف۔یلدرم سے پریم چند تک

جدید سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی، سائنسی و علمی تبدیلیاں یلغار کر رہی تھیں اور ہندوستان کے پاس ان تبدیلیوں کا گہرا اثر قبول کر رہے تھے۔ادیب اور تخلیق کار بھی اس سے مبرا نہ تھے۔ رومانی تحریک کے علمبر دار سجاد حیدر یلدرم ان بدلتی ہوئی قدیم وجدید اقدار کے مابین سنگم ٹھہرے۔ان کا خوش رنگ اسلوب اس دور کے مسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔ڈاکٹر محمد عالم لکھتے ہیں:

> "سجاد حیدر یلدرم اپنے گرد و پیش کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور اپنے عہد کا گہرا معاشرتی شعور رکھتے تھے۔ ہندوستان میں غیر ملکی تسلط کی وجہ سے سماج جو شکلیں تبدیل کر رہا تھا اس سے پوری طرح آگاہ تھے۔اس لیے انہوں نے اپنی انشاء پردازی کو محفل زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں تک محدود نہیں رکھا بل کہ اس کے پیش نظر ایک مخصوص نظام فکر تھا۔ فرسودہ نظام کی جکڑ بندیوں اور تنگ نظر سماج کی ناروا پابندیوں کے خلاف ایک رد عمل تھا۔ جسے انہوں نے بڑی شدت سے محسوس کر لیا تھا۔"(۱)

یلدرم کا جادو ایک حد تک سر چڑھ کر بولتا رہا۔انہوں نے ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا اور ادیبوں کا ایک گروہ اس دبستان کی پیروی کرنے چلا جن میں مجنوں گورکھ پوری، نیاز فتح پوری، امتیاز علی اور سلطان حیدر جوش کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان کے بعد پریم چند کا دور آتا ہے۔ جن کے ہاں رومانیت اور حقیقت نگاری دونوں ہی ملتے ہیں۔ان کے بیشتر افسانوں کا موضوع ملکی حلات اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہی ملتا ہے۔ان کے افسانوں کے تین ادوار مختص کیے گئے ہیں۔ جن میں افسانہ نگاری کا تیسرا دور نہایت اہم ہے۔ یہ دور فنی پختگی اور سیاسی شعور کی تکمیل کا دور ہے۔ہندوستان میں سیاسی سر گرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور انقلاب روس بھی سامنے آچکا تھا۔ان کی نظر میں سیاسی انقلاب سے اقتصادی انقلاب منسلک تھے۔انہوں نے نو آبادیاتی نظام کے متعلق بھی اپنے افسانوں میں لکھا۔

پریم چند کے افسانوں میں ان کے عہد کی مختلف تحریکوں، جماعتوں اور تنظیموں مثلاً مسلم لیگ، کانگرس، شدھی، سنگٹھن اور اتحاد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ان کا افسانہ "قاتل" دہشت گردی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ جس میں کسی دہشت گردی تنظیم یا جماعت کا مقصد انگریز افسروں اور ان کے ملازمتوں کو قتل کرنا

ہے۔انقلاب لانے کے چکر میں افسانے کا ہیرو ایک انگریز افسر کو قتل کرنے لگتا ہے تو اس کی ماں اس کے سامنے آکر نشانے کی زد میں آجاتی ہے کہ اس قتل سے بے شمار معصوم لوگ زیر عتاب آسکتے ہیں۔اسی موضوع پر ان کا ایک افسانہ "قاتل کی ماں" لکھا گیا ہے۔

> "رامپوری ہتیارا تو ہے اور جو دوسرے کی ہتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ہتیارے ہوتے ہیں۔ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں۔ جو دوسروں کی حفاظت کرے وہی بہادر سورما ہے۔"(۲)

پریم چند ہندو مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود اس بات سے متفق تھے کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا بل کہ اپنے فضائل اور اوصاف حسنہ کی وجہ سے پھیلا،اس مذہب میں تمام انسانوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔اس ضمن میں ان کا افسانہ "ہنس" میں کیا گیا۔انہوں نے اپنے معاشرے میں موجود انتہا پسندی،ذات پات ،نسلی تعصب،معاشی و سیاسی استحصال،شدت پسندی اور غاصبیت کی شدید مخالفت کی۔ وہ زور زبردستی کے با لکل قائل نہ تھے اور ایک متحد قومیت کا تصور رکھتے تھے ان کے افسانوں میں سیاسی جماعتوں کے کھوکھلے پن اور انگریز سامراج کے ساتھ چلنے والے ابن الوقت لوگوں پر گہری تنقید ملتی ہے۔سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "اس طرح پریم چند اپنے دور کے شعور کے ان پہلوؤں کے ترجمان ہیں جو غلامی پر آزادی کو،قدامت پرستی پر اصلاح کو،تنگ نظری پر بلند نگاہی کو،جبر اور ظلم پر انصاف اور مساوات کو،سامراج یا آمریت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے تھے۔اس میں شک نہیں کہ بہت سے مقامات ایسے آئیں گے جہاں پریم چند کے خیالات واضح نہیں ہیں۔ یا جہاں انہوں نے حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی جرات نہیں کی لیکن ان کا فن مجموعی طور پر پڑھنے والے پر یہی اثر ڈالتا ہے کہ وہ ملک کی عوامی زندگی کو ابھارنے اور بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کے ترجمان تھے۔"(۳)

یلدرم سے پریم چند تک اردو افسانے نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ان کے افسانوں میں تمام انسانی مسائل کو موضوع بنایا گیا تھا۔ جن میں دہشت گردی، قتل وغارت، ظلم و جبر کے خلاف بھی لکھا گیا جن سے اردو افسانہ رومانیت سے حقیقت کی جانب گامزن ہوا۔

۱۹۰۵ میں تقسیم بنگال کی وجہ سے ہندوستان کے حالات بہت بگڑ گئے اور ریاستی دہشت گردی کے بے شمار واقعات رونما ہونے لگے۔ ہندو مسلم تنازعات کو ہوا ملی اور مختلف تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ء میں نہتے عوام پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ اس کے علاوہ انقلاب روس نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان سب حالات کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا اور بہت سے ادیبوں نے ان تاریخی و سیاسی حالات کو اگر موضوع نہیں بھی بنایا تو بھی کسی مکالمے میں، کسی منظر کشی میں، افسانے کی فضا میں، کرداروں کے طرز عمل یا بیانیہ میں اپنے عہد کے ان حالات و واقعات اور عصری آگاہی کا عکس ضرور پیش کرتے رہے۔ چاہے وہ جنگ عظیم کے اثرات ہوں، غلامی کا المیہ ہو، جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو، مذہبی مناقشت ہو، فرقہ واریت ہو یا پھر آزادی کی تحریکیں ہوں۔ تیس بتیس برس کا یہ پورا عہد اپنے تاریخی پس منظر کے ہمراہ اردو افسانے میں پوری طرح جلوہ افروز ہے۔ اردو افسانے میں عصری آوازیں سموتی جا رہی تھیں۔ جنگ آزادی سے لے کر تقسیم بنگال، تحریک ترک حوالات، دہشت گردی، انقلاب غرضیکہ تمام سرگرمیوں کی گونج اردو افسانے میں سنائی دے رہی تھی۔

ب۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے اردو افسانے پر اثرات

اردو افسانے کا یہ عہد ۱۹۰۰ء سے شروع ہوا اور اگلے پچیس تیس برسوں میں کئی معتبر اور ممتاز ناموں سے مزین ہو گیا۔ یہ ادباء سیاسی و تاریخی شعور سے آشنا تھے اور مغربی نظریات اور فلسفوں سے بھی کسی حد تک آگاہ تھے۔ اس دور میں جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور مزاحمت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سرمایہ داروں کے باہمی جھگڑے دنیا کو دوسری جنگ عظیم کی جانب دھکیل رہے تھے۔ ہر طرف عجیب سا خوف، بے چینی اور بے سکونی کی سی فضا تھی جلاوطنی، سزائے موت اور باہمی تصادم نے ادیبوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا اظہار "انگارے" کی صورت میں سامنے آیا۔ احمد علی، رشید جہاں، سجاد ظہیر اور محمود النظیر کے لکھے ہوئے ان افسانوں میں پرانی اقدار سے نفرت، مذہبی، انتہا پسندی اور فرقہ واریت سے انحراف، معاشی عدم مساوات اور خون خرابے کے خلاف مزاحمت کی گئی۔ تقسیم کے بعد ترقی پسند تحریک کی موضوعاتی وسعت اور اس کے ساتھ ساتھ حلقہ ارباب ذوق کی فنی جمالیات پاکستانی افسانے کو ورثے میں ملی۔ اس افسانے میں خارج کے تمام پہلو اور داخلی دنیا کے تمام معاملات موجود تھے۔ ترقی پسند افسانے میں طبقاتی استحصال، جبر اور ایک عام آدمی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ مگر فسادات کے شروع ہوتے ہی تمام حالات و واقعات بدل گئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانے میں فسادات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔ خدیجہ مستور اردو کی نامور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا عصری شعور بے حد پختہ ہے۔ ان کے ہاں عصری شعور کی ایک مثال فسادات اور آزادی کے موضوعات پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان کے اہم افسانے "لاشیں" اور "مینوں لے چل بابلا لے چل" قابل ذکر ہیں۔ مینوں لے چل بابلا لے چل" میں ان کی فنی مہارت عروج پر ہے۔ اس افسانے میں وحشت و بربریت اور آبروریزی کی تلخ حقیقتوں سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ "ثریا" بھارتی فوج کے مظالم کی کہانی ہے جو کہ سرحدی علاقے کے لوگوں پر نہایت سفاکی سے ڈھائے گئے۔ یہ افسانہ بھارتی فوج کے مظالم کی داستان کو ایک تاریخی رنگ دیتا ہے۔ خدیجہ مستور نے اس متاثرہ خاندان کی ہمت، صبر اور خودداری کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو کم زور دکھانا پسند نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کے کردار خودداری اور بلند حوصلگی کے پیکر ہوتے ہیں۔

اس عہد کے افسانے میں جذباتیت اور ہنگامی سوچ کا عنصر غالب نظر آیا۔ جس سے افسانے کا فن کافی حد تک متاثر ہوا۔ اس دور کے ہنگامی افسانے بہت مقبول ہو گئے مگر آج ان کی حیثیت محض تاریخی ہے۔ مگر یہ کہنا غلط ہے کہ اس عہد کے افسانے بہتر نہ تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو افسانے اس عہد میں لکھے گئے ان کو فسادات کے مجموعی رویوں کے ساتھ باہم منسلک کیا گیا جو کہ لازوال ہو گئے۔ مثلاً منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا۔ اس کے علاوہ منٹو کا افسانہ "کھول دو" بھی اسی تناظر میں لکھا گیا۔ ان افسانوں میں ہجرت کا احوال ہے۔ جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ فسادات کے بعد لوگوں کو کیا کیا سہنا پڑا۔ منٹو کے علاوہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانہ "نیا فرہاد" میں سکھوں کے مظالم کی کہانی سنائی ہے۔ مسلمانوں کا جس طرح قتل عام کیا جا رہا تھا۔ اس کی درد بھری داستان اس افسانے میں رقم ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ "پرمیشور سنگھ" بھی انسانی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ افسانہ محبت اور نفرت کی اکائی پر کھڑا ہے۔ جب کہ فسادات کو انسانی جسم اور رویوں سے جوڑا گیا ہے۔ اشفاق احمد کا افسانہ "گڈریا" فسادات کے موضوع پر لکھا گیا تقریباً آخری افسانہ ہی تھا۔ اس کے بعد دیگر موضوعات مثلاً ہجرت کا کرب، ماضی پرستی اور نوزائیدہ مملکت کے مسائل جن میں دہشت گردی، لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال پر مبنی افسانوں نے جگہ بنائی۔

ج۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ کی دہائی کا اردو افسانہ

۱۹۶۰ء کے عشرے میں پاکستانی افسانہ نئے حالات و واقعات اور مزاج سے روشناس ہوا۔ اگر فنی لحاظ سے دیکھا جائے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کا دور سادہ بیانیہ اور خارجی حقیقت نگاری کا عہد ہے۔ منٹو اردو افسانے

کی ایک بڑی روایت کا نمائندہ تھا۔اس کی موت سے افسانے کا ایک عہد بھی اختتام پذیر ہوا۔ ساٹھ کی دہائی میں افسانے کے فن اور موضوعات میں تغیر و تبدل جاری رہا۔ نئی لسانی تشکیلات اور جدید فنی مسائل نے پاکستانی افسانہ نگاروں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرائی۔ یہ دور پاکستانی تاریخ میں سیاسی و سماجی دونوں سطحوں پر الجھنوں کا دور تھا۔ پہلے مارشل لاء کے دو سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ سیاسی دباؤ کی وجہ سے علامتی انداز بیان سامنے آچکا تھا۔ یہ زمانہ تذبذب اور تشکیک کا دور تھا۔اس افسانے میں فرد کی کہانی بیان کی جارہی تھی۔اس عشرے میں حقیقت نگاری اور بیانیہ کے تصورات بدل گئے۔ان افسانوں میں شناخت کا بحران سامنے آیا جو کہ اردو افسانے کا موضوع ٹھہرا۔ ساٹھ کی دہائی کے عہد کو گنجلک دور بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں معاملہ سامنے کی چیزوں تک محدود نہ رہا۔ بل کہ تجسیم سے تجرید کی جانب گامزن باطن کی دھندلی دنیا تک پہنچ گیا۔ آزادی اظہار پر پابندیوں نے علامت و تجریدیت کو ہوا دی۔ بیانیہ حقیقت نگاری اور خارجیت کی جگہ علامتی تہہ داری اور شناختی بحران کی اہمیت مزید واضح ہوتی گئی۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔

> "پاکستان کی تاریخ میں جمہوری اداروں کے زوال کے اسباب اس وقت موضوع نہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ہر طرف کی جبریت اور دیگر غیر جمہوری رویوں اور عدم مساوات نے فرد اور اجتماع کی جو نفسیات مرتب کی ہے۔اس میں سمت کے گم ہو جانے کا احساس بہت نمایاں ہے۔ ہماری کہانی نے اس نفسیات کی تصویر کشی مختلف حوالوں اور زاویوں سے کی ہے۔ان میں سماجی تصویریں بھی ہیں اور سیاسی مناظر بھی۔ قیام پاکستان کے بعد آنے والی نسلوں کی بے اطمینانی اور شکست و ریخت ہماری کہانی میں مختلف صورتوں میں اجاگر ہوتی ہے۔ یہ اظہار کبھی بیانیہ، کبھی علامتی اور کبھی استعاراتی رہا ہے۔ فکری انتشار کی یہ کیفیت معاشرے کو تو جس سمت لے گئی سو لے گئی لیکن افسانے کو اس نے متنوع موضوعات اور اسالیب سے آشنا کر دیا۔ یوں ساٹھ اور ستر کے بعد پاکستانی افسانہ نگاروں نے تیکنیک اور اسلوب کی طرف بہت توجہ دی اس طرح افسانے نے پرانی روایت سے الگ ہو کر اپنی پہچان بنانے کی کوشش کی جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں ابھی تک جاری ہے۔"(۴)

خالدہ حسین نے ساٹھ کی دہائی میں "سواری" "پہچان" "آخری سمت" "ہزار پایہ" اور "شہر پناہ" جیسے افسانے لکھ کر ناقدین کو چونکا دیا۔ان کا مجموعہ "پہچان" اسی کی دہائی میں شائع ہوا۔ مگر ان افسانوں میں وحشت

اور دہشت کی فضا آمریت کے ہر دور سے منسلک ہو جاتی ہے۔ان کی کہانیوں میں وجودی فلسفے کی ازلی شہنائی، بے معنویت اور لایعنیت کی فضا قائم ہے۔افسانہ "سواری" شہر میں ظلم و جبر کی عکاسی کرتا ہے۔ جس میں پورے شہر میں تعفن زدہ خوشبو کا ذکر ہے۔ جس نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے:

> بولو۔۔۔بولو۔۔۔۔۔میں نے ان کی منت کی مگر وہ بھاگتے رہے۔۔۔ بالآخر میں نے معمر شخص کی چادر پکڑ لی۔اس نے پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔۔۔۔اہل شہر اس دکھ، دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کاٹتی لہریں مر گئیں۔ بھولی بسری کہانی کی طرح۔۔۔۔۔مگر میں اب بھی انہیں اپنے جسم میں اترتا جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر بولتا ہے۔اب تمہاری باری ہے۔۔۔اب تم دیکھو گے۔"(۵)

مارشل لاء کے ابتدائی دور میں خوف اور حیرت کا عنصر اتنا زیادہ تھا کہ زبانیں گنگ سی ہو گئیں۔ پکڑ دھکڑ اور مارشل لاء کے اندھے قوانین نے ہر عام و خاص کو ڈرا دھمکا دیا تھا۔ علامت کے اخفاء میں ہی احتجاجی رویے گھٹے گھٹے موجود رہے۔

اعجاز راہی نے مارشل لاء کے عہد میں جبر، ناانصافی اور ظلم و بربریت کو علامتی انداز میں پیش کیا۔اس ضمن میں ان کے افسانوی مجموعہ "تیری ہجرت" کا ایک افسانہ "تیسرا سنگ میل" قابل ذکر ہے جس میں ایک کردار "میں" ہے جو کہ معاشرتی، جبر اور ظلم و ستم کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔اس افسانے میں ظلم کے خلاف ایک نسلی تسلسل ہے۔اعجاز راہی کا ایک اور افسانہ "تیسری ہجرت" ہے جو علامتی افسانے میں کافی اہمیت اور مقام رکھتا ہے۔اس کا کینوس نہایت وسیع ہے۔اس افسانے میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ انسان آخر ہجرت کیوں کرتا ہے۔اس کی وجوہات آخر کیا ہیں کیا اقتصادی جبر یا ظلم و ستم ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے وہ بار بار ہجرت کرنے پر مجبور ہوتا ہے؟ اس کے علاوہ ساجد ہدایت، فیصل سعید ضرغام، عطاالرحمٰن خاکی نے بھی علامتی و تجریدی انداز میں افسانے لکھے۔ جن میں زیادہ تر جبر، خوف، ظلم اور مذہبی انتہاپسندی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

الغرض ۶۰ء کی دہائی میں علامت نگاری کا غلبہ دکھائی دیا جو کہ آج بھی کسی حد تک جاری ہے۔اس عہد کے افسانے کے اسلوب میں بیانیہ کے بجائے علامت نگاری کو رواج دیا گیا جب کہ پلاٹ کے منطقی تسلسل کو توڑ کر تیکنیکوں کا استعمال کیا گیا جن میں سے شعور کی رو قابل ذکر ہے۔اس دور کے افسانے کے کردار بھی روایتی

اسلوب کی طرح مستقل نہ تھے اور فکر و موضوع کے لحاظ سے اس دنیا کے بجائے پرچھائیوں اور سائے کی دنیا دکھائی دیتی ہے۔ جو کہ نہایت غیر واضح اور مبہم ہے۔ فکری لحاظ سے اس افسانے میں خوف، انتشار، اور تنہائی کی کیفیات زیادہ غالب ہیں۔ خاص طور پر اس افسانے میں عدم شناخت کا مسئلہ دکھائی دیا ہے۔ انسان کی مشینی زندگی کے بعد تہذیبی و اخلاقی زوال کے باعث ایک انتشار اور تنہائی کی فضا قائم ہے اور اس افسانے کے انسان کو ایک عجیب سے خوف میں دکھایا گیا ہے۔ اس عہد کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے علامت نگاری کے ذریعے اس عہد کی معاشی، معاشرتی، اخلاقی ابتری کو اُجاگر کیا۔ انسان کی کھوئی ہوئی اقدار، تشدد، بربریت، مفلسی، ظلم و ستم اور غربت کو موضوع سخن بنایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سجاد کے دو افسانے "پتھر، لہو، کتا" اور "گائے" شہرت کے حامل ہیں

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد عوام کے اندر ضبط کے ٹھہرے موسموں میں تبدیلی کی فضا قائم ہوئی اور سیاسی پلیٹ فارم پر ذوالفقار علی بھٹو جیسا انقلابی لیڈر منظر عام پر آیا۔ اس سوشلسٹ رہنما نے عوام کی قفل زدہ زبانوں کو کھول دیا جس سے لوگوں میں جرات پیدا ہوئی۔ اس دور کی کہانی میں نکھار آیا۔ ساٹھ کی دہائی میں لکھے جانے والا عہد جدیدیت کا آغاز تھا۔ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہے۔ قیام پاکستان کے چوبیس برس بعد لسانی اور قومی اختلافات کی بناء پر اس ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ بنگالیوں کے ساتھ روا رکھے گئے ترجیحی سلوک، دونوں حصوں کا زمینی فاصلہ، ماشل لاء کا جبر و تسلط، انڈیا کی سازشیں، شیخ مجیب الرحمن کے بھارت سے خفیہ تعلقات اور ملاقاتیں، تشخص کا اختلاف الغرض مختلف محرکات کی بنا پر سقوط ڈھاکہ وجود میں آیا۔ اس المیے کا اثر اردو ادب پر بھی خاص طور پر دیکھنے میں آیا، اردو افسانے میں بھی اس المیے کو موضوع بنایا گیا۔ جن افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر افسانے تخلیق کیے ان میں انتظار حسین، مسعود مفتی، طارق محمود، ڈاکٹر رشید امجد، مسعود اشعر اور مشرف احمد قابل ذکر ہیں۔ مسعود مفتی ۱۹۷۱ء کے انقلابی اور خونی سال میں مشرقی پاکستان میں اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لیے موجود تھے۔ اس لیے انہوں نے اس پورے انقلاب کا خود مشاہدہ کیا۔ وہ سول سروسز سے وابستہ تھے۔ اس لیے اس انقلاب کے پس پردہ محرکات، سازشوں اور ذاتی مفادات کے گھناؤنے عمل سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس دور کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات کو ان کے روزنامچے "لمحے" میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ حالات انہوں نے بھارت میں قید کے دوران قلم بند کیے۔ انہوں نے انسانوں کے بدلتے رویوں اور دوچہرگی کو مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے عمل کے دوران دیکھا اور

پھر ہمارے قومی کردار واطوار کے دوغلے پن پر اشتہار بنا کر ٹکا دیا۔ان کے افسانوں کا مجموعہ "ریزے" دراصل ہمارے قومی تشخص، کردار اور قومی و نظریاتی بنیادوں کو ریزوں میں تحلیل ہوتے دکھاتا ہے۔

"یہ بڑی ہی خاموش موت تھی اس میں نہ تو پچھاڑ کھانے والی ماں تھی، نہ نوحہ کرنے والی بیوی تھی، نہ باپ کو پکارنے والے بچے تھے، فقط سہتے ہوئے مریض تھے جو چشم تصور سے اس کمبل کے نیچے اپنے آپ کو پڑا ہوا دیکھ رہے تھے۔"(۶)

اس افسانے میں امید و ناامیدی کی کشمکش کا اظہار ہے۔جو کہ جنگی قیدیوں کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے۔دہشت زدہ ماحول میں سانس لیتے انسانوں پر ناامیدی کا طاری ہونا اور غالب آجانا حالات کی سنگینی کی عکاسی کرتا ہے۔سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔مثلا نورالہدی شاہ کا افسانہ "پکار" آصف فرخی کا افسانہ شہر بدری" اور سلمٰی اعوان کا افسانہ "سویتا دیدی" ہیں۔اس تاریخی حادثے کو پاکستانی افسانہ نگاروں نے تجزیاتی اور تاثراتی دونوں حوالوں سے خوب لکھا ہے۔

پاکستان میں بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اردو افسانے میں موضوعاتی سطح پر جدت اور نکھار آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں تمثیل نگاری، استعارہ، علامت، رمز اور پیکر تراشی سے بھی کام لیا۔انتظار حسین کا سترہ افسانوں کا مجموعہ "شہر افسوس" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا جس میں سیاسی جبر کا عنصر زیادہ واضح ہے۔اس مجموعے کے افسانے ستر کی دہائی میں جاری دہشت کی فضا کی عکاسی کرتے ہیں۔ ستر کی دہائی میں خارجی منظر تبدیل ہو گیا۔دنیائے افسانہ کے افق پر علامت و تجریدیت کا دور دورہ تھا۔جس کے پردے میں جو کہا جارہا تھا اس کے مطالب پر یکٹر مشکل تھی اس ذو معنویت کی اوٹ میں دل کی بات کہنے والوں میں ساٹھ کے آخر میں خالدہ حسین، منشایاد، حسن منظر، رشید امجد، سمیع آہوجا، اور احمد جاوید جیسے افسانہ نگار شامل ہو گئے۔ان افسانہ نگاروں نے بدلتے ہوئے ماحول پر معاصر مسائل کو ہیئت اور اسلوب میں سمونے کا فن اختیار کر لیا۔ریاستی جبر کی وجہ سے بات کہنے کا یہ اخفائی ڈھنگ کافی عرصہ رائج رہا۔

۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد مذاحمتی ادب لکھا جانے لگا۔ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور آمریت میں سرکوبی کی گئی اور تمام سیاسی سرگرمیوں معطل کر دی گئیں۔جسمانی تشدد، دقیانوسیت، زبان بندی، قید و بند، مار پیٹ، جبر اور خوف و دہشت کا دور دورہ تھا۔تمام ادیبوں اور شاعروں نے اس سیاسی جبر اور گھٹن کے خلاف قلم اٹھایا اور اس ظلم و بربریت کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی۔یہ دور پاکستانی ادب کا ایک اہم سنگ میل تھا۔ اس ضمن میں رشید امجد کا افسانہ "سہ پہر کی خزاں" اور "سناٹا" بولتا ہے قابل ذکر ہیں۔منشایاد کا افسانوی مجموعہ "

بند مٹھی میں جگنو" میں مارشل لاءاور مشرقی کے سانحے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وجودیت کے مسائل، ماحول کا جبر، ظلم اور تشدد، شخصیت کی شکست وریخت خارج اور داخل کا تصادم اس علامتی واسلوبیاتی نظام کے بنیادی عناصر ہیں۔ اوراس کا سراغ اس دور کے جبر اور آمریت کے نظام میں لگایا جاتا ہے۔ مارشل لاء کے نتائج کے طور پر کلاشنکوف کلچر، ہیروئن، جہادی تنظیموں اور دہشت گردی کے تصورات متعارف ہوئے۔

د۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی اور مابعد اردو افسانے میں دہشت گردی

اردو افسانہ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک آتے آتے فکری و فنی ہر دو سطح پر جدت طرازی اور حقیقت نگاری پر گامزن نظر آتا ہے۔ چھٹی اور ساتویں دہائی میں ترقی پسند پژمردہ ہو چکے تھے کہ ان کے پاس کہنے کے لیے سوائے پرانی باتوں کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ مبینہ بڑے فن کاروں کو اپنی ڈھال بنا کر جدیدیت کا رُخ موڑنا چاہتے تھے مگر سامراجیت جس طرح رخصت ہو گئی، ادب میں آمریت کی کمر بھی ٹوٹ کر رہ گئی۔

نئے افسانہ نگار جو کہ اپنی باری کے منتظر تھے، وہ اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس عہد کے افسانے میں فکری عناصر سے اس کا دائرہ بڑھنے لگا۔ دوسری جانب اخلاقی اور سماجی پیش کش میں جو خطابت آجاتی تھی، اسے الگ کر کے جدید افسانہ نسبتاً زیادہ پُراثر ثابت ہوا۔ ابتداء میں اس افسانے کا قاری سے رشتہ قدرے کم زور ضرور تھا مگر آہستہ آہستہ جدید افسانہ اپنے اندر کہانی پن اور سماجی حِس بیدار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ترقی پسندوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کی رہی سہی ساکھ بھی رخصت ہو گئی اور جدید افسانہ بنا کسی دباؤ کے آٹھویں دہائی میں داخل ہوا اور گویا اس دہائی پر قابض ہو گیا۔ اس دہائی میں اپنے پاؤں پر پوری قوت سے کھڑا ہو چکا تھا اور اس کا قاری سے رشتہ بھی جڑ چکا تھا اور بڑے حوصلے سے آنے والی دہائی میں اپنے آپ کو زیادہ پراثر زیادہ بامعنی، زیادہ وسیع اور زیادہ مواد کی توانائی کا حامل ہو کر اردو ادب کا ایک پُرکشش حصہ بن چکا تھا۔

اردو میں عام طور پر نئی پیڑھی کے لکھنے والوں کی رائے یہی ہے کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں تبدیلی کے آثار نمایاں دکھائی دینے لگے تھے۔ اس عہد میں بلاضرورت معنویت اور علامتیت کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ داخلیت اور شکست ذات رد ہوئی۔ سماجی سروکار پر زور دیا جانے لگا۔ سیاسی موضوعات ممنوع (Taboo) نہ رہے۔ بیانیہ کی بحالی کو محسوس کیا گیا۔ کہانی پن کی جانب توجہ دی گئی۔ حکایتی داستانی اسلوب اور اساطیر کا عرفان بڑھا اور اردو ادب اور قاری کا باہم رشتہ گہرا ہوتا گیا، جس کو علی الاعلان جدیدیت نے گنوا دیا تھا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مارشل لاء کے نفاذ سے اردو افسانے میں حبس، تاریکی، خوف، ہزیمت اور ہیجان کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں اظہار خیال پر پابندی نے معاشرتی سطح پر ایک گھٹن زدہ سماج کو جنم دیا۔ افسانہ نگاروں نے علامات اور استعاروں کو اظہار

خیال کا ذریعہ بنایا اور اس سیاسی جبر کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی اور بدترین تشدد اور دہشت اور خوف کے ماحول کی تصویر کشی کی۔ اس عہد کا افسانہ جاگیر دارانہ نظام کے ظلم و بربریت اور جبریت کو بیان کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"اسّی کی دہائی مزاحمتی ادب کی دہائی ہے۔ مزاحمت تو عام معنوں میں ہمیشہ ادب کا حصہ رہی ہے کہ ادیب ہر دور میں ظلم کے خلاف مزاحمت کرتا ہے لیکن اسی کی دہائی کی مزاحمت سیاسی جبر کے خلاف ایک عوامی ردِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ زمانہ پاکستانی معاشرے میں فکری انحطاط کا زمانہ ہے۔ اس دور میں جتنی کہانی لکھی گئی اس کا موضوع کسی نہ کسی حوالے سے سیاسی جبر و تشدد کا ہی اظہار ہے۔"(۷)

اس زمانے میں بے شمار افسانہ نگاروں نے فن افسانہ نگاری میں اپنا ایک نام بنایا۔ انسانی جبر، ظلم و بربریت، سفاکی و خوں ریزی اور دہشت گردی کے تناظر میں بھی کافی افسانے منظر عام پر آئے۔

رضوان احمد کا مشہور افسانہ "تلاشِ ہما" تین کرداروں پر مبنی ہے۔ چڑی مار ایک معمولی قسم کا ظالم ہے جو صرف چڑیوں کو قید کرتا ہے لیکن حاکم وقت اس سے کئی گنا زیادہ ظالم و جابر ہے، کیونکہ وہ اپنی رعایا پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ رعایا اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے، وہ چاہتا ہے کہ اسے کہیں سے ہما مل جائے تاکہ وہ اس کے سائے تلے اپنی بادشاہت ہمیشہ قائم رکھ سکے۔ اس افسانے میں حکومت کا طاقت اور اقتدار کے نشے میں عام عوام کا استحصال موضوع بنایا گیا ہے۔ اقتدار کی دوڑ میں لاکھوں بے گناہ لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانا اور ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کرنا تمام حکمرانوں کا شیوہ رہا ہے۔ اس افسانے میں انہی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

انیس رفیع کے افسانوں میں بھی اسی نوعیت کے ظلم و ستم اور استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ، "کرفیو سخت ہے" اسی ضمن میں لکھا گیا ہے جس کا ایک افسانہ "غروب سے پہلے" میں سرحد کے قریب ایک فوجی کیمپ کی کہانی ہے جس میں ایک فوجی افسر کی کتاب کھو جاتی ہے۔ ایک عورت کو شک کی آڑ میں گرفتار کیا جاتا ہے جو کہ حاملہ ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ حاملہ عورت اپنے گاؤں لوٹنے کی بار بار التجا کرتی ہے کہ اس کا درد بڑھتا جا رہا ہے مگر وہ فوجی افسر اسے روک کر رکھتا ہے یہاں تک کہ اس کا بچہ ضائع ہو جاتا ہے اور اب وہاں صرف خون کے دھبے موجود رہ جاتے ہیں۔ پھر فوجی افسر اپنے سنتری کو حکم دیتا ہے کہ جس کے ہاتھ

میں وہ کتاب نظر آجائے، اس کو گولی مار دو اور سنتری ایک پانچ سال کے بچے کو گولی مار دیتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔"(۸)

اس افسانے میں فوجی آمریت کو سوال رد کیا گیا ہے کہ کس طرح فوجی آمروں کے ہاتھوں بے قصور لوگ لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ وہ لوگ طاقت کے زعم میں انسانیت سوز مظالم کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو کہ قابل مذمت ہے۔ انیس رفیع کا ایک اور افسانہ "ماجرا" بھی قتل و غارت گری کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کہانی میں ایک چشم دید گواہ کا کردار پیش کیا گیا ہے جو کہ اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ قاتل کو پہچانتا بھی ہے اور لوگوں کو اس قتل کی ساری داستان سناتا ہے۔ لوگ اس کو منع بھی کرتے ہیں کہ تم نے کچھ نہیں دیکھا اور تم کسی کو نہیں پہنچانتے مگر وہ اپنی بات پر مصر ہوتا ہے۔

"رمضان کا مہینہ چل رہا تھا اور عید آنے والی تھی۔ پولیس اسے سرکاری گواہ بنا کر حوالات میں رکھتی ہے۔ کئی لوگوں کی شناخت کرواتی ہے مگر قاتل ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ پولیس اسے اس لیے چھوڑنے کو تیار نہیں تھی کہ باہر مجرم اس کی گھات میں بیٹھا ہو اور اس چشم دید گواہ کا قتل نہ کر دے۔ لہٰذا وہ عید پر اپنے گھر نہیں جا پاتا اور نہ ہی اپنی بیوی بچوں میں خوشیاں بانٹ پاتا ہے۔ ٹھیک ایک سال بعد پھر اسی مقام پر ایک ٹرک تین لوگوں کو کچل دیتا ہے۔ سڑک خراب بھی ہو جاتی ہے۔ اس کا ڈرائیور اس سے دھکا بھی لگواتا ہے۔ لوگ پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم تو رات بھر جاگتے ہو، تم نے اس ٹرک کا نمبر ضرور پڑھا ہو گا جس نے تین لوگوں کو کچل دیا ہے لیکن وہ کہتا ہے۔ نہیں، میں نے نہیں دیکھا ہے۔"(۹)

ان دو افسانوں میں افسانہ نگار نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے اور زمانے کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح کی کہ انسان کس طرح حالات کے تحت بدل جاتے ہیں۔ جیسے کہ فوجی افسر کتاب کی تلاش میں معصوم جانیں لے لیتا ہے۔ انیس رفیع کا ایک اور افسانہ "کرفیو سخت ہے" بھی دہشت و وحشت زدہ معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں شہر میں کرفیو کا نفاذ دکھایا گیا ہے جس میں ایک کردار قاسم اور اس کا محرر داہر کے گھر پھنسے ہوئے ہیں شہر کے بے شمار گھر ملبے میں بدل چکے ہیں۔ قاسم بتاتا ہے کہ جب وہ شہر میں تھا تو اذان کی آواز آ رہی تھی اور اسی لمحے لوگ ٹوپی پہن کر نکل رہے تھے اور کہیں جا رہے تھے۔ ہر دو چار مکانوں کے بعد انھیں ملبہ نظر آتا ہے اور ان ملبوں میں سے لہولہان لوگ نظر آتے تھے۔ اس افسانے میں علامتی انداز اپنایا گیا ہے۔ لوگوں کا باجماعت نماز میں کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھانے کا مطلب کرفیو کی حالت میں گرفتاریوں

اور زبردستی حکم منوانے کے ہیں۔اس افسانے میں انسانی جبر واستبداد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا شمار اردو کے اعلیٰ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے مختلف موضوعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے افسانے تخلیق کیے۔ "بیر سٹری" گودھرا اور سانحہ گجرات پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ان کا ایک افسانہ " نیا ہندوستان " انتہا پسندی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہونے والے مظالم، مسئلہ کشمیر، پارلیمنٹ پر بم پھینکنے کے واقعات اور سانحہ گجرات کے جرم میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔انھوں نے ان موضوعات پر اپنے افسانوں میں نہ صرف جرح کی بلکہ ان کو سوال زد کیا۔انھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی بات پیش کی ہے۔انھوں نے آج کے مسلمان کو کٹہرے میں کھڑا ہوا، کئی ہندوؤں سے لڑتا ہوا اور اپنے خلاف اٹھے ہوئے ہر شک کا جواب دینے والا دکھایا ہے۔

خورشید اکرم کے ہاں افسانے میں احتجاجی رنگ ملتے ہیں۔ان کے افسانے میں کئی معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں فسادات اور دہشت گردی کے جیسے موضوعات پیش کیے ہیں۔اس ضمن میں ان کے افسانے " بلینک کال "، "مذبح"، اور "گولی چلنے سے پہلے " قابل ذکر ہیں۔ان کی کہانیوں میں علامتی اور تمثیلی رنگ نمایاں ہیں، مگر ابہام کی پرت نہیں۔اس لیے معانی و مفاہیم کی ترسیل میں مشکل پیش نہیں آتی۔

۱۹۸۰ء کے افسانوں میں "فرقہ واریت" کا موضوع نہایت اہم رہا ہے۔ لوگ جس طرح دھڑے بندیوں میں بٹ کر ایک دوسرے کی تحقیر وتذلیل کے ساتھ ساتھ ان کی جان کے دشمن بن چکے تھے۔ ہر طرف فرقہ پرستی کا زہر بویا جارہا تھا۔ پاکستانی معاشرہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ فرقہ پرستی کا ننگا ناچ ہر روز نیا روپ اختیار کرتا جارہا ہے اور معصوم اور بے گناہ لوگوں کو اپنی جان گنوانا پڑتی ہے۔اس ضمن میں **غضنفر** کا افسانہ " خالد کا ختنہ " نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے فرقہ واریت پر گہری چوٹ لگائی ہے۔ایک چھوٹے سے بچے خالد کو کردار بنا کر قارئین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ فرقہ واریت کا اثر معصوم بچوں کے ذہنوں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ خالد کا اپنے والدین کے ساتھ مکالمہ درج ذیل ہے:

امی میں ختنہ کرانے سے نہیں ڈرتا؟

پھر کس بات کا ڈر ہے تمھیں سے۔۔۔ابو نے چونک کر بڑی

نرمی سے پوچھا۔ "ابو آپ نے ہی تو ایک دن بتایا تھا

کہ ختنہ والوں کو بد معاشوں نے جان سے مارا ہے۔۔۔۔۔ تلاشیوں کا گھناؤنا منظر ابھر گیا۔
جسم ننگے ہونے لگے۔ چاقو سینے میں اترنے لگے۔ خون کا فوارا چھوٹنے لگا، ماحول کا رنگ اڑ گیا۔
نور پر دھند کا غبار چڑھ گیا، خوشبو بکھر گئی، نائی کا استرا بھی کند پڑ گیا، راکھ پر پانی پھر گیا"(۱۰)

اس مختصر سے افسانے میں افسانہ نگار نے دو مکالموں میں ساری باتیں ہی کہہ دی ہیں۔ غضنفر کا ایک اور افسانہ "تصویر تخت سلیمانی" بھی دہشت گردی اور ظلم و ستم کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک پرندہ قفس خوف، دہشت اور بربادی کا بیانیہ ہے۔ افسانہ نگار نے اس پرندے کی چونچ میں ۳۶۵ سوراخ بنا کر یہ دکھانا چاہا ہے کہ ایک سال تک یہ پرندہ شعلہ اگلتا رہے گا۔ دور حاضر میں یہ بات تو عیاں ہو چکی ہے کہ آج ایک قفس نہیں بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں بنا لیے گئے ہیں اور ہر شہر میں ان کو اتار لیا گیا ہے۔ جہاں ظلم و بربریت کا رقص جاری ہے اور ہر سرسبز و شاداب خطہ بنجر بنتا جا رہا ہے۔ معصوم لوگ اسی ظلم کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ سارا کھیل کوئی ایک کمرے میں بیٹھ کر کھیل رہا ہے اور مجبور و معصوم لوگوں کے اندر زہر بھر کر اسے قفس بنا کر ہر خطے میں اتار جا رہا ہے۔ قفس کو اگر دہشت گردی یا خود کش حملہ آوروں سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ نہ جانے یہ طوفان کب تھمے گا۔

۱۹۸۰ء کے افسانہ نگاروں میں **احمد صغیر** کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے دہشت گردی، پولیس زیادتی، ضعیف الاعتقادی، مذہبی دکھاوا، معاشرتی بے بسی، خوف و سیراسیمگی، جنسی استحصال اور دیگر معاشرتی برائیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ان کے ہاں عصری حسیت اور موضوع کا انتخاب انہیں انفرادیت بخشتا ہے۔ ان کا افسانہ "جنگ جاری ہے" ایک اثر انگیز افسانہ ہے۔ اس افسانے میں جزئیات نگاری اور برہنہ سچائیوں مسئلہ کشمیر کی جانب قاری کی توجہ مبذول کراتی ہیں۔ اس افسانے کی ہیروئین جنگ میں اپنے باپ، بھائی اور شوہر کو بھیج چکی ہے جو کہ تینوں ہی جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔ وہ اس بات پر فخر محسوس کرتی ہے بلکہ وہ پیٹ میں موجود بچے کو بھی جنگ پر بھیجنے کے لیے تیار ہے۔ ان تمام حالات میں لگتا ہے کہ جنگ تو ہمیشہ جاری ہی رہے گی۔ احمد صغیر کا دوسرا اہم افسانہ "انا کو آنے دو" بھی دہشت گردی کے تناظر میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اس افسانے میں "انا" کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور انا کے کردار کو زندہ بنا دیا ہے۔ پوری دنیا میں خوف و ہراس، دہشت کا ماحول عام ہوتا جا رہا ہے۔ خون کی ہولی سرِ عام کھیلی جا رہی ہے۔ جانوں کی کوئی قیمت نہیں رہا۔ ہر طرف خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ ایسی صورتِ حال کے پس منظر میں افسانہ نگار نے "انا" کے ذریعہ خوش گوار مستقبل کا اشارہ مہیا کیا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں میں **ترنم ریاض** کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے "یہ تنگ زمین" اور ابابیلیں لوٹ آئیں گی" دہشت گردی کے موضوع کی عکاسی کرتے ہیں ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی زندگی، اس کا درد، مسائل اور کرب کو چابک دستی سے ابھارا ہے۔ "بابل"، "متاعِ گم گشتہ"، "میرا پیا گھر آیا"، "برف گرنے والی ہے" میں اس کسک اور تپش کو بڑی آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے جو کشمیر کی عوام کی زندگی ہے۔ان کے افسانوی مجموعہ "یہ تنگ زمین" کا فکری کینوس نہایت وسیع ہے۔ایک اقتباس میں ملاحظہ ہو:

> "بڑے کمرے کے دروازے پر اس کی منی سی بہن ہونٹوں پر انگلی رکھے پہرا دے رہی تھی، "بیٹی ادھر نہیں جانا، فائرنگ ہو رہی ہے" وہ مجھے خبردار کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی، اندر جھانکا تو عجیب منظر دیکھا، سارے گھر کے تکیے اور سرہانے ایک کے اوپر ایک اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے ریت کی تھیلیاں رکھ کر مورچے بنائے جاتے ہیں۔ وہ درمیان میں اوندھا لیٹا ہوا ایک بڑی سی لکڑی کو بندوق کی طرح پکڑے منہ سے مختلف طرح کی گولیوں کی آوازیں نکال رہا ہے اور اس کے دائیں بائیں میرے دونوں بیٹے اپنی پرانی چھوٹی چھوٹی بندوقیں لیے ہوئے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ جیسے حکم کرتا وہ دونوں ویسا ہی کرتے۔ کبھی ایک بھاگ کر ایک کونے میں گھستا، کبھی دوسرا دوسرے کونے میں یہی عمل دہراتا۔ کبھی ایک بک ریک کی آڑ میں ہو کر دوسری طرف کودتا، کبھی دوسرا الماری کے پیچھے چھپ کر، جست لگا کر دیوار کے ساتھ اچک جاتا اور وہ خود مورچہ سنبھالے کبھی ان کو ہدایت کرتا کبھی ان پر بندوق تان دیتا۔اب یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ میٹھی بولیاں، وہ رقص، وہ موسیقی، بھول گیا تھا اور وہ سب یاد دلانے کے لیے میں شاید اسے کہیں نہیں لے جا سکتی تھی۔"(۱۱)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے دہشت گردی کے معصوم ذہنوں پر پڑنے والے اثرات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح معصوم اذہان پر ایک ان جانا سا خوف طاری ہے۔اس افسانے میں سفاکی، بربریت اور قتل و غارت گری کو نہایت سادگی اور سلاست سے بیان کیا ہے اور فرقہ پرستی جیسے اہم موضوع کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

اسّی کی دہائی کا اردو افسانہ اپنے عہد کے سیاسی، معاشی اور سماجی حقائق اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔اس میں متنوع فکری پہلو اور موضوعات کے ساتھ ساتھ اسالیب اور زبان و بیان کے تجربات نظر آتے ہیں۔اسّی کی دہائی کے اردو افسانے میں سارے منظر نامے کا احاطہ سامنے آتا ہے۔اس دور کا فسانہ جدید معیارات کو چھونے

لگتا ہے۔اس دہائی کی ابتداء میں اردو افسانے میں فرد کے داخل کو موضوع بنایا گیا ہے اور اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

"آٹھویں دہائی میں جو تبدیلیاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر رونما ہوئیں۔انھوں نے زندگی کے سانچے کو بڑی حد تک بدل دیا۔نئے مسائل پیدا ہوئے۔عصری زندگی کی ہمہ جہتی، سائنسی و صنعتی ترقی، اس ترقی کے مقابل انسان کی تحقیر اور ذلت، بے مائیگی، اعلیٰ قدروں کی شکست و ریخت، زندگی کی لایعنیت، مذہبی انتشار، سرکشی، بغاوت کا جذبہ، احتجاج و خارجی جبریت، ظلم و بربریت، مسائل کا انبار زندگی کے تضادات کی بھول بھلیوں میں گم ہوتی ہوئی انسانی عقل ، بے ضمیری، طبقاتی کشمکش، دہشت گردی، جنسی آسودگی اور اس طرح کے کئی عناصر ہیں جن سے عصری زندگی عبارت ہے۔ان مسائل اور معاشرے کی زندگی نے اردو افسانے کو بھی نئی شاہراؤں سے روشناس کرایا۔"(۱۲)

جدید افسانے کو ستر کی دہائی میں ایک خاص مقام حاصل ہوا جس سے اسلوبیاتی اور موضوعاتی اعتبار سے افسانے کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی۔اس عہد میں تحریری اور علامتی انداز شعوری طور پر اپنایا گیا کیونکہ اس عہد کے افسانوں میں اخلاقی اقدار کا زوال، معاشی ناآسودگی اور معاشرتی تضادات پائے جاتے ہیں جس کے اثرات افسانے پر بھی مرتب ہوئے۔افسانہ نگاروں کے ہاں بیزاری، تلخی اور جھنجھٹ کا احساس ہے۔انھوں نے علامتی اور تجریدی افسانوں کے کامیاب تجربے کیے جس کی وجہ سے ان افسانوں میں موضوعات کا تنوع اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ فکر میں گہرائی بھی نظر آتی ہے۔مرزا اطہر بیگ لکھتے ہیں۔

"بیسویں صدی کے انسانوں کے فکری، نفسیاتی، جذباتی، سماجی، معاشی اور سیاسی ارتقاء اور انحطاط۔۔۔عالمی جنگوں، مشین کی حکمرانی، افراد معاشرے کا بیک وقت ایک دوسرے پر مکمل انحصار اور دشمنانہ دوری سے پیدا ہونے والا ذہنی کھچاؤ، طاقت کے وحشیانہ ارتکاز کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی جبر و استحصال کی مختلف صورتیں، نسل انسانی کے مستقبل کے بارے میں مکمل بے یقینی اور پھر فرد کی اپنی چھوٹی بڑی بدقسمتیاں، تلخیاں اور اذیتیں ان سب نے معروضی واردات کو اتنا پُر پیچ اور گنجلک بنا دیا ہے کہ تہہ در تہہ علامتیت کی تلاش اور تخلیق اس کے اظہار کی مجبوری بن گئی۔"(۱۳)

تشدد اور جبر خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا سیاسی، وہ سب دہشت گردی کے زمرے میں ہی آتا ہے۔۱۹۸۰ء کا افسانہ اسی جبر اور تشدد کا احاطہ نہایت خوب صورتی سے کرتا ہے جس نے پورے پاکستانی

معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ اسی عہد کے اہل قلم نے مزاحمتی افسانے کا دائرہ نہایت وسیع کر دیا جس میں زندگی کے ہر پہلو کو موضوع بنا کر افسانے کے قالب میں ڈھالا گیا۔ پاکستانی افسانہ نگاروں نے ابھری مادی انفرادی نوعیت کے موضوعات سے لے کر عالم گیر نوعیت کے حالات و واقعات مثلاً مسئلہ کشمیر، مسئلہ فلسطین، افغان جہاد اور امریکی تسلط تک کے تمام واقعات پر خامہ فرسائی کی۔ دنیا چونکہ سمٹتی جا رہی تھی۔ اس لیے موضوعات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اسی کی دہائی میں عطیہ سید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے ایک طرف افسانے کی روایت کو جاری رکھا تو دوسری طرف جدیدیت کا ہاتھ بھی تھام لیا۔ ان کے افسانے "بلقان کا بت" ایک افغان بچے کی دردناک کہانی ہے۔ وہ بچہ اپنے ملک کے غاروں میں رکھے مجسموں کا دلدادہ ہوتا ہے اور جب غیر ملکی وہاں حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ مجسمے ان کی توجہ کا محور ٹھہرتے ہیں۔ دورانِ جنگ جب وہ مجسمے متاثر ہوتے ہیں تو حملہ آور ان کی مرمت کے لیے ہزاروں ڈالر خرچ کر دیتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کے لیے وہ مجسمے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ وہاں کے بچوں کے علاج و معالجے کے بجائے بارودی سرنگیں بچھا دی جاتی ہیں۔ ایک روز وہ بچہ بھی بارودی کھلونے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے۔ اس افسانے میں امن کے ٹھیکے داروں کے لیے کئی سوالیہ نشان کھڑے کر دیئے ہیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں **سمیع آہو جا** کا نام بہت اہم ہے۔ سمیع آہو جا ماورائی اور علامتی اسلوب کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ "جہنم+میں"، "ظلم دہشت"، "قید در قید"، "کشکول بدن"، "زنداں گرد باد" ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ جن میں ظلم و جبر، دہشت گردی، قتل و غارت گری اور آمرانہ تسلط پر بہترین افسانے ملتے ہیں۔ ان کے ان تمام مجموعوں میں معیار اور مقدار کا توازن بے مثال ہے۔ ان کے افسانوں میں جارحانہ انداز ملتا ہے جو کہ اس مزاحمتی عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے ہاں سامراجی طاقتوں کے خلاف شدید نفرت کے جذبات ملتے ہیں۔ انہوں نے دہشت و بربریت کا اپنے افسانے میں بارہا ذکر کیا ہے۔

> "چند لمحوں کے وقفے کے بعد کمانڈر کے اشارے پر جیسے ہی لالچ آنکھوں کی گرفت سے نکلی۔ ان کے قدم جھاڑیوں، درختوں کے بیچ گہرے تیز رفتار نالے کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھنے لگے۔ پہاڑی کے کافی اوپر، گھنے جنگل کے نیچے، سنگلاخ پتھروں کے درمیان، گہری تاریکی میں پوشیدہ غار کے اندھے دہانے سے جیسے ہی وہ باہر نکلے، چشمے کے نشیب سے گھنے پانی پر تیرتی آنکھیں یک دم ان سے لپٹ گئیں۔ کلاشنکوف کی ان کی طرف اٹھی نالی اور پھنکارتی آواز سے

ان کے قدم رک گئے۔ باہمی کوڈ کے تبادلے سے اٹھی، نالی جیسے ہی جھکی، نوجوان کمانڈر بے ساختہ باہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔"(۱۴)

سمیع آہو جا کے افسانوں کی کہانیاں تہہ در تہہ پرتوں پر مشتمل ہیں۔ان کے افسانوں میں ایک ان جانا سا خوف پایا جاتا ہے۔کلاشنکوف، قید، زنجیری حلقے، اہل فلسطین کی مفلوک الحالی ان کے افسانے میں ایک مزاحمتی رنگ کے ساتھ ساتھ درد و غم کی فضا قائم کر دیتا ہے۔

"اور آنکھوں میں پھیلے، فلسطینیوں کے کھلے آسمان تلے عارضی کیمپ، آہ و بکار کرتے لوگوں کا پڑاؤ۔ غنا کے لیے پھیلی لمبی قطاریں اور ہڑبونگ، چیخ و پکار، پھیلے ہوئے ہاتھ اور خیرات میں گرنے والی ایک لمبی روٹی اور پنیر کی ٹکیا، اس نے پھیلے ہوئے محنتی ہاتھوں کو دیکھا۔ فلسطینیوں کے تو گھر۔۔۔؟"(۱۵)

اس افسانے کا موضوع دراصل اہلِ فلسطین کی تباہی و بربادی ہے۔ان لوگوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا، سمیع آہو جا اسی کی منظر کشی کرتے ہیں۔

"گرد و پیش کی تمام فضا، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، رتھوں کی گڑگڑاہٹ، تلواروں کی جھنکار اور لشکروں کے شور و غل سے بھر گئی۔ خوشبوؤں کے باسی بے تحاشہ چیختے چلاتے اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے ہیں۔اس قرار ہوتے اژدھام کے دہشت زدہ قدموں تلے اپنی ہی مقتول عورتوں، بچوں اور لاغر کسی بوڑھوں کی لاشیں روندی گئی ہیں۔ گلی کوچے بازار مکینوں کی لاشوں سے اٹے پڑے ہیں۔ فلسطینیوں کا تو ملک چھن گیا ہے۔ مگر میں۔۔۔؟" کیسے اپنی ہی زمین پر بے گھر ہو جاؤں۔"(۱۶)

یہ افسانہ حالات کے جبر کے ساتھ ساتھ مسئلہ فلسطین کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ سمیع آہو جا کے نمایاں افسانوں میں "نقارچی" "قید در قید" "اپنی مٹی بن ماس" "شب خوف میں لتھڑے خواب جہنم+میں" کے متعلق ڈاکٹر انیس ناگی لکھتے ہیں:

"تشدد، ظلم، آزادی کی خواہش، خون کے رشتوں کا قتل عام اور بدلہ لینے کی تمنا سمیع آہو جا کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہیں۔ وہ براہِ راست بیان سے گریز کرتا ہے۔اس کے افسانے غیر معمولی فارمیٹ میں لکھے گئے ہیں کیونکہ ان میں شامل جذباتی تمثالوں سے بار بار کہانی کی طرف جانا پڑتا ہے۔وہ زبان کے Intensive استعمال کے ذریعے کئی پھٹی تصویریں بناتا ہے جو ایک دوسرے سے الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔"(۱۷)

دہشت گردی کے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ان کے مجموعہ "

"محل جھروکے کے دس چھوکے" سمیع آہو جا کا ایک بہترین افسانہ ہے جو کہ عالمی جبر اور تشدد کی تصویر کشی کرتا ہے۔اس کے علاوہ سمندر کا پیٹ۔۔۔ بھی دہشت و حشت کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

"نوخیز لڑکی کی لرزتی سسکیاں ان کے سینوں پر چرکے لگاتی چلی گئیں۔

بابا۔

ان کے پیچھے اندھیرے ہیں، ان کو مت دیکھو۔

توپیں، مارٹر اور مشین گنوں کے ساتھ دہشت ناک

آوازیں بھی نہیں جن سے کان پھٹ جاتے ہیں۔"(۱۸)

اس دہائی میں اگرچہ کوئی ہیتی تجربہ یا جدید فلسفیانہ رجحان دیکھنے میں نہیں ملتا۔البتہ جدیدیت نے فکر کی جولانیوں میں وسعت پیدا کی اور اس عہد میں قدیم وجدید تمام رنگ باہم یکجا ہو گئے۔اس کو مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔اس دور کے افسانے کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"اسّی اور نوے کی دہائی میں نئے افسانے نے اپنی پہچان بنالی تھی۔اس لیے اس کی تفہیم میں کوئی رکاوٹ نہ رہی جسے کہانی کی واپسی سے تعبیر کیا گیا۔۔۔ہوا صرف یہ ہے کہ نئی کہانی کا فن نکھر گیا اور قاری اس سے مانوس ہو گیا۔"(۱۹)

پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات کا اثر یہاں کے افسانہ نگاروں کے ذہنوں پر بہت گہرا ہے ۔بڑے شہروں میں خود کش حملے، دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ روز مرہ کا معمول بنتا جا رہا ہے۔بہت سے افسانہ نگاروں نے ان واقعات کو قلم بند کیا ہے۔لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور، یعنی چاروں صوبوں کے دارالخلافہ آج بالکل بھی محفوظ نہیں۔کراچی کے دہشت زدہ ماحول سے کون واقف نہیں۔وہاں تو عام انسانوں کے لیے سانس لینا بھی محال ہوتا جا رہا ہے۔دن دیہاڑے ٹارگٹ کلنگ اور ڈکیتی جیسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں اور کوئی پرسان حال بھی نہیں ہوتا۔گویا یہ معاملات اب وہاں کے لوگوں کی عام زندگی کا ایک حصہ ہیں۔

آصف فرخی کے افسانوں کے دو مجموعے "شہر بیتی" اور "شہر ماجرا" کراچی کے آشوب عصر حاضر کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ان دونوں مجموعوں میں اس خوف زدہ شہر کی جاری تصویریں ہیں جو گولیوں، زخموں، ہڑتالوں، کرفیو، نوگو ایریاز، ڈاکو، بھتہ خوروں کی دست برد میں کسی محاذ جنگ کا سا منظر پیش کرتے ہیں۔اس پس منظری فضا میں لوگ معمولات زندگی نبھانے کے جتن کر رہے ہیں۔جہاں ہر حرکت موت کا سایہ معلوم ہوتی

ہے۔اور ہر سایہ ملک الموت، جہاں خندقیں اور مورچے کھدرہے ہیں، جیسے کسی بیرونی حملہ آور کی پیش قدمی روکنا مقصود ہو۔ مگر پیش قدمی اور پسپائی کا خوف ناک کھیل آپس میں ایک ہی قوم کھیل رہی ہے۔اس شہر کی سڑکیں قتل گاہوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔اخبار کی ایک سرخی پورے افسانے کی فضا کو سوگوار بنادیتی ہے۔

"انہوں نے ایک بیان میں الزام لگایا کہ آخری راؤنڈ کی تیاری مکمل کر لی گئی ہے۔ گلیوں، سڑکوں پر فائرنگ کے بعد لوگوں کو ان کے گھروں میں گھس گھس کر مارا جائے گا۔ میری قوم کے دو ڈھائی لاکھ افراد کو قتل عام میں ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔" (۲۰)

مساجد مقتل گاہیں بن رہی ہیں۔لوگ عید کی نماز پڑھنے سے خائف ہیں۔اگر پڑھی جاتی ہے تو چھپ کر جیسے یہ عید کی نماز نہیں بل کہ صلوۃ الخوف ہے۔جس کے متعلق۔۔۔دادی جان کہتی ہیں:

اولیٰ یہ نماز تو اس طرح ہو رہی ہے جیسے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا نکاح ہوتا ہے۔" (۲۱)

اگرچہ سو پچاس لوگوں کا مر جانا اس شہر کے لیے کوئی بڑی خبر نہیں۔کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ شام کو گھر صحیح سلامت واپس لوٹے گا یا نہیں۔اس کا ذکر "گھر گھر پھیلا سوگ" میں موجود ہے۔جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آج کل ملک کے جو حالات ہیں ان میں معصوم لوگوں کی جان جانا اصل بات نہیں۔ قابل فکر بات تو یہ ہے کہ ان مرنے والوں میں سے ہر ایک لاش کسی گھر کا سہارا اور مستقبل تھا۔ہر ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہے۔ اور ہر گھر کی داستان غم الگ ہے۔ لیکن مروانے والوں کے لیے ہر صورت ٹارگٹ پورا کرنا ضروری ہے۔جان کے ساتھ ساتھ مال واسباب بھی محفوظ نہیں۔"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق" میں سٹریٹ کرائم کی مختلف وارداتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے دہشت گردی کا شکار ملک یا شہر کی تصویریں ہی نہیں دکھائیں۔ ان تصاویر کے محرکات اور درپردہ متحرک تنظیموں، گروہوں اور متحارب گروپوں کو بھی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً "محاصرہ" میں نوگوایریا کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ جس میں واحد متکلم اپنی ماں سے ملنے اس علاقے میں نہیں جا سکتا۔ مریض کو ہسپتال نہیں پہنچایا جا سکتا۔ دردزہ والی عورت کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ باز پرس، تشدد، موت، اور تذلیل معمول بن چکے ہیں۔

"میرا پرانا محلہ جیسے جیسے قریب آرہا تھا، لگتا تھا سڑک بھی وہ الفاظ دہرا رہی تھی اور میں کوئے ملامت میں داخل ہو رہا ہوں، قتل حملے، اذیت گاہیں، بے نام لاشیں، روز کی ایک تعداد، ویران سڑکیں، مکانوں کے

سامنے چھٹی ہوئی بھیڑ میں نے سوچا اخبار لیتا چلوں۔ گوریلا جنگ۔۔۔ اخبار والے کی آواز سن کر میں چونک گیا" گھیرا تنگ "میں نے غور سے سنا تو وہ یہ کہہ رہا تھا۔ اخبار تو میں نے خرید لیا۔ لیکن محلے میں داخل نہیں ہو سکا۔ گلیوں کے آگے رکاوٹ جابجا خندقیں کھدی ہوئی اور پھر چیکنگ کرنے والے کے بعد دوسری، دوسرے کے بعد تیسری جگہ۔۔۔ وہی تلاشی اور تفتیش۔۔۔ سوالات کی بوچھاڑ اور توہین آمیز سلوک جیسے کھولتا ہوا پانی میرے اوپر انڈیلا جارہا ہے" (۲۲)

یہ لاشوں سے اٹا خون سے رنگا، نفرتوں، گروہ بندیوں میں جکڑا شہر پورے ملک کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں کی راتیں کبھی جاگتی تھیں۔ اب مجرم اور دہشت گرد جاگتے ہیں اور عوام موت کی نیند سوتے ہیں ۔آصف فرخی نے دہشت گردی کو موضوع بنا کر دہشت و وحشت کے عذاب کو لمحہ بہ لمحہ اترتے ہوئے ان تحریروں میں دکھایا ہے۔ افسانہ "شہر بین" میں اخبار کی خبروں سے شہر کی سنگینی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "ایک فیصلہ کن دن" اور "ناگن چورنگی" میں واقعات کی شدت کی زد میں آئے ہوئے انسانوں کے احساسات کی غمازی کی ہے۔ سید مظہر جمیل لکھتے ہیں:

> "جب بستی پر خوف و دہشت کی عمل داری قائم ہو جائے اور گلی کوچوں میں قدم قدم پر تشدد و ایذا رسائی کے اڈے بن چکے ہوں اور انسانی اعصاب تشنج کا شکار ہو کر چٹخنے لگے ہوں تو خوف زدگی کے اس عالم میں واقعات و حادثات عمومی دلچسپی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور زندگی محض ایک حقیقت گزراں بن کر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی جمالیاتی احساس اور تخلیقی امنگ کے بغیر چنانچہ شہر بستی میں جو کہانیاں شامل ہیں ان میں آصف فرخی نے کوئی چونکانے والی بات کی ہے اور نہ کسی خاص واقعے اور حادثے پر تحیر کا اظہار کیا ہے۔ وہ تو صرف یہ بتاتے ہیں کہ آج کل زندگی کیوں کر گزر رہی ہے۔ لوگوں کے عمومی رویے کیا ہیں۔ اور ان کے اندیشہ ہائے دور دراز کی کیا صورت ہے۔" (۲۳)

ان کے دونوں مجموعے ایک ہی کہانی سنا رہے ہیں۔ روشنیوں کے شہر میں پھیلی کہانی ایک ہی کردار کے مختلف رخ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شہر مہاجر، سندھی، پٹھان، بلوچ اور پنجابی کے تعصب سے آلودہ اور غیظ و غضب کا شکار ہے، بدترین نسلی ریاستی، انفرادی غرضیکہ ہر طرح کی دہشت گردی کی مثال بن چکا ہے اور اس کے معمولات زندگی ٹھپ اور موت کے سائے جس پر دراز ہو چکے ہیں۔

ناصر بغدادی نے جو افسانے تحریر کیے ان میں کراچی کی شکستہ حالت اور جبر و تشدد کے واقعات کو قلم بند کیا جس نے اس شہر کے تخلیقی وجود کو بے روح اور بے سمت کر دیا۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "خوف زدہ کتے"، "حاسد"، "بے دست و پا" وغیرہ اہم ہیں۔

"ابو میں جانتا ہوں کہ شیر واور محلے کے دوسرے کتوں نے انسانوں کی بستی کیوں چھوڑ دی ہے۔ ابو وہ کتے خوف زدہ تھے۔ بے حد خوف زدہ۔ انہوں نے چار زندہ چلتے پھرتے انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں بے دردی کے ساتھ قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا"(۲۴)

زاہدہ حنا کے افسانوں میں ہجرت کے کرب کا ناسٹلیجیائی اظہار اور سامراجی قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہو جانے کا عزم نمایاں ہے۔ انہوں نے ملک میں دہشت گردی ثقافتی نظام کی توڑ پھوڑ اور تہذیبی ورثے کے انتشار کو موضوع بنایا ہے۔ "معدوم ابن معدوم" میں افسانہ نگار نے اپنے تاریخی شعور آزما کر کہانی کو وسعت عطا کی ہے۔ دراصل اس کہانی میں ہجرت کا کرب بھی نمایاں ہے اور پھر شہر کی خونریزیاں بھی عیاں ہیں۔ افسانہ "بہ ہر سور قص بسمل بود" کا پھیلاؤ بہت ہے۔ اس میں نمایاں دیگر عقائد کے لوگوں کے مصائب سے لے کر ایران، تاجکستان تک وسعتیں پھیلی ہیں۔ مگر اصل کہانی کراچی کی سڑکوں پر پھیلی وحشت و دہشت کی ہے۔ اس کے علاوہ زاہدہ حنا کے دو مجموعے "قیدی سانس لیتا ہے" جو کہ اسی کی دہائی میں منظر عام پر آئے اور "راہِ اجل میں ہے"۔ ۱۹۹۶ء میں دہشت گردی اور ملکی خلفشار پر اچھے افسانے لکھے گئے۔ ان کے دہشت گردی پر لکھے افسانوں کا موضوع کراچی میں پھیلی دہشت گردی، ظلم اور افراتفری ہے۔ جس کی واضح مثال "تتلیاں ڈھونڈنے والی"، "رنگ تمام شد"، "جسم و زبان موت سے پہلے" اور "آخری بوند کی خوشبو" جیسے افسانے ہیں جن میں جبر و استبداد اور ظلم و ستم کی چکی میں پسنے والے لوگوں کی داستان غم، دہشت گردی اور لوٹ کھسوٹ کا ذمہ دار نااہل حکمران اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو کیا گیا ہے۔ افسانہ "زمین آگ کی آسمان آگ کا" میں بھی معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف ایک احتجاج ہے۔

"ان پر دباؤ ڈالا جانے لگا وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں عدالت کو اپنا فیصلہ واپس لینے کی درخواست دیں۔۔۔۔۔ مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی۔"(۲۵)

کراچی کے حالات اور دہشت گردی کے واقعات کے پیش نظر الطاف فاطمہ کا افسانہ "ذہن کا اقلیدی زاویہ" اور "جب دیوار گریہ کرتی ہیں

"میں خوف، دہشت اور تشدد سے لبریز زندگی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔" پہلے لوگ چل کر میدان شہادت کو جاتے تھے اور اب شہادت خود چل کر بستیوں، سڑکوں، اور بازاروں میں آتی ہے۔"(۲۶)

ہندوستان نے جب ایٹمی دھماکے کیے تو اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کی جب پوکھران میں ایٹمی دھماکے ہوئے تو راجستھان میں سارے مور چیختے چلاتے اور جھنکارتے رہے۔ اس ضمن میں انتظار حسین کا افسانہ "مور نامہ" قابل ذکر ہے۔ افسانہ نگار نے ہندوستان کی روایتوں سے ثابت کیا ہے کہ بدی کی ہلاکت پسندی ہمیشہ دنیا کا چلن رہا ہے۔ نسل انسانی کا خاتمہ شیطان کا منصب ہے جو مختلف رنگ وروپ میں خود کو تبدیل کرتا ہے اور کبھی وہ برہم اشتر کہلاتا ہے۔ کبھی ہائیڈروجن بم، کبھی ڈیزی کٹر اور بالآخر تان ایٹم بم پر آن کر ٹوٹتی ہے کہ جس کے استعمال سے دنیا اور نسل انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود آج کے اشوتھاما ڈھٹائی سے کہتے ہیں "میں نے تو استر چلا دیا" جس کے چلنے کے بعد نہ موروں کی جھنکار رہے گی نہ بچوں کی کلکاریاں، نہ زمین کے پھول پھلواری، لیکن چند سر پھرے اپنے انتقام کی آگ ضرور فرد کر لیں گے۔ یہ افسانہ انتظار حسین کے مخصوص داستانی اسلوب کی دلچسپی میں گندھا ہوا ہے جو بدی کی فطرت اور ازل وابد میں اس کی کارفرمائی کو بیان کرتے ہوئے جنگی نفسیات پر گہرا تبصرہ ہے۔ اس کے علاوہ "میرے اور کہانی کے بیچ" بھی افسانے سے قریب تر تحریر ہے۔ اس میں بھی پاک بھارت ایٹمی دھماکوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک اور افسانہ "ریزروسٹ" بھی دہشت گردی اور موت کی منظر کشی کرتا ہے۔ یہ پاکستان اور ہندوستان کے بیچ مہلک ہتھیاروں کی دوڑ اور ایٹمی تجربات کے بعد کی صدی پر ہمارے عہد کے زندہ ضمیروں کے افسانے کی زبان میں گواہی ہے۔ بات آگے بڑھتے بڑھتے عالمی انسانی تناظر میں آجاتی ہے۔ افسانہ نگار نے عالمی سطح پر لاحق انسانی صورت حال سے مکمل آگاہی حاصل کی ہوئی ہے اور عصری صورت حال کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

احمد جاوید کا افسانہ "سن تو سہی" بغاوت، انقلاب اور تبدیلی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی تقدیر کا پابند ہونے کے باوجود بھی خود کو پابندیوں میں جکڑ نہیں سکتا اور خود کو نہ ہی وقت کے تھپیڑوں کے سپرد کر سکتا ہے۔ یہ افسانہ ان الفاظ میں ختم ہوتا ہے:

"وہ اٹھا اور اٹھ کر بند دروازوں پر دستک دینے لگا۔ شاید ۔۔۔۔۔۔۔ اس کا جواب ملتا۔ باہر دھوپ ہے، لو چلتی ہے، دھوپ ڈھلنے دو، ہوا چلنے دو، تم کہنا ہم سنیں گے۔"(۲۷)

اس افسانے میں اس عہد کی عکاسی کی گئی ہے۔ جہاں سیاسی اور ریاستی دہشت گردی کا شکار عوام زبان بندی پر مجبور ہیں۔ ان کی سوچ اور جذبات کو کھول کر رکھ دیا گیا ہے اور حکمرانوں نے ان کو بے حس و حرکت بنا دیا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک انقلابی تبدیلی کا بھی پیغام دیا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے افسانہ "پٹ جھڑ میں مارے گئے لوگوں کے نام" میں انہوں نے اپنے عہد کی تصویر کشی علامتی انداز میں کی ہے۔ یہ افسانہ "میں" سے شروع ہوتا ہے جو قبرستان کی دیوار پر بیٹھا ہے۔ دونوں آوازیں نکال کر اپنے ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اس کہانی میں دراصل افسانہ نگار نے انسان کی شناخت ختم ہونے کا المیہ بیان کیا ہے کہ کس طرح دہشت زدہ ماحول میں انسانیت کھوکھلی ہو گئی ہے۔ کہیں انسان بے حس بن چکا ہے تو کہیں بے بس۔ ظلمت و تاریکی کی دلدل میں دھنسی اقدار اور انسانیت دوست فضا سب معدوم ہو چکے ہیں۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ بس طاقتور کے آگے کمزور اور حقیر ہو چکا ہے۔ اسی کو اگر ضمیر کی موت کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اسی سے ہی انسان کی شناخت بھی چھن چکی ہے۔

> "تھکاوٹ سے چور راستے قبروں کے درمیان چپ چاپ لیٹے ہیں۔ سانولی نمکین شام آہستہ آہستہ ہمارے درمیان رات کا پارا بن رہی ہے۔ شام کی جھولی میں سمٹا اندھیرا دبے پاؤں باہر نکل کر چپکے چپکے چاروں طرف پھیل رہا ہے۔"(۲۸)

منصور قیصر کا افسانہ "سورج کی آواز" بھی بم دھماکوں کے تناظر میں لکھا گیا۔ اس میں ایٹمی جنگ کے خلاف احتجاج کی جو صورت سامنے آئی ہے اس میں افسانہ نگار نے ایٹمی جنگ کے خلاف احتجاج کی جو صورت سامنے آئی ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے ایٹمی جنگ کو قیامت کے طور پر دیکھا ہے۔ جس کے ذمہ دار ہم خود ہیں، ایک دھماکہ ہوتا ہے جو بے شمار انسانوں، جانوروں چرند پرند کو دہلا دیتا ہے۔ بس چیخیں سنائی دیتی ہیں اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد زندگی اچانک خاموش سی ہو جاتی ہے۔ خاموش ہو جانا بھی احتجاج کا ایک روپ ہے۔ ان دھماکوں کے بعد کراچی کے حالات آج تک معمول پر نہیں آ سکتے۔ مذہب کے نام پر خودکش حملے، بم دھماکے نسلی فسادات، سیاسی قتل و غارت، غرضیکہ ہر طرح سے بدامنی اور انتشار آج عروج پر ہے۔ ان حالات نے لوگوں کو نفسیاتی سطح پر بھی بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

مبین مرزا کا افسانہ "خواب ہارا آدمی" بھی ایٹمی دھماکوں کے خوف اور دہشت میں لکھا گیا ہے۔ ان دھماکوں کا انسانی نفسیات پر جو اثر پڑا ہے اس سے کئی لوگ اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار

نے دراصل قتل و غارت، دہشت گردی، بے روزگاری اور ناگہانی آفات اور ایٹمی دھماکوں کے خوف سے پیدا ہونے والی نفسیاتی بیماریوں کو موضوع بنایا ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے اواخر اور دسویں دہائی کے آغاز میں افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کو اپنایا۔ نوے کی دہائی کا افسانہ نئی تخلیقی جہات سے مزین ہوا۔ ۱۹۹۰ء سے لے کر عہد حاضر تک کے افسانے کو مابعد جدید افسانہ کہا جاتا ہے۔ فن افدانہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے ولاے نئے تخلیق کاروں نے افسانے کو عروج پر پہنچادیا۔ دورِ حاضر کا افسانہ ارتقاء کی کئی منزلیں طے کر کے ہم تک پہنچا ہے۔ جدید افسانہ حالات و واقعات کا رشتہ اسی سماج کے لوگوں سے جوڑتا ہے۔

> "یہ ایک نئی طرح کا مزاحمتی رجحان ہے جسے ہم اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں مشکل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ مزاحمت کئی محاذوں پر بیک وقت سر اٹھا رہی ہے۔ سب سے بڑا کئی اور سر گرم محاذ تو بڑی طاقتوں کی دھونس، دھمکی آمیز رویے، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی استحصال اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانے کی شعبدہ بازی کے خلاف ہے ۔اردو افسانہ بین الاقوامی سطح پر اٹھنے والے طوفان اور اس کے عواقب سے بے خبر ہے نہ بے نیاز۔"(۲۹)

اس دور تک آتے آتے اردو افسانہ فنی اور ہیتی تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ پچھلی دو دہائیوں میں افسانے پر علامت اور تجریدیت کا دور دورہ رہا۔ یہ بحث ممتاز حسین، انتظار حسین، ڈاکٹر انور سدید، خالدہ حسین، اے خیام ، زاہدہ حنا اور وزیر آغا کے مابین چلتی رہی لیکن اس دوران علامتی و تجریدی اسلوب کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ حقیقت نگاری اور بیانیہ اسلوب پھر سے مروج ہونے لگا۔ مگر رشید امجد کے ہاں علامتی انداز پھر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی مخصوص اختصار نویسی میں "سراب" ایک بڑے موضوع کی کہانی ہے۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی بستیوں کی کہانی ہے۔ جن کی ضخامت اور حجم قابو میں نہیں رہتے۔ نتیجتا قانون، ضابطے، اصول طریقے بھی ان کے پھیلاؤ اور گنجانی میں کہیں دب جاتے ہیں۔ پاکستان کے گنجان آباد شہروں خصوصاً کراچی کا نام سر فہرست ہے۔

> "شہر تو کئی شہروں کا ایک تھا۔ اس لیے کسی ایک حصے میں چلنے والی گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور چیخیں دوسرے حصے میں سنائی نہ دیتی تھیں، لیکن فضا میں خوف کی ایسی چپچپاہٹ تھی جو

سسکیوں اور آہوں کو لمحوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیتی تھیں۔"(۳۰)

شوکت حیات کے افسانہ "گنبد کے کبوتر"(۱۹۹۵ء) کی تخلیق کے پس پردہ بابری مسجد کا انہدام ہے جس کا ذکر افسانے میں نہیں۔ چنانچہ اس کا موضوع واقعہ نہیں بل کہ بگڑی ہوئی ملکی قومی حالت ہے۔ ہمہ دان راوی کی تکنیک ہے۔ سین دادا کا نمایاں کردار۔ دلی اضطراب والا راوی اپنا نہیں بل کہ دوسرا بن کر رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسے نہ سمجھنے کا سازشی ماحول ہے جو استعارہ بنتا ہے۔ پھر کبوتر کا اپنے ٹھکانوں سے اڑ کر وسیع آسمانوں اور جنگلوں میں پناہ ڈھونڈنا معاشرتی تبدیلی کا اشارہ ہے۔ کہانی سے کہانی کی جانب مصنف کا نیا قدم ہے۔

منشایا دنے "سارا سفر افسوس کا ہے" ۱۹۹۹ء لکھ کر یہ آشکار کیا کہ عام ذہن پر دہشت گرد ماحول کا کتنا اثر ہے۔ اس افسانے میں شہر کراچی کا ان فضاوں کی عکاسی کی گئی ہے جن میں خوف وہراس کی سی فضا ہر وقت قائم ہے اور آج کا آدمی حقیقت کے بالمقابل لرزہ خیز فکر وخیال میں مبتلا ہو کر زندگی کے سفر کو جہنم زار بنائے تھکتا چلا جارہا ہے۔ یہ افسانہ آج کے دہشت زدہ بے یار ومددگار انسان کی تصویر اُتارتے ہوئے مذہبی اجتماعی زوال کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ نسلی اور لسانی نفرتوں نے اس کی جاگتی راتوں اور روشن دنوں کو موت اور افواہوں کی تاریکیوں میں لپیٹ دیا ہے۔ قیام پاکستان سے بیسویں صدی کے اختتام تک اردو افسانہ ترویج وترقی کے بے شمار منازل طے کر کے نئی صدی میں داخل ہوا۔ اس میں کراچی اور آشوب سندھ پر اس لیے زیادہ لکھا گیا کیوں کہ کراچی میں مقیم افسانہ نگار ذاتی ذاتی مشاہدے اور تجربے میں سب کچھ محسوس کر رہے تھے۔ افسانہ نگاروں نے کراچی کے حالات کو پورے پاکستان کے حالات کے تناظر میں بیان کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد جس مسئلے پر زیادہ افسانے منظر عام پر آئے ان میں کراچی کا مسئلہ مرکزی تھا۔ اگرچہ مارشل لاء کے تناظر اور سقوط ڈھاکہ پر بھی کثرت سے لکھا گیا لیکن ان دنوں موضوعات پر عائد پابندیوں حوصلہ شکنی کا باعث تھیں۔ مارشل لاء کے خلاف مزاحمتی ادب پر علامتی اور تجریدی رنگ زیادہ گہرا تھا۔ "سقوط ڈھاکہ" بھی بہت بہت حساس موضوع تھا۔ مگر کراچی کے حالات بھی تمام اہل قلم کے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ اس صدی میں آتے آتے حالات اب صرف کراچی تک محدود نہیں بل کہ پاکستان کے تمام شہروں کو ہر طرح کی دہشت گردی اور انتشار کا سامنا ہے۔ اس دور میں کراچی دہشت گردی کی لپیٹ میں تھا اور افسانہ نگاروں نے ان حالات وواقعات کی افسانوں کی صورت میں عکاسی کی۔ اس طرح کراچی کے حالات پر لکھے گئے افسانوں کی تعداد کافی کثیر ہے۔ مظہر جمیل لکھتے ہیں:

"آشوب سندھ کے موضوع پر گزشتہ دو عشروں میں درجنوں نہیں سینکڑوں کہانیاں لکھی جاچکی ہیں۔۔۔اس ذخیرے میں بلاشبہ رطب و یابس اور غیر معیاری تحریریں بھی شامل ہیں اور ایسی کہانیاں بھی شامل ہیں جو بری، بہت بری، سنسنی خیز، رقیق جذبات، انفعالیت اور غلو سے مملو بھی ہیں اور ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اخباری اطلاع نامے کی سطح سے بلند نہ ہو سکی ہوں۔ایک مخصوص گروہ اور فریق کی جانب سے دوسرے مخالف گروپ کے خلاف فرد جرم قائم کرتی ہوئی کہانیاں، واقعات و حادثات کی خبریں سنائی ہوئی کہانیاں خوف و وحشت، وحشت اور بربریت کی فضا کو مزید آنچ دکھائی ہوئی کہانیا ں انسانی آلام ومصائب اور الم ناکیوں کے رستے ہوئے زخموں کو کریدتی ہوئی کہانیاں۔"(۳۱)

ملکی حالات جیسے جیسے خراب ہوتے جارہے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں ایک دم ہی دہشت گردی اور بم دھماکوں کا جال بچھ گیا ہے۔آئے روز کوئی نہ کوئی شہر خودکش حملوں یا بم دھماکوں کی نظر ہو رہا ہے۔جس سے لوگ خوف ہراس کا شکار ہیں۔اس ضمن میں مسعود صابر کا افسانہ "سرخ" قابل ذکر ہے۔اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"پھر کوئی ہفتے دس دن کا وقفہ آیا تو قریبی ضلع میں ایک دھماکہ ہوا۔پھر صوبائی دار لحکومت میں اور پھر ہم گنتی بھول گئے۔ہر دھماکے کے بعد میٹنگ ہوتی۔تمام ضلعی انتظامیہ اکٹھی ہوتی۔گزشتہ اقدامات کا جائزہ لیا جاتا۔نئے اقدامات کے فیصلے ہوتے۔نئی کمیٹیاں اور سب کمیٹیاں بنتی، مگر چند ہی روز بعد ہم خود کو کہیں نہ کہیں خون آلود دیواروں اڑتے چیتھڑوں اور لہوں سے بھرے گڑھوں کے بیچ پاتے۔اب مرنے والے اور زخمیوں کی صرف گنتی ہونی تھی اور بس۔"(۳۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے پاکستان کے حالات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج ہم کس طرح تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔کوئی دہشت گرد اگر گرفتار بھی ہو جائے تو وہ باآسانی رہا ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ معصوم لوگ بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ایسے حالات میں ملک میں دہشت گردی کا خاتمہ ناممکن نظر آتا ہے۔

افسانہ "دہشت گرد چھٹی پر ہیں" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہم دہشت گردوں کے رحم و کرم پر ہیں۔وہ جب، جہاں اور جو چاہیے کر سکتے ہیں ۔دہشت گردی کے نام پر جب تک اصل مجرموں کی بجائے بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر سزا دی جاتی رہے گی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"(۳۳)

ملک میں چھائی دہشت گردی کے محرکات کچھ بھی ہوں، یہ سوچی سمجھی سازش قرار دی جائے چاہیے۔ اس کے پس پردہ بین الاقوامی اور ملکی خفیہ اداروں کی چال سمجھی جائے۔ لیکن یہ بات اب واضح ہے کہ اس نے نہ صرف معاشرے کے پورے ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا۔ نہ صرف انسانوں کو خوف اور موت کے فوبیا کا شکار کر دیا ہے بل کہ انہیں اعصابی اور نفسیاتی طور پر بھی شدید متاثر کیا ہے۔ انسانوں کے رویے عجب انتشار کا شکار ہو چکے ہیں۔ کہیں بے حسی بڑھ رہی ہے تو کہیں تشدد کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ آج معاشرہ تشدد پسندی کی طرف راغب نظر آتا ہے۔

شموئل احمد نے "القمبوس کی گردن" (۲۰۰۰ء) کے عنوان سے ایک ملک کی آزادی کے بعد اقلیتی کردار کی مسلسل قربانی اور لہولہو زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ تخت سلطنت کے چوتھے پائے کا خون بہنا بند نہیں ہوا۔ یہ بات ترسیل ہوتی ہے۔ مگر کچھ تلازماتی ناموں کا برتاو استعاراتی جسم میں پیوست نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر کا نام مثلاً "موریہ" کی جگہ عسطیہ کیوں رکھا گیا؟ جو تشی کی جگہ ملنگ کا کردار کیوں لایا گیا؟ ستاروں کے ہندوستانی نام کیوں رکھے گئے؟ بنیادی کردار کو القمبوس کیوں کہا گیا؟ شاید اس لیے کہ یہ علامتی افسانہ علامتی پوشش طلب کرتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا افسانہ "احمد آباد۔ ۳۰۲ میل" (لینڈ اسکیپ کے گھوڑے) گجرات کے فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا ذہنی تردد اور ناقابل برداشت حالات کا گہرا بیانیہ ہے جو سیاسی عصبیت پر نشتر زنی کرتا ہے۔ وطن کا کھو جانا ایک جذباتی تلازمہ ہے اور اچھا ہوتا اگر سارا افسانوی ہیجان کسی علامت میں ڈھل جاتا۔ اس طرح زیادہ زور اور توانائی داخل ہو سکتی تھی۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہی حالات کبھی بھی ایک جیسے نہیں رہے۔ دشمنوں اور بیرونی طاقتوں نے ہمیشہ اس کی سالمیت کو نقصان پہنچایا ہے اور دہشت گردی کے ذریعے ریاست میں انتشار کی فضا پیدا کی جاتی رہی ہے۔ دہشت گردی کی تمام صورتوں کو اردو افسانے کا موضوع بحث بنایا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ تاحال بھی جاری ہے۔ مجموعی طور پر اس موضوع کی ہر جہت اور ہر زاویے پر بہت کچھ لکھا گیا اور اب تک بھی لکھا جا رہا ہے جس کو ہم دور خاضر اور ماضی کا تقاضا کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ دہشت گردی پر لکھے گئے تمام افسانوں میں حقیقت خاص کر تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور اس ناسور کے خلاف جتنا بھی لکھا جائے وہ کم ہے۔

افسانہ نگار **حیدر قریشی** نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کے نشیب و فراز کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی حقیقت نگاری کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ وہ حساس افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔انہوں نے فرد کی زندگی میں آنے والے دکھ، نارسائی، پریشانی اور کرب کا اظہار اپنی افسانہ نگاری سے کیا ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ ''ایٹمی جنگ'' کے نام سے ہوا۔اس مجموعے میں شامل تین افسانے اس سے پہلے مجموعے ''افسانے'' میں شائع کیے جا چکے ہیں۔یہ تین افسانے "حوا کی تلاش"، "گلاب شہزادے کی کہانی" اور "کاکروچ" ہیں۔اس مجموعے کا ہندی ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ یہ اکتیس صفحات پر مشتمل مختصر سا ایک مجموعہ ہے۔

حیدر قریشی کے افسانے تاریخی، علامتی اور تمثیلی انداز کو سمیٹے ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں ''حوا کی تلاش''، ''گلاب شہزادے کی کہانی'' اور ''کاکروچ'' میں ایٹمی جنگ کے اثرات کو موضوع بنایا ہے۔ وہ خود کو متاثرین ایٹمی جنگ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔اس طرح وہ قارئین کو ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ ان تینوں افسانوں کی تخلیق کی وجوہات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' ۱۹۸۰ء کے وسط میں میرا ذہن بار بار ایٹمی جنگ کے امکانی خطرہ کی طرف جاتا تھا۔ بعض آسمانی صحیفوں اور مذہبی کتب میں مجھے ایک بڑی تباہی کی خبریں پڑھنے کو ملیں تو میرے اندر کی بے چینی نے مجھ سے کہانی حوّا کی تلاش" لکھوائی۔۔۔"حوا کی تلاش"، "گلاب شہزادے کی کہانی" اور "کاکروچ" یہ تینوں کہانیاں کرۂ ارض پر انسانیت کو درپیش ایٹمی تباہی کے بارے میں میرے احساس اور میری تشویش کی کہانیاں ہیں۔''(۳۴)

دہشت گردی کے موضوع پر **اسلم سحاب** کا افسانہ "سرخ کمبل" قابل ذکر ہے۔انہوں نے معاشرتی موضوعات میں خاص طور پر مذہبی شدت پسندی کو اپنا حرفِ تنقید بنایا ہے۔اس افسانے میں خودکش حملوں اور دہشت گردی جیسے انتہائی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو کہ آج کے ہمارے معاشرے میں آسان کام نہیں ہے۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "وہ مسلمان افغانی لڑکا اپنے مسلمان بھائیوں کے قتل کو جہاد کا نام دے رہا تھا۔ کسی تربیتی کیمپ نے اسے خودکش حملہ آور بنا کر یہ سبق پڑھایا تھا کہ کسی ظالم کے ظلم کا بدلہ اس کے حلیفوں سے لینا بھی جہاد کے مترادف ہے کیونکہ اس کے والدین افغان امریکہ جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔اس لیے اب وہ لڑکا ہمیں اپنا دشمن گردانتا تھا۔"(۳۵)

ایٹم بم کی ایجاد نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس وقت کرہ ارض پر سات ممالک ایٹمی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بموں کی نسبت کہیں زیادہ طاقت ور اور تباہ کن ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں جوہری توانائی نے کئی گنا ترقی حاصل کر لی ہے۔ لاٹھیوں اور پتھروں کی طرف مراجعت اس جدید سائنس اور علم کا عطیہ ہو گا۔ اس خطرناک ہتھیار کا استعمال جب جنگ عظیم دوم میں جاپان کے شہروں پر کیا گیا تو اس کے نتائج نے پوری دنیا کو ہلا دیا۔ اس ہولناک تباہی سے فوری طور پر لاکھوں لوگ ابدی نیند سو گئے۔ ان شہروں کا طویل حصہ صفحہ ہستی سے ہی مٹ گیا۔ جو لوگ بچ گئے ان کا انجام مرنے والوں سے بھی کہیں زیادہ بھیانک ہوا۔ تابکاری کے برے اثرات سے لاکھوں لوگ معذور ہو گئے اور اس تابکاری اثرات کو ان کی نسلوں نے بھگتا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے اس دن کی ہولناکی اور تباہی پر سوگ منایا اور انتہائی غم زدہ تحریریں لکھیں۔ اردو ادیبوں نے بھی اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا اور کئی تحریریں منظر عام پر آئیں۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" اسی تناظر میں لکھا گیا۔ ابن سعید نے افسانہ "ہیروشیما" تخلیق کیا۔ کرشن چندر نے "ہوا کے پتے" لکھا، غلام عباس کا طویل افسانہ "ڈھنگ" اسی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح زاہدہ حنا کا افسانہ "تنہائی کے میدان میں" ایٹم بم زدہ افراد کے عام معمولات زندگی پیش کرتا ہے "ہیروشیما" اور "ناگاساکی" اردو ادب میں دو علامتوں کی طرح رائج ہیں۔ بربادی، مظلومیت، انا پرستی، اور ظلم کی علامتیں ایٹم بم اصطلاحاً سائنسی شیطانیت اور انسانی فرعونیت کا متبادل محسوس ہونے لگا ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو ایٹم بم کی ایجاد کو سائنس کی کامیابی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ایٹمی ہتھیاروں کا ہولناک بیان پوری دنیا کے ادب میں ہوتا رہا۔ اردو افسانے میں بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر لکھا گیا ہے۔ آصف فرخی لکھتے ہیں:

> " چچا سام سے ایٹم بم کا تحفہ مانگنے کی منٹو کی بظاہر طفلانہ مگر گہرے طنز کی حامل فرمائش سے لے کر محمد سلیم الرحمن کے گھمبیر اور باریک باریک گندھے ہوئے افسانے تک جس میں روزمرہ زندگی کا معمولی پن ایٹمی جنگ کو بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ تحریروں کا پورا ایک سلسلہ ہے جو ایٹمی تباہ کاری کو زندگی کے دوسرے مظاہر کی بنت میں شامل کر کے نہ صرف ہماری آج کی قومی ابتلاء کو اجاگر کر رہا ہے۔ اس کے لیے تخلیقی استعارہ بھی فراہم کرتا ہے۔ "(۳۶)

اردو ادب میں انسان کی انسان پر لائی ہوئی اس ہولناکی کو خارجی اور داخلی ہر سطح سے پیش کیا گیا ہے۔ محمد سلیم الرحمن کا افسانہ "راکھ" انڈیا اور پاکستان کے درمیان ایک ایسی ممکنہ جنگ کے متعلق ہے جس میں ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال دکھایا گیا ہے۔ ایٹم بم ایک تباہی ہے اور بنی نوع انسان کو ختم کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک ہولناک حقیقت ہونے کے باوجود یہ خیال نظم میں تو بآسانی ڈھل سکتا ہے مگر افسانے کے لیے اس خیال کے گرد ایک کہانی بننا، کردار تخلیق کرنا اور فضا بندی کرنا ضروری ہے۔ اس سارے عمل کے لیے ایک ماہر ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے اس موضوع پر سینئر اور نامور افسانہ نگاروں نے ہی قلم اٹھایا۔ مثلاً انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، مسعود اشعر وغیرہ۔ اسی لیے یہ افسانے فنی اور ادبی لحاظ سے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔

اکیسویں صدی انقلابات کی صدی ہے جس نے دنیا کو سمیٹ کر ہی رکھ دیا ہے۔ اردو افسانے نے اپنے دامن میں معاشی، سیاسی و سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال، دہشت گردی اور جدید ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ مسائل، خود کش دھماکے، زلزلے، سیلاب، ۹/۱۱ کا سانحہ اور اس کے نتیجے میں افغان اور عراق جنگ جیسے تمام موضوعات کو سمو لیا۔ آج کا افسانہ بین الاقوامی صورتِ حال کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ جہاں تک قدیم اور جدید افسانے کا تعلق ہے تو قدیم افسانہ فکری عنصر کی بجائے مقصدیت کو فوقیت دیتا تھا۔ جب کہ جدید افسانہ پرانے افسانہ نگاروں کی طرح پلاٹ کی منطقی ترتیب کی بجائے پلاٹ کے خیال کو اہمیت دیتا ہے۔ یعنی ٹھوس واقعات کی جگہ خیال کے ذریعے ہی افسانے کی بنت ہونے لگی۔ جدید افسانے میں ایک منطقی عمل سے خیال وجود میں آیا جو کہ جذبے اور احساس کی سطح تک پہنچتا ہے۔ ویسے تو آغاز سے ہی اس زندگی کی حکایت درج ہوتی رہی مگر جدید افسانے نے خارج سے داخل اور داخل سے خارج کے جدید سفر کی نئی جہت ڈھونڈ نکالی جس کے لیے اس نے بے حد طاقت اور اسلوب اختیار کیا جس میں جدید موضوعات اور کرداروں کو زندہ پیکروں میں جامد و مجسم کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔

ہ۔ ۹/۱۱ کے بعد اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع

تاریخ انسانی میں ایسے ان گنت دل ہلا دینے والے واقعات و حوادث رقم ہیں۔ جنہوں نے پوری کائنات کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان واقعات کو یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان واقعات نے خیر و شر کے درمیان کی حد ہی پامال کر دی اور حق و باطل کے پیمانے بدل ڈالے۔ یہ واقعات نہ صرف ذہن انسانی کو شدت سے متاثر کرتے ہیں بل کہ ان کی تلخیاں اتنی ناقابل فراموش ہوتی ہیں کہ روح انسانی تک کانپ جاتی ہے۔ صدیوں تک ان واقعات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ آنے والی نسلوں کے لیے بھی یہ حوادث ایک عبرت بن جاتے

ہیں۔ نائن الیون کا سانحہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ جس نے عالمی منظر نامے کو ہی بدل ڈالا۔ بین الاقوامی سطح پر بے شمار لوگوں کے خون سے ظلم و بربریت کی نئی داستانیں رقم کی گئی ہیں۔ جنہوں نے دنیا کے سارے خدوخال میں ہی تغیر و تبدل کا طوفان برپا کر دیا۔ ۲۰۰۱ء سے اب تک وہ طوفان تھما نہیں، آج ۹/۱۱ جیسے کئی واقعات دنیا کے مختلف خطوں میں آئے روز واقع ہو رہے ہیں۔ مگر اب یہ واقعات تو جیسے روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ ان حوادث پر آج انسانیت خاموش ہے۔ آہ و گریہ کرنے کے لیے آج کے انسان کے پاس شاید وقت ہی نہیں بچا یا شاید بے شمار گرتی، جلتی لاشوں کے ساتھ انسان کا ضمیر بھی مر چکا ہے جس کے لیے آج انسان کا خون اتنا ارزاں ہو چکا ہے کہ جیسے مرنے والے کوئی کیڑے مکوڑے ہوں۔ جن کو قدموں تلے روندنے کے بعد کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دکھ۔ مگر ایک تخلیق کار یا ادیب اپنے ارد گرد کے ایسے تمام حالات و واقعات کا گہرا مشاہدہ رکھتا ہے۔ عام لوگوں کی نسبت اس کی فکر میں گیرائی و گہرائی ہوتی ہے۔ کوئی بھی سانحہ یا واقعہ کسی ادیب کے جذبات و احساس پر گہری چوٹ لگاتا ہے اور وہ ادیب اس واقعے کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر تحریر کی صورت میں پیش کرتا ہے اور قاری کو ایسے واقعات و حالات کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور فکر اور احساس کے نئے جہاں پیدا کرتا ہے۔ اگر فن کار اپنی تخلیق کے ذریعے قارئین کی توجہ حاصل کرے تو یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اردو افسانے میں دہشت گردی اور خاص طور پر ۹/۱۱ جیسے واقعات نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ دہشت گردی کا ناسور جس طرح پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اس سے پاکستان بھی محفوظ نہیں۔ ہمارے اردو کے افسانہ نگاروں نے حالات و واقعات کے پیش نظر اردو افسانے میں دہشت گردی کو بطور موضوع نہایت خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ اس کے علاوہ ۹/۱۱ کے سانحے پر بھی کئی افسانہ نگاروں نے بہترین افسانے تخلیق کیے جن میں الطاف فاطمہ، زاہدہ حنا، منشا یاد، خالدہ حسین، مبین مرزا، مسعود مفتی، ڈاکٹر رشید امجد، محمد حمید شاہد اور طاہرہ اقبال کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے دہشت گردی اور ۹/۱۱ کے تناظر میں جو افسانے تحریر کیے وہ درج ذیل ہیں:

بعض اوقات کچھ شخصیات اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر نہایت اہم اور معتبر مقام پر فائز ہوتی ہیں۔ **مسعود مفتی** انہی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ان کی محنت شاقہ کے ساتھ ساتھ خداداد صلاحیتوں نے ان کو شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچایا۔ انہوں نے اپنی تخلیق کے فن کے ذریعے اپنی دھرتی سے محبت کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔ وہ بیک وقت انشائیہ نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار، ریورتاژ نگار، ناول نویس اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ انہوں نے ان تمام میدانوں میں اپنی ایک خاص جگہ بنائی اور اپنے فن کی بدولت ملک گیر شہرت

حاصل کی۔ مسعود مفتی نے عالمی ادب سے پوری طرح شناسائی حاصل کی اور وہ اس کے تقاضوں سے مکمل فہم وادراک رکھتے ہیں۔اس لیے معاصر ادب میں انہیں مستند مقام حاصل ہے۔جب کہ معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں ایسی مثالیں شاذ و نادر ملتی ہیں۔ان کے ہاں حقیقت نگاری کی بے شمار غیر معمولی مثالیں ملتی ہیں کیونکہ انہوں نے اس بات کا خود اقرار کیا کہ حقیقت نگاری ان کا مسلک ہے اور یہی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسعود مفتی حقیقت نگاری کا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں اسی لیے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے موضوعات میں ارد گرد کے ماحول کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں متوسط طبقے کی مشکلات کو صفحۂ قرطاس پر لایا گیا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں دورِ حاضر میں متوسط طبقہ مسائل میں سب سے زیادہ گھرا ہوا ہے۔ معاشرے میں سب سے زیادہ دباؤ کا شکار بھی یہی طبقہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ دہشت گردی کے حوالے سے ہماری سوسائٹی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، مسعود مفتی کے افسانوں میں ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خاص کر ۹/۱۱ کے واقعہ نے سارے کا سارا سیاسی اور سماجی منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ یہ واقعہ پاکستان سے کوسوں دور رونما ہوا تھا مگر اس نے دور رس اثرات مرتب کیے۔ نہ صرف یہ واقعہ پاکستان کے حالات پر اثر انداز ہوا بلکہ اردو ادب کی سوچ کا دھارا ہی بدل گیا۔ خاص طور پر وہ ایشیائی باشندے اور پاکستانی جو عرصہ دراز سے امریکہ یا دیگر یورپی ممالک میں مقیم تھے،ان کی زندگیوں پر اس واقعے نے ان مٹ نقوش مرتب کر دیئے اور اچانک ہی سب مشکوک ہو گیا اور بے وطنی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ارکانِ اسلام کی پاسداری کرنا ہی ان کے لیے نہایت مشکل ہو گیا۔ نماز پڑھنا اور داڑھی رکھنا ان کے لیے دیگر لوگوں کی نظر میں مشکوک ہو گیا۔ان کی انہی نشانیوں سے لوگ ان کو طالبان یا پھر طالبانیت کا حامی سمجھنے لگے۔ان کے ہم پیشہ اور آس پاس کے لوگ ان کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کرنے والے لوگوں کے ساتھی سمجھتے تھے۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ امریکہ میں گزارنے کے باوجود ان لوگوں کی وفاداریوں، دوستیوں اور خدمات سے انحراف کیا جانے لگا۔ ان پر بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا لیبل لگ گیا۔

اس حوالے سے جواز جعفری لکھتے ہیں:

> "تارکینِ وطن چوں کہ ان معاشروں میں رہ رہے ہیں لہٰذا جنگ مخالف سوچ سے ان کا متاثر ہونا فطری امر ہے۔"(۳۷)

اس سارے واقعے کے رونما ہونے کے بعد لوگوں کے رویوں میں شدت کا عنصر غالب آگیا اور مقامی لوگوں کی سوچ بالکل بدل گئی۔ انتقام اور بدلے کی آگ دہکنے لگی اور جلسے، جلوس اور احتجاج برپا ہونے لگے۔ اس سب کی بھاری قیمت مسلمانوں اور پاکستانی باشندوں کو چکانی پڑی۔

ان کو ملازمتوں سے فارغ کر دیا گیا اور سب پر اسامہ بن لادن سے تعلقات کا الزام لگایا جانے لگا۔ اس طرح کے حالات میں مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس غالب آنے لگا۔ عرصہ دراز سے امریکہ میں رہنے کے باوجود اس واقعے نے اس سرزمین کو ان کے لیے دیارِ غیر بنا دیا۔ کافی لوگوں کو ملک بدر کرنے کی کوششیں کی گئیں اور بے شمار اپنے آبائی ملکوں کی طرف کوچ کر گئے۔ جو لوگ وہیں رہنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ان کے لیے ان حالات میں اجنبی لوگوں کے درمیان رہ کر اپنی بقاء اور پہچان قائم رکھنا دوبھر ہو گیا۔ یہی لوگ لاشعوری طور پر اپنے مذہب کی طرف راغب ہونے لگے اور اپنی اصلیت اور شناخت اپنے دین میں ہی تلاش کرنے لگے۔ اس تناظر میں مسعود مفتی کا افسانہ شناخت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی حالت زار بیان کی گئی ہے جن پر ۹/۱۱ کے واقعے کے غیر متوقع اثرات مرتب ہوئے اور یہ ان کی کایا کلپ کا سبب بن گئے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار خالد جس کے خیالات و افکار امریکی تہذیب و تمدن کے غماز ہیں، وہ اپنے والدین کے اصولوں سے منحرف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مذہب سے لگاؤ یا پاسداری بے معنی ہے۔ اسلام کے اصولوں اور ترجیحات کو بالائے طاق رکھ کر خالد جوزفین سے شادی کر لیتا ہے اور سماج کی تمام زنجیریں توڑ کر امریکی طرز معاشرت کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ اس کے لیے جوزفین کے سامنے تمام رشتے، ماں باپ، مذہب، تہذیب اور سماج سب ہیچ ہیں۔

وہ آزاد پنچھی کی طرح زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے اور اپنی اولاد کو بھی انہی خطوط پر پروان چڑھاتا ہے اور دین سے شناسائی نہیں کراتا تاکہ وہ بھی اپنی زندگی بغیر کسی رکاوٹ کے گزار سکیں۔ اس کے لیے مسلمان محض تمسخر اور تضحیک کے قابل ہیں۔ اسی لیے وہ مفیض نامی ایک بنگالی مسلمان کو ازراہ مذاق "مولوی" کہہ کے بلاتا ہے اور اس کا تمسخر اڑاتا ہے۔ وہ اس شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ ایسے آزاد خیال معاشرے میں بھی وہ اپنے دین اور ثقافت کی جڑوں سے پیوستہ ہے اور جن روایات کو وہ فرسودہ سمجھتا ہے۔ مفیض ان سے باقاعدہ جڑا ہوا ہے اور صوم صلوٰۃ کا پابند ہے۔ خالد کا دوست سلیم شراب و کباب کی شاموں میں اس کا ساتھی ہے مگر وہ بھی مذہب اور دین سے بے بہرہ نہیں ہے۔ اس کے لیے پاکستانی شناخت اور اسلامی روایات بھی اہم ہیں۔ خالد سے اس کی اسی موضوع پر کئی بار بحث و تکرار بھی ہوتی رہتی تھی مگر ان ساری باتوں کا کوئی حل نہ نکل

سکا۔ خالد مسجد، مندر یا چرچ کو مذہب کا پابند نہیں سمجھتا بلکہ اس کے لیے انسانیت سب سے اہم ہیں۔ مغرب میں بسنے والے پاکستانی مذہب اور روایات کے بیچ انصاف نہیں کر پا رہے تھے اور نئی نسل قدیم اور جدید رویوں کے تصادم میں اپنے پرکھوں کی تربیت سے کنارہ کش ہوتی جا رہی تھی جبکہ بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ نفسیاتی کشمکش اور تذبذب کا شکار ہو رہے تھے۔ مسعود مفتی نے اسی تصادم اور آویزش کی بہترین تصویر کشی کی ہے اور یورپ کے آزاد خیال ماحول کی عکاسی کی ہے جن میں خالد جیسے کئی آزاد خیال لوگ پرورش پا رہے ہیں۔ اس سارے روادرانہ ماحول میں زندگی اس ڈھب پر چلتے چلتے اچانک ایک عظیم سانحے کا شکار ہو جاتی ہے جس سے انسانی سوچ کے سارے دھارے ہی بدل جاتے ہیں۔

> "ایسا ہی ایک سوال ایک دن مہمل بن کر آسمان سے ٹپک پڑا۔ وہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء تھا جب ایک واقعے کی گونج نے صورِ اسرافیل کی طرح سارے عالم کو دم بخود کر دیا جس طرح طویل اور لب بستہ مظلومیت کی بے آواز کشید ایک موٹا آنسو بن کر ٹپک پڑتی ہے، اس طرح چار صدیوں کے استعمار کے خلاف خاموش شعلے بن کر نیویارک پر گرا اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی فلک بوس جڑواں عمارت سجدہ ریز ہو گئی۔"(۳۸)

۹/۱۱ کے واقعہ کو بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنا موضوع بنایا۔ مگر اس واقعے کے سیاق و سباق کو مسعود مفتی نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے مختصر الفاظ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہات اور استعارات کا بھی استعمال کیا۔ انہوں نے واقعے کو بھی نہایت چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے واقعے کے محرکات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مصنف نے گیارہ ستمبر کے واقعات بیان کرنے کے بعد خالد کی زندگی پر ان کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس واقعے کے بعد خالد کی زندگی میں ایک نیا بدلاؤ سا آجاتا ہے اور اس کے اندر کا خوابیدہ اور عرصہ دراز سے متروک تشخص دوبارہ سے نیا جنم لینے لگتا ہے۔ وہ خوابوں میں بھوتوں کی سرسراہٹ دیکھتا ہے اور تاریکی اس کو نت نئے روپ دکھاتی ہے۔ اسی تاریکی میں وہ امریکی قائدین کے ہیولوں سے ٹکراتا ہے اور اس کا ذہن مختلف اوہام کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

> "فلک شگاف دھماکہ گزر گیا۔ عالمی گونج مدھم پڑ گئی۔ مگر خالد کی انفرادی ذات میں کبھی کبھار زلزلے کے جھٹکے محسوس ہونے لگے کیوں کہ دنیا کے سیاسی ماحول اور بعض لوگوں کی کڑوی نظروں نے خالد کے اندر عدم تحفظ کے ایک نئے احساس کو جنم دیا جس

سے نہ تو عمر بھر واسطہ پڑا تھا اور نہ ہی کبھی امریکہ کے کھلے معاشرے میں اس کا امکان نظر آتا تھا۔ کبھی رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی تو یوں لگتا کہ کمرے کی تاریکی میں کسی بھوت کی سرسراہٹ ہے، یا اندھیرا گرد باد کی طرح گھوم گھوم کر نئے نئے روپ دھار رہا ہے جن میں کبھی تو آج کے امریکی لیڈروں کے خدوخال ہوتے اور کبھی ماضی بعید کی صلیبی جنگوں کے مرغولے نظر آتے۔ جیسے سینٹ برنارڈ کے شعلہ بیاں وعظ، قسطنطینیہ اور یروشلم کے بار بار سقوط، سلجوک ترکوں کے لشکر فریڈرک دوم، لوئی نہم، رچرڈ اور صلاح الدین کے ہیولے۔ مگر صبح ہوتی تو دن کی روشنی میں خالد خود ہی اپنے وہموں پر ہنستا رہتا اور سب بھول کر وہی انسان دوست خالد بن جاتا جسے اپنی روشن خیالی، روشن ضمیری اور ماڈرن بصیرت پر ناز تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ رات والا خالد غائب ہوتا گیا اور دن والا خالد غالب آتا گیا۔"(۳۹)

مسلمان ہونے کی وجہ سے خالد کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی اسے طعنے دیتی ہے کہ وہ متروک کلچر کی طرف لاشعوری طور پر مائل ہو رہا ہے۔ اس کے نماز پڑھنے پر اس پر "طالبان" ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں عدم تحفظ کا شدید احساس نمو پانے لگتا ہے۔

"یک آن میں دنیاوی عناصر بے ترتیب ہو گئے۔ استعماراتی غصے کی چنگھاڑ انتقام کی للکار اور جنگ کی یلغار نے روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زور آور قوتیں مست ہاتھیوں کی طرح خس و خاشاک کو روندنے لگیں۔ ہیجان آمیز ہذیان فضاؤں میں گونجنے لگے اور خون خرابے اور دار و گیر کے جھکڑ چلنے لگے۔ کئی ماہ تک کرہ ارض کانپتا رہا۔ اس پر رینگنے والی زندگی سہمی رہی اور بے آسرا آدم زاد پریشان رہے۔"(۴۰)

۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد حالات نے یک دم پلٹا کھایا اور ایک نئے ورلڈ آرڈر کا آغاز ہو گیا۔ نئی دنیائیں متعارف ہوئیں۔ جنہوں نے استعماری طاقتوں کے مفادات کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا۔ مسلمانوں کے افعال اور حرکات و سکنات پر سوالیہ نشان کھڑا ہو گیا۔ ان شکوک و شبہات نے تغیرات پیدا کر دیئے جن کے اثرات سیاست و تاریخ پر بھی بہت گہرے پڑے۔ انسان نے ان واقعات کا گہرا اثر قبول کیا جس سے اس کی سوچ کے زاویے ہی بدل گئے۔ اس دور میں تخلیق ہونے والے ادب نے بھی انسانی سوچ، دماغ اور نفسیات کو بدل دیا۔ جیسا کہ مسعود مفتی نے مرکزی کردار خالد کو ۹/۱۱ کے واقعے کے بعد تبدیلی کی طرف گامزن دکھایا ہے۔ خالد جو کہ ایک عیسائی عورت سے شادی کر کے اپنے مذہب، خاندان اور روایات کو تیاگ چکا تھا۔ اس کی اولاد

دین سے دور تھی۔ مگر عیسائی کلچر کی طرف راغب تھی۔ وہ ان کے سامنے قرآن پاک نکال کر رکھتا ہے اور اپنے باپ کی تصویر بھی ساتھ میں رکھتا تھا)اس تصویر کے نیچے رکھتا ہے۔یہی کتاب اس کے ذہن ودماغ Detailed History of the Crusades کتاب ہے۔ طوفان برپا کر دیتی ہے۔اور اس کے اندر سویا ہوا تشخص بیدار ہو جاتا ہے۔ جو کہ مذہب اور تاریخ پر مبنی ہے۔ مگر اس نے مذہب سے دور ہو کر سیکولزم اختیار کیا۔ جس سوسائٹی کا وہ حصہ تھا،اسی سوسائٹی کی چکاچوند نے اس کے مذہب کو فراموش کرادیا تھا مگر حالات اور بدلتے ہوئے رویوں نے دوبارہ اس کو اس کے مذہب کے قریب کر دیا۔ پاکستانی فوج کے ظلم و ستم کی داستان مفیض کے دل میں زندہ تھی۔ کیونکہ وہ بنگالی تھا۔ وہ پاکستانیوں سے نفرت کرتا تھا۔ مگر ۹/۱۱ کے واقعے نے تمام مسلمانوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف بغض اور عناد دھو کر رکھ دیا۔ وہ سب یک زبان ہو گئے۔اور ان کی بقاء بھی اسی میں مضمر تھی۔ مذہب اور قومی شناخت ان کی قربت کی بنیاد بن گئے۔ خالد بھی مفیض کے ساتھ اسی رشتے میں گندھ جاتا ہے اور دوبارہ مذہب کی طرف لوٹتا ہے اور آخر ایک دن وہ بھی مفیض کے ساتھ مسجد میں قدم رکھ دیتا ہے۔

نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> "افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے گیارہ ستمبر کے بعد کی صورتِ حال کو وہ دھچکہ قرار دیا ہے جس سے فلموں میں کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آتی ہے اور اچانک اپنے بچھڑے ہوئے چھوڑتے ہوئے دوست پھر سے آشنا لگنے لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کا وکیل بھی امریکہ ہی ہے۔ وہی امریکہ جہاں اسی واقعے کو ایک بالکل مختلف تناظر میں بھی دیکھا اور پیش کیا جا رہا تھا۔"(۴۱)

یعنی اس واقعے نے مثبت یا منفی اثرات مرتب کیے اور وہ لوگ جو کہ لادین ہو گئے تھے اور ان کے لیے تشخص کی پہچان ثانوی بات تھی۔ انہی لوگوں کو اس وقت اپنی جڑوں سے پیوست ہونے کی اشد ضرورت محسوس۔ ہوئی ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ تہذیبوں کا تصادم تھا۔ اسی احساس کو دبانے کے لیے ظلم و ستم اور خوں ریزی برپا کی گئی۔ مگر یہ احساسات دبنے کی بجائے مزید ابھرتے گئے اور رفتہ رفتہ اس نے اسی طبقہء فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا، جنہوں نے سب سے زیادہ اس سے دوری اختیار کی۔ مسجدوں میں گنجائش سے زیادہ نمازی بھرتے گئے۔ نوجوان نسل بھی اسلام کی طرف راغب ہونے لگی اور عورتوں میں حجاب کا ٹرینڈ بڑھنے لگا۔ مسعود مفتی کی آئیڈیالوجی کے بارے میں نجیبہ عارف بیان کرتی ہیں:

"گیارہ ستمبر کے واقعے کی یہ ایک اور جہت ہے جس کا تجربہ امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو ہی ہو سکتا تھا۔ یہ وہی روایتی اپروچ ہے جو مذہبی حلقے میں خاصی مقبول ثابت ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں ایک مرحلے پر "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے" کی امید پیدا ہونے لگی تھی۔ مسعود مفتی نے اسی آئیڈیالوجی کو افسانے کی بنت میں پرو دیا ہے۔"(۴۲)

۹/۱۱ کے واقعات نے اکیسویں صدی میں چلتی ہوئی عام زندگی کی ڈھب ہی بدل دی۔ افغانستان پر امریکی حملوں نے وہاں کی آبادی کو ملک بدر کر دیا۔ اپنے ملک سے موت کا خوف لے کر نکلنے والے افغانی باشندے آس پاس کے ممالک میں منتقل ہو گئے۔ زیادہ تر لوگوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں کا رخ کیا۔ زیادہ تر افغانی پناہ گزین غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ مسعود مفتی کا افسانہ "بھوک" اسی کسمپرسی کی روداد بیان کرتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ان لوگوں کی مفلوک الحالی بیان کی ہے جس میں ایک افغانی عورت جو بھوک اور فاقوں کی وجہ سے ایک کتے سے کھانا چھین لیتی ہے جو کہ ہاتھ اور بازو سے محروم تھی۔ وہ کتے کو کھانا پیش کر رہی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بات کر رہی ہوتی ہے کہ:

"آپ کو تو بھوک کا پتہ نہیں مگر مجھے پتہ ہے کہ بھوک کیا ہے؟"

گھر کی مالکن اس کو اپنے گھر کے کار پورچ میں دیکھ کر غصے کا اظہار کرتی ہے کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو، تو وہ عورت خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ وہ عورت خوف اور دہشت زدہ آنکھوں کے ساتھ اس پر گہری نظریں ڈال کر بہت ہی صاف انگریزی میں مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ

"بالکل ایسی ہی کار میرے گھر کے پورچ میں کھڑی رہتی تھی۔"

Exactly the same car used to be parked in my porch too۔"(43)

گردش ایام جب وقوع پذیر ہوتی ہے تو زندگی ایک شدید المیے اور سانحے میں داخل ہو جاتی ہے۔ لاتعداد لوگ جو کہ بالکل بے قصور ہوتے ہیں، چند قوموں یا ممالک کی حاکمیت اور اقتدار کی جنگ کا شکار بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں بھونچال برپا ہو جاتے ہیں اور خوشحالی اور آسودگی، مفلوک الحالی، اور محتاجی جیسے شدید صدمات سے مدغم ہو جاتی ہے۔ ایک قوم تو فاتح ٹھہرتی ہے اور مفتوح کے خون سے اس کی فتوحات کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور تاریخ میں ان مرنے والوں کے بارے میں کوئی جگہ نہیں ہوتی، بس قصے سنائے جاتے ہیں تو

فاتح کی کامیابیوں کے۔ مگر ادب میں ان مرنے والوں کے لیے بہت زیادہ گنجائش ہوتی ہے، تخلیق کار ان لوگوں کی ہڈ بیتی کو بیان کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے حصے میں نہ تو مال غنیمت آتا ہے، نہ ہی اقتدار کے مزے، ان کی قسمت میں صرف اور صرف موت آتی ہے اور بآسانی وہ لوگوں کی رعونت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آن کی آن میں حالات بدل جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں ہونے والی دہشت گردی کوئی ایک دن کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے موجودہ انداز کی پرورش میں ان گنت برسوں کا عرصہ محیط ہے۔ اس کے لیے بہت سے حالات کو ساز گار بنایا گیا اور بے شمار محرکات اور عوامل اس کی وقوع پذیری میں کارفرما ہوئے۔ مگر ۹/۱۱ کے واقعہ کو اس کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ دہشت گردی انسانی فطرت کا ایک متشدد پہلو ہے جو کہ ابتدائے زمانہ سے انسان کی شخصیت کا خاصہ رہا ہے۔ مسعود مفتی نے ہر مرحلے پر دہشت گردی کی صنف خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ریاستی ہو یا پھر گروہی، اس کی مزاحمت و مخالفت میں بہت کچھ لکھا۔

ان کے افسانہ "قیامت" کا اسلوب روایتی اندازِ بیان سے ہٹ کر انشائیے کی سطح تک جا پہنچتا ہے جبکہ عام طور پر انہوں نے اپنے بیانیے کو ٹھوس واقعاتی حقائق پر استوار کیا ہے۔ اس افسانے کی کہانی تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ جو کہ "وقت" اپنے اور غیر "ہیں۔ اپنے سے مراد اہلِ اسلام ہیں جبکہ "غیر" سے مراد اہلِ مغرب ہیں۔ اپنے (اہلِ اسلام) غیروں (اہلِ مغرب) سے مرعوب بھی ہیں اور ان کے استحصال کا شکار بھی ہو رہے ہیں۔ تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی گزرا تھا جب غیر اپنوں کی روشنی سے مستفید ہوئے تھے۔ اسی مستعار روشنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے کائنات کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ اسلام کے سنہرے اصول یعنی برابری اور عدل و انصاف پر عمل پیرا ہو کر ترقی ان کا مقدر بنی۔ انہوں نے خود شناسی پر یقین رکھا اور یہی ان کی کامیابی اور آگہی کی کنجی بن گیا۔ اس کے برعکس اپنوں نے اسلام کے اصولوں کے منافی چلنا شروع کر دیا اور اسلام کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر طبقہ بندی میں منقسم ہو گئے۔ جو لوگ دوسرے لوگوں سے اوپر تھے، انہوں نے اپنے سے نیچے والوں کو راضی بہ رضا رہنے اور اپنی تقدیر پر اکتفا کرنے کا درس دینا شروع کر دیا اور اسی چیز نے نچلے طبقے والوں کو گڑھے میں دھکیل دیا کیوں کہ ان کے سامنے اگلی دنیا کے خوبصورت تصورات اور انعامات کا لالچ تھا۔ ان کا حال اس لیے اہم نہ رہا۔ اسی بات کا غیروں نے فائدہ اٹھا کر نئی ایجادات اور ہتھیاروں کے ذریعے چت کر دیا اور اپنا غلام بنانے کے لیے منصوبہ بندی اختیار کر لی اور اس سارے امر میں انہوں نے اپنے سے اوپر والے طبقے کے لوگوں سے مدد طلب کی اور نچلے لوگوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ اس ہلاکت کی بارش میں لاکھوں لوگ موت کی وادی میں جا بسے۔ ان مرنے والوں کی روحوں

نے عالم برزخ میں عزرائیل سے جھگڑا شروع کر دیا۔ مگر عزرائیل کو ان کی معصومیت پر بہت ہنسی آئی۔ جس پر مرنے والے لوگوں کی روحیں بہت شرمندہ ہوئیں اور حیرت اور تاسف میں ڈوب کر عاد و ثمود کی قوموں، اور قوم نوح اور اہل مدین کی بکھری ہڈیوں کے ڈھیر پر سوئے ہوئے عزرائیلؑ کو بے بسی سے دیکھتی رہیں۔ اس کہانی میں دراصل تاریخ کا تجزیہ اور تجربہ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں انسانیت کے دو طبقے فرض کیے گئے ہیں۔ یہ ایک روایتی نقطۂ نظر دورِ حاضر میں کافی مشہور و مقبول ہے۔ مسعود مفتی نے کہانی کی نسبت اسی نقطۂ نظر پر ہی استوار کی ہے اور اس کو بیان کرنے میں وہ غیر جانبدار ہو کر دونوں طاقتوں کے خیر و شر اور نیک و بد کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا اصل مدعا مسلمانوں کی کمزوریوں پر ہی مرکوز رہا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سبب بھی ان سے اوپر کا طبقہ ہی ہے جس کی کم عقلی اور کمزور حکمتِ عملی کی وجہ سے امتِ مسلمہ کو پسپائی کے گڑھے میں جانا پڑ رہا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار کی آئیڈیالوجی غالب نظر آتی ہے۔ جس میں جابجا تبصرے ملتے ہیں جس کی وجہ سے کہانی میں کہیں کہیں جھول نظر آتا ہے۔

الطاف فاطمہ کا افسانہ "دیدوادید" بغداد میں جاری گزشتہ دو عشروں کے حالات عروس البلاد بغداد کا عکس دکھاتا ہے۔ سرزمین عراق انبیائے کرام سے آباد رہی ہے۔ حضرت علی اور حضرت حسین اور اہلِ بیت کے علاوہ سات امام بھی یہیں مدفون ہیں۔ حضرت آدمؑ اور اماں حواؑ کا باغ بھی یہیں پایا جاتا ہے۔ چھ ہزار سال تک سنہری تاریخ بھی اسی سرزمین میں پروان چڑھی تھی۔ اس کے متعلق ضمیر نیازی لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر سیموئیل کریمر نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے تاریخ سمیریا سے شروع ہوتی ہے۔" اس میں سمیریا کے ستائیس پہلے قدم گنوائے گئے ہیں، جن کا تعلق قانون، اخلاقیات، ادب، طب اور زراعت سے ہے۔ اسی تہذیب نے دن کو ۲۴ گھنٹوں، گھنٹے کو ۶۰ منٹوں میں اور دائرے کو ۳۶۰ ڈگری میں تقسیم کیا۔ فلپ کی مرتب کردہ کتاب عالمی تاریخ، لوگ تاریخیں، واقعات میں زمانہ قبل مسیح کی ایجادات اور کارناموں کی فہرست درج ہے جو میسوپوٹیما کے باشندوں کے ہاتھوں انجام پائے۔"(۴۴)

الغرض یہ علاقہ انسانی تمدن کے بانیوں میں اول اول ہے۔ کائنات کی ترقی اور بنیادی سہولتوں کا ارتقاء اسی سرزمین سے ہوا۔ انسان نے زندگی گزارنے کے طریقے مثلاً ہل جوتنا، اینٹ کے مکان اور چاک کے برتن بنانا سیکھے۔ پیسہ بھی یہیں ایجاد ہوا۔ ہارون الرشید کے "عروس البلاد" کو بغداد کا نام دیا گیا۔ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں۔

"بغداد ایک ایسا شہر ہے، جس کا مقدر بار بار اجاڑ دینا قرار پایا ہے۔ اسے آلِ عباس نے کتنے ارمانوں اور چاؤ سے آباد کیا۔ دلہن کی طرح ایسا سجایا کہ تاریخِ عالم میں عروس البلاد کا نام پایا۔"(۴۵)

بم دھماکوں اور خود کش حملوں نے اس کو کھنڈر بنا کر رکھ دیا ہے۔ افسانہ نگار نے ایک پاکستانی صحافی ہارون الرشید کی کہانی سنائی ہے جو اپنی پرانی ہم جماعت سے بہت عرصہ بعد ملتا ہے۔ حلیمہ تعلیم حاصل کرنے پاکستان آئی تھی۔ اس دور میں عراق پر امریکہ نے پابندیاں لگائی ہوئی تھیں اور شدید بمباری کی جاتی تھی۔ ملکی حالات خراب ہونے کے باعث عراق کے بہت سے طالب علم حصول علم کے لیے پاکستان میں مقیم ہو گئے ۔ جن میں حلیمہ بھی تھی۔ امریکہ نے جب عراق کو دوسری بار جارحیت کا نشانہ بنایا تو ہارون الرشید کی حلیمہ سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ پہلی جنگ میں اس نے اپنے ماں باپ اور بہت سے عزیزوں کے نذرانے پیش کیے تھے اور اس دفعہ اس نے اپنا شوہر اور اپنی اولاد کھوئی تھی۔ حالات نے اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور طبیعت کا چلبلا پن چھین لیا تھا۔ ہارون اس کے اس روپ کو دیکھ کر بہت حیران ہو جاتا ہے۔ اس کو اس طرح گھمبیر باتیں کرتا دیکھ کر وہ حیرت کا اظہار کرتا ہے تو حلیمہ جواب دیتی ہے کہ :

"ہاں ہارون ! کبھی کبھی سانحے اور حادثے انسان کے ہوش اڑا دیتے ہیں اور کبھی کبھی اس کو ہوش مند بھی بنا دیتے ہیں، مجھ پر اتنا کچھ گزر گیا ہے اور میں نے اتنا کچھ دیکھ لیا ہے کہ میرے ہوش اڑنے کے بجائے اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں، کچھ زیادہ ہی درست ہو گئے ہیں۔"(۴۶)

یہ افسانہ دل سوزی اور تاثر سے بھرپور ہے۔ ۹/۱۱ کے موضوع کو بیان کرنے کے لیے زیادہ تر افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کا انتخاب کیا کیوں کہ ناحق اور بگاڑ کی صورت حال کو علامتی انداز میں بیان کرنے سے حق اور راست بازی کا جذبہ مبہم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر تحریکوں اور محاذوں پر لکھا جانے والا ادب، اسلوب حقیقت نگاری کی طرف راغب تھا۔ بلکہ اسے روزنامچے، رپورتاژ کی ہیت میں پیش کیا گیا۔ کیوں یہ تو برحق ہے کہ حقیقت اس قدر تحیر انگیز ہوتی ہے کہ اسے کسی بھی تجریدی یا علامتی پیرائے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ الطاف فاطمہ نے عالمی طاقتوں کے گھناؤنے چہرے کو جس نفاست سے دکھایا ہے وہ قابلِ دید ہے۔ انہوں نے عالمی طاقتوں کے تسلط اور اختیارات سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ اگر وہ طاقتیں کسی کے خلاف محاذ آرائی کا فیصلہ کر لیں تو پھر کسی کو ان کے سامنے پر مارنے کی بھی اجازت نہیں رہتی۔ یہی قوتیں

انسانوں کی زندگیوں کو نگل جاتی ہیں مگر ان سے اس بارے میں کوئی بھی پوچھنے والا نہیں۔ مصنفہ نے عراق کی لرزہ خیز کہانی شہر زاد کی زبانی جس قرینے سے بیان کی ہے وہ باکمال ہے۔ امریکہ نے جس طرح شہر عراق کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آسودگی کسی بھی شخص کا مقدر نہیں ٹھہری تھی۔ ساری عمارتیں تباہ ہوگئی تھیں اور تقریباً سارے گھروں میں موت کا ماتم ہو چکا تھا۔ اس سارے پس منظر میں اس شہر کا تابناک ماضی بھی جھلک رہا تھا۔ الطاف فاطمہ نے "دیدوادید" میں ماضی اور حال کا تقابل کر کے افسانے میں المیہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مثلاً اختتامی پیرا گراف ملاحظہ ہو:

> "میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا سامنے گرد و غبار سے اٹے راستوں اور عمارتوں کے کھنڈروں کے درمیان وہ چلی جا رہی تھی۔ ایک شکستہ روح کی طرح۔ میں نے آج تک اتنی شکستہ عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر بلند آواز سے کہا "فی امان اللہ بغداد کی نئی شہر زاد۔"(۴۷)

الطاف فاطمہ نے اس افسانے میں دراصل وقت کی گردش پر روشنی ڈالی ہے۔ جس سے ایک تابناک ماضی سے مزین شہر میں جس طرح حالات نے پلٹا کھایا اور ۹/۱۱ کے بعد اسی شہر میں روشن عمارتیں کھنڈرات میں بدل گئیں اور آن کی آن میں درخشاں ماضی، وقت کی دھول میں دھندلا کر گرد و غبار اور شکستگی سے لیس حال میں تبدیل ہو گیا شاید اسی کو گردش ایام کہا جاتا ہے۔

خالدہ حسین اردو کی پہلی خاتون تجریدی افسانہ نگار ہیں۔ ان کا شمار اردو کی ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا منفرد اسلوب ہی ان کی پہچان کا باعث بنا۔ ان کے افسانے بالغ عصری شعور سے لبریز ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں لکھنے والے زیادہ تر لوگ جدت پسندی کی دوڑ میں پٹڑی سے اتر گئے۔ مگر خالدہ حسین ایک مخصوص تخلیقی جواز کے تحت افسانے تخلیق کر رہی ہیں۔ ان کے ہاں افسانوی منظر نامے میں ایک خاص قسم کے تجسس سے فضا مزید رنگین ہو جاتی ہے اور وہ ایک حد تک اپنی ذات کو افسانے کی کہانی میں داخل کرتی ہیں۔ بلاضرورت وہ خود سے آگے نہیں بڑھتیں۔ یہی بات ان کے متن میں جان پیدا کر دیتی ہے اور ان کا متن جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کا یہی کمال ہے کہ وہ مشکل سے مشکل بات بھی انتہائی چابکدستی سے کہہ جاتی ہیں۔ ان کے افسانے پیغام کی داخلی لہر سے روشناس نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا مدعا بآسانی قاری تک پہنچ جاتا ہے۔ انہیں اپنی بات کو طبعی اور فطری طرز میں پیش کرنے کا فن آتا ہے اور یہی ان کا ملکہ ہے۔ تیکنیکی سطح پر ان کے افسانے میں استعارہ، علامت و تجرید کا استعمال معنویت کے کئی جہان منصہ شہود پر لاتا ہے۔

۹/۱۱ کے بعد "دہشت گردی" جیسے موضوع نے سارے عالمی منظر نامے کو لپیٹ میں لے لیا اور سارے سیاسی، عالمی اور معاشرتی سسٹم کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اسی سے ہی پورا عالمی ادبی منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ اس تبدیلی نے نہ صرف اہلِ مغرب کے ہاں قدم جمائے بلکہ اردو ادب میں بھی بہت سے ادیبوں نے اس کے اثرات قبول کیے۔ دہشت گردی پوری انسانیت کا سنگین مسئلہ ہے جس پر خطۂ ارض کے تمام ادیبوں نے قلم اٹھایا۔ اس دہشت گردی اور جنگوں کے متعلق بہت سے لکھاریوں نے کافی کچھ لکھا۔ عراق اور افغان جنگ کے بعد ہمارے ہاں دہشت گردی کا طوفان برپا ہو چکا ہے۔ جس نے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی سطح پر انسانوں کی سوچ کو تبدیل کر دیا ہے۔ تخلیق کاروں کے ہاں دہشت گردی کے موضوع پر جو قابلِ قدر سرمایہ موجود ہے ان میں خالدہ حسین کا افسانہ "ابنِ آدم" قابلِ ذکر ہے۔ "ابنِ آدم" دراصل امریکہ اور عراق کے درمیان ہونے والی جنگ کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ مگر خالدہ حسین نے نہایت فن کاری سے اسے ایسی آفاقیت سے نوازا ہے کہ یہ کہانی کسی ایک مخصوص خطے، فرد اور قوم، ملک تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ کل کائنات اور انسانیت کی کہانی بن کر ابھرتی ہے۔

افسانے میں پراسراریت کی فضا پائی جاتی ہے۔ کہانی کی بنت اس طرح کی گئی ہے کہ قاری مکمل طور پر اس کی پر تجسس فضا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ خالدہ حسین کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ لطیف جذبات کو چھوٹے حسی تجربات میں سے کشید کر لیتی ہیں اور خوب صورت احساسات کے ذریعے کہانی کو متحرک کر دیتی ہیں۔ کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کی کہانی میں تیزی سے بہتا ہوا دھارا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جس میں ان گنت حالات و واقعات رونما ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے پیدا ہونے والے یقین اور بے یقینی کی فضا کو دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

> "ہیلی کاپٹر کا جسیم پنکھا ابھی بند نہیں ہوا تھا اور چاروں سمت ریت اڑ رہی تھی اور شاید اس پنکھے کے بند ہونے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔ مگر نہیں، ہو سکتا ہے یہ رک چکا ہو اور وہ اسے چلتا ہوا دیکھ رہا ہو کیوں کہ اب واقعات مسلسل ہوتے رہتے تھے۔ جیسے آنکھ پر کسی شے کی منفی تصویر بہت دیر تک جمی رہ جائے۔ اس وقت اس نے اپنی آنکھیں ملیں، ان میں چنگاریاں بھری تھیں، اس کی ہتھیلی پر اور انگلیوں کے درمیان اور ناخنوں میں اور ناک اور کانوں میں ہر کہیں ریت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں، سنگین خشکی ہر طرف اتنی

تھی اور سب کچھ چٹخنے کے قریب تھا۔اس نے بھاری جوتوں میں اپنے پاؤں کی انگلیوں کو سکیڑا۔وہاں چپچپاتی نمی تھی۔عفونت پاؤں سے اٹھی،اس کے گلے میں آن رکی۔"(۴۸)

بظاہر اس کہانی میں کسی جہادی تنظیم کے چند مجاہدوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جو کہ گرفتار ہو گئے تھے۔ مگر در حقیقت اس میں قابض فوج کے پر آشوب رویے کو طنز و تشینع کا نشانہ بنایا گیا ہے۔افسانہ نگار نے قابض فوج کے پس پشت سر گرم محرکات کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کر دیا ہے جس کو قاری اپنی روح میں سرایت کرتا محسوس کرتا ہے:

"آخر یہاں پر ایسا کیا مسئلہ پیش آگیا ہے؟ماہر نے منہ میں سگریٹ دبائے دبائے کہا۔ہم اس کمبخت نحوست مارے ریگستان میں اس لیے تو خوار نہیں ہو رہے کہ یہ حشرات الارض ہمیں پاگل کر دیں۔کچھ ہے کوئی بڑی پر اسرار شیطانی قوت جوان کے اندر مرتی نہیں۔ہم جو خواب دیکھتے ہیں نا کہ آدمی مر کے بھی نہیں مرتا،چند ثانیے مرنے کے بعد پھر اچھا بھلا اٹھ بیٹھتا ہے اور گلا دبانے کو ہمارا پیچھا کرتا ہے تو یہ اس ریگستان کا نائٹ میئر ہے۔"(۴۹)

مطلب جو فوج اس خطے پر مسلط ہے وہاں پر بسنے والے لوگ اس کی نظر میں کیڑے مکوڑوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں، در پردہ اس سوچ کی عکاسی کرتی ہے جو عالمی طاقتوں کے ذہنوں میں پل رہی ہوتی ہے۔ یہ طاقتیں اپنے قبضے میں پائے گئے انسانوں کو انسان نہیں سمجھتیں۔جنگ سے پیدا ہونے والا سانحہ اور انسانی المیہ ہی دراصل اس افسانے کا موضوع ہے۔انسانی زندگیاں جنگ و جدل کے بعد جن بحرانوں کا شکار ہوئیں اور جنگی جبر و استبداد کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال سے جو اتار چڑھاؤ کی سی کیفیت در پیش آئی،اس کو افسانہ نگار نے اپنی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔سارا افسانہ اپنے اندر الگ الگ دنیا بسائے ہوئے ہے۔مثلاً امین کو لالچ،خود غرضی اور حرص و ہوس کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔اس کی نظر میں اپنے کچھ نہیں۔بلکہ اس کے بر عکس وہ اس پر دو شمنوں کا آلۂ کار بننے کو فوقیت دیتا ہے۔امین جیسے لوگوں سے آج بھی سوسائٹی بھری پڑی ہے۔

"ابو حمزہ! مجھے تم پر حیرت ہوتی ہے۔اس قدر توہم پرست ہو۔ڈاکٹر ہو کر بھی تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو۔یہ کچھ بھی نہیں۔ساری دنیا معصوم لوگوں کے خون سے لبریز ہے۔انسانی تاریخ ہے ہی یہی کچھ، کس کس نے بد دعا دی ہو گی اور یہ دعا بد دعا آخر ہے ہی کیا۔"(۵۰)

امین کی نظر میں جسمانی آرام و آسائش اور مانگے ہوئے چند ٹکڑے درد اور غم کا مطلب ہی بدل دیتے ہیں۔

"وہ لمحہ عجیب تھا۔ یقیناً کھال کا ادھڑنا، ناخن کا اکھڑنا اور نازک مقامات کو کچلا جانا بہت غیر ضروری ہے۔ یقیناً تروتازہ روٹی اور جسم کی آسائش بہت ضروری ہے، سب سے ضروری۔"(۵۱)

امین کی گھٹیا سوچ اس کو ذلت کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے اور زندگی سے وابستہ تمام تصورات فقط تصورات ہی رہ جاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے انسانی نفسیات کو اس طرح پرکھا ہے جیسے کوئی ماہر نفسیات پرکھتا ہے۔ اس افسانہ کا موضوع نہایت جاندار ہے جس میں جنگی جبر اور اس کے آس پاس کیا جانے والا ظلم حب الوطنی پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی نظر میں معصوم لوگوں سے ہمدردی اور ان کی خاطر جاں نثاری ہی اولین حیثیت رکھتا ہے۔ مگر سب سے متحرک اور جاندار امیر حمزہ ہے جس کے لیے جھکنا تو ناممکن ہے مگر وہ اس سے بہتر موت کو ترجیح دیتا ہے۔

"ابو حمزہ اس روز اپنے آپ کو خودکش حملے کی لیے تیار کر رہا تھا۔ لیلیٰ اور قدوس بھی وہیں تھے۔ وہ اس تباہ شدہ عمارت کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں تھے جو ملبے میں گھری نظروں سے اوجھل تھی۔ اس روز وہ بڑی مشکل سے روٹی کے چند پھپھوندی لگے ٹکڑے کوڑے کے ڈھیر پر چن کر لایا تھا۔ وہاں سب اپنے اپنے ٹکڑے ٹھونسنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ ابو حمزہ نے پھپھوندی لگی روٹی کی ایک چٹکی منہ میں ڈالی اور اسے ابکائی آگئی۔ اس میں تمام بیکٹیریا بھرے ہیں۔ اس سے مرنے سے بہتر ہے کہ آدمی بہتر موت کا انتخاب کرے۔"(۵۲)

امیر حمزہ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہے اور اخلاق کی بلند ترین سطح پر مزین نظر آتا ہے۔ حالات و واقعات اور معاشرے کی بدلتی صورت حال بھی اس کی سوچ کو بدل نہیں سکتی۔ اس پر ہر طرح کے مظالم کیے جاتے ہیں۔ مگر وہ جھکتا نہیں۔ وہ کوئی راز فاش نہیں کرتا۔ نہ ہی رحم کی بھیک مانگتا ہے۔ اس کا آہنی عزم و استقلال آفاقی علامت بن جاتا ہے۔ اسی کے دم سے افسانے کا پورا ڈسکورس ایک گہرے تخلیقی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ ماہر اس کو ہر طرح سے ورغلا اور دھمکاتا ہے کہ:

"آدمیت ختم کرنا بھی ایک ہنر ہے اور جب تک تم آدمیت ختم نہ کرو گے، کمزور سے کمزور بھی تمہیں تنگ کرتا رہے گا۔ تمہارا جینا حرام کر دے گا، دیوانہ کر دے گا۔"(۵۳)

یہ افسانہ اسی سوچ پر ایک کاری ضرب ہے اور افسانہ نگار نے یہ سب ایک فوجی کی زبان سے کہلوا کر قاری کو مبہوت کر دیا ہے۔ اسی ایک جملے سے آج کے انسان کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے۔

افسانے میں پاکستانی معاشرت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ عراق اور فلسطین کے مسلم مجاہدین کا غالب تاثر ملتا ہے لیکن ابو حمزہ، لیلیٰ، امین اور قدوس کسی خطے میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ مگر ایک بات قدرے مختلف ہے کہ وہ حملہ آور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جو ان کے عراقی یا فلسطینی ہونے کی طرف زیادہ شبہ دیتے ہیں کیوں کہ پاکستانی یونیورسٹیوں اور مغرب کے تعلیم یافتہ لوگوں میں فی الحال یہ رجحان پروان چڑھا۔ علاوہ ازیں اس افسانے میں خود کش حملہ آوروں کے بارے میں جس طرح کے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ ان کی پاکستان میں کسی صورت حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ ان حملہ آوروں میں حالات کے پیش نظر جان کی بازی لگا دینے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ جذبہ پاکستان میں بھی کئی لوگوں میں موجود ہے جو کہ ان کو شدت پسندی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ جیلوں میں ان لوگوں سے انسانیت سوز برتاؤ کیا جاتا ہے جو کہ انتہائی ہتک آمیز ہوتا ہے۔ یہی سلوک انسانیت کی تذلیل کا سبب بنتا ہے اور انسانیت کے لطیف جذبات کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے۔ ان مظالم کو دیکھ کر روح کانپ جاتی ہے۔ افسانے کا تھیم دراصل یہی ہے۔ انسان اقتدار کے نشے میں اور طاقت کے بل بوتے پر دوسرے انسانوں سے بے رحمی اور ظلم و ستم کے رستے پر چل پڑتا ہے۔ اس کی بے بسی اور لاچاری بعض اوقات اس کا سب سے بڑا ہتھیار بن جاتا ہے۔ وہ بآسانی تمام قید و بند کی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کر لیتا ہے اور چٹان کی طرح اس کا حوصلہ مضبوط بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے نہایت مؤثر انداز میں موضوع کو بیانیے کی صورت میں ڈھالا ہے۔ اس طرح بیانیے کا حقیقی مطلب و مقصد اجاگر ہوتا ہے کیوں کہ اس میں کوئی اضافی جملہ یا تبصرہ نہیں موجود نہیں اور کہانی راوی کی غیر ضروری مداخلت کے بغیر واقعات کا ربط و تسلسل مکمل ابلاغ پیش کرتا ہے۔ یہی خالدہ حسین کا کمال ہے۔

خالدہ حسین کا دوسرا افسانہ "جزیرہ" گوانتاناموبے کی جیلوں اور عقوبت خانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس افسانے میں "جزیرہ" بطورِ علامت ان قیدیوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کو ۹/۱۱ کے بعد قید کر لیا گیا اور دہشت گردی کے الزام میں انہیں جیتے جی عقوبت خانے میں بند کر دیا جہاں زندگی کا احساس بھی ناپید تھا۔ اس افسانے میں مصنفہ نے حالات و واقعات کی بہترین منظر کشی کی ہے اور قیدیوں پر ہونے والی خوفناک اذیتوں کا ذکر کیا ہے۔ جب عراق کو امریکہ نے تابڑ توڑ حملوں میں پسپا کر دیا تو اس کے بعد اہلِ عراق کی زندگی جیتی جاگتی جہنم بنا کر رکھ دی۔ ان معصوم لوگوں کو جیلوں میں ڈال کر قید کر لیا گیا۔ ان جیلوں اور عقوبت خانوں

کے تذکرے کے ساتھ ہی حالات و واقعات کی صعوبت اور تکلیف مکمل آشکار ہو جاتی ہے۔ انسانوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بد تر سلوک کی مثالیں انہیں عقوبت خانوں میں ملتی ہیں۔ لوگوں کے لیے زندگی تو محض نام کی تھی مگر جیتے جاگتے انسان امریکیوں کی رعونت کا شکار ہو کر رہ گئے جس سے انسانیت کانپ جاتی ہے۔ ان کے لیے زندگی اتنی تنگ کر دی گئی کہ وہ موت کو ترجیح دینے لگے۔ موت کے نت نئے طریقے ایجاد کیے گیے۔ افسانہ نگار لکھتی ہیں:

> "مگر وقت اس سے بھی آگے نکل چکا ہے اور نئی جدید ترین ایجادات کے بارے میں میری معلومات بہت محدود ہیں، مگر یہ انسان کو اس کی نوع سے الگ کر دینا بالکل تنہا، یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بھی الگ کر دینا، یہ بھی ایک غیر معمولی ایجاد ہے، اس سے آدمی زندہ رہتا بھی ہے اور نہیں بھی، سناٹے کے سمندر کا ایک جزیرہ۔"(۵۴)

وہ جزیرہ جس کے چاروں اطراف میں خشکی ہی خشکی ہے۔ مگر ظلم اور بربریت میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس سرزمین پر انسانیت کو تڑپا دینے والے مظالم کیے جاتے ہیں۔ امریکیوں کا رائج کردہ طریقہ جس میں انا کو ختم کر دیا جائے۔

اردو افسانے میں قید و بند کی صعوبتوں اور جیلوں میں ہونے والے ہوش ربا مظالم کی کئی داستانیں رقم ہوتی آئی ہیں۔ اور بہت سے افسانہ نگاروں نے بطورِ موضوع ان اذیت ناکیوں کا ذکر کیا ہے۔ تیسری دنیا میں غیر انسانی سلوک اور قیدیوں کے ساتھ انسانیت سوز مظالم، اور ان کے حقوق کی سلبی و پامالی، ان کے ساتھ حد درجہ پر تشدد رویہ اور من مرضی کے بیانات دلوانا ایک عام معمول ہیں۔ امریکی فوج نے جبر و تشدد کے جو طریقے ایجاد کیے ان کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا ایک ظالم و جابر بھی ان حربوں کو دیکھ کر کانپ جاتا ہے۔ ان کی ان ایجادات کو خالدہ حسین نے سپر پاور امریکہ کی طرح اولیت اور ارفعیت کے درجے پر رکھا ہے۔

اردو افسانے میں **منشایاد** کا نام بہت ہی معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی کہانیاں بہت ہی انوکھی اور شرفِ انسانی کی بحالی میں ڈوبی ہوئی ہیں جو ان کو ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں نہ صرف ممتاز و محترم کرتی ہیں بلکہ انہیں اردو افسانے کی دنیا میں بلند مرتبہ پر بھی فائز کرتی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں دنیائے افسانہ میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ جس کی مثال اس دور کے عالمی ادب میں بمشکل ہی ملتی ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں لاطینی امریکہ میں لکھا گیا افسانہ بے مثال ہے۔ مگر جدیدیت کی دوڑ میں اردو افسانہ پٹڑی سے اتر گیا تھا۔ منشایاد نے اس دور میں اردو افسانے کی باگ دور اپنے ہاتھ میں تھامی۔ انہوں نے علامت کو بہترین انداز میں استعمال کیا ہے۔

ان کے ہاں موضوع اور ہیت کا خوبصورت امتزاج اور توازن ملتا ہے۔ یہی بات ان کے اسلوب کو بھی انفرادیت بخشی ہے۔ ان کی کہانیوں میں اسلوب جدید سے جدید تر ہونے کے باوجود بھی اپنی زمین اور ماحول میں رچا بسا ہے۔ ان کے ہاں حقیقت نگاری کا عنصر بھی نمایاں ہے اور کہانی پن ان کے اسلوب کی خاص پہچان ہے۔

جب امریکہ نے جنگ و جدل کا بازار گرم کیا تو نوجوانوں کے ذہنوں میں مذہبی جنون پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے اندر شہادت حاصل کرنے کی طلب کو فزوں تر کیا گیا اور انسانی معراج اور فنا کے لیے شہادت کا فلسفہ ذہن نشین کرایا گیا۔ اس سب میں امریکہ نے ان کو اپنے مقاصد کے لیے خود استعمال کیا اور بعد میں وہی امریکہ ان نوجوانوں کا دشمن بن گیا۔ وہ لوگ مختلف قوتوں کے ہاتھ کا کھلونا بن کر رہ گئے جنہوں نے انہیں جنت اور حوروں کے حصول کے لیے جنگ اور جہاد کا تصور پیش کیا۔

اس سلسلے میں منشایاد کا افسانہ "پھندا" قابل ذکر ہے۔ جس میں اسی دھوکے اور رائیگانی کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے افسانے میں نوجوان نسل کی برین واشنگ کے ذریعے ان کے جذبات کو بھڑکا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے سارے فعل کو پیش کیا ہے۔ ان کے مذہبی پیشواؤں کے اثر و رسوخ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک قسم کا ٹریننگ سینٹر ہے جس میں بہت سے درجے اور مقامات ہیں۔ افسانے کا ہیرو جب تمام درجات کو طے کر لیتا ہے اور کامیابی سے ہر منزل سے گزر جاتا ہے تو اس کے پیشوا شاہ صاحب اسے آخری سند سے مستفید کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں:

> "تم سب اس مقدس تنظیم کے ستون ہو۔ ایک نئے آسمان کے آفتاب و ماہتاب ہو۔ تم چنے گئے ہو۔ تم ساری دنیا پر چھا سکتے ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایمان کی پختگی عقیدے کی سچائی اور عزم مصمم نے چند افراد کو دوسروں پر غلبہ عطا کیا۔ تم وہ نڈر صالح اور شجاع ہو، سمٹ کر پہاڑ جن کی ہیبت سے رائی۔ لاریب تم پرچم لے کر اٹھو گے تو بحر و بر باطل سے پاک کر دو گے۔"(۵۵)

اس ٹریننگ سینٹر کے تمام فارغ التحصیل نوجوان اپنے لیڈر کے فرمان کے منتظر تھے۔ ان کے دلوں میں ایک عجیب سی بے قراری تھی اور وہ بے صبری سے شاہ صاحب کے حکم کے انتظار میں پل پل گزار رہے تھے کہ وہ کونسی ساعت ہو گی جب ان کے لیے شہادت پانے کا حکم نامہ جاری کیا جائے گا۔ مگر یہ عظیم جذبہ بھی فرقہ پرستی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔

"اسے یاد آیا اتنے اچھے اچھے توانا ہاتھوں میں آپ کو اس کا حقیر ہاتھ پسند آیا اور عظمت اس کا مقدر ہوئی۔ اس کے ہم جلیسوں نے اس کے بخت پر رشک کیا۔ اسے ہدیۂ تبریک پیش کیا۔"(۵۶)

مصنف نے افسانے میں مذہبی اور سماجی صورت حال کو بیان کیا ہے اور استحصالی صورت حال کی بھی بہترین ترجمانی کی ہے۔ شاہ صاحب اسے ٹارگٹ کلنگ کا فرض سونپتے ہیں۔ اس کو اشتہارات کی مقبولیت کی پیشگی نوید بھی سنادی جاتی ہے۔ جس کی خوشی میں وہ بآسانی پھانسی کے پھندے پر لٹک جاتا ہے۔ کال کوٹھری میں اسے حوروں کی قربت محسوس ہوتی ہے اور خواب میں دودھ کی نہریں اور انگور کے مشروبات دکھائی دیتے ہیں اور اسی خوشی اور سرشاری میں تختہ دار کی طرف گامزن ہوتا ہے تو اس کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے میراث پالی ہو اور جنت کی طرف وہ بڑھ رہا ہو۔ مگر اسی اثنا میں اس پر حقیقت کے سارے در وا ہو جاتے ہیں اور اس کے روحانی پیشوا شاہ صاحب کا اصلی روپ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہی لیڈر جو ان سب کو کافروں کے خلاف تیار کر کے ان کے دلوں میں جذبۂ شہادت بیدار کرتے رہے تھے، آج انہی کے ساتھ معاہدے کر کے سودے بازی کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے ہی ان کافروں پر فتوے جاری کیے تھے اور واجب القتل قرار دیا تھا۔ اس افسانے میں قاری ششدر رہ جاتا ہے جب اس میں لوگوں کی اصلیت اور ان کے مقاصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول اور سیاسی مکر کے لیے ایک عظیم قربانی کو پیش کیا گیا ہے۔ دنیاوی مقاصد اور دھوکے کے احساس کا تصور، ندامت اور شرمندگی کا احساس پیدا کر دیتا ہے کہ کس طرح بے لوث جذبۂ ایمانی، سادگی اور روحانی عقیدت و احترام کو ناجائز طریقے سے استعمال کر کے انسانیت کے ساتھ گھناؤنا کھیل کھیلا جاتا ہے جو کہ ناقابل فراموش ہے۔

منشا یاد کا ایک اور افسانہ "سائیکلو سٹائل وصیت نامہ" متوسط طبقے کے ذہنی و فکری، روحانی اور معاشی استحصال اور مختلف جہادی تنظیموں اور نیٹ ورکس کے شدت پسندانہ رویوں پر لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ شہیدوں اور غازیوں کو بنانے والے مختلف محرکات میں بہت حد تک مذہبی وابستگی کا عمل دخل ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور معاشرتی صورتِ حال بھی کارفرما ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کی کس طرح غربت و افلاس کا شکار نچلے طبقے کا عام سا نوجوان ظلمت کے بادلوں میں گھر کر انتہا پسند مجاہد میں بدل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی کا باسی ہے جہاں نہ تو کوئی خواب ہے اور نہ کوئی مستقبل۔ یہی زندگی ایک ایسی آس کے سامنے کم مایہ لگتی ہے جو کائنات کی سب سے بڑی طاقت اور عظیم ہستی کی قربت کی خواہش اور خوشنودی کی نوید سنائی ہے جو کہ دائمی

راحت اور سکون کا پیغام لاتی ہے۔ یہ افسانہ واحد متکلم کے صیغہ میں لکھا گیا ہے اور یہ اس دور کی ترجمانی کرتا ہے۔ جب جہادیوں کو امریکہ اور فوجی جرنیلوں نے قصور وار ٹھہرایا ان کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔ خاص طور پر ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد ان کے خلاف ایکشن لیا گیا اور ان کو گرفتار کرنے کا عمل شروع ہوا تو ان کے سامنے شہادت حاصل کرنے کا مزید آسان رستہ پیش کیا گیا کہ وہ افغانستان کے بجائے اپنے ملک میں خود کش حملہ آور بن کر کسی بازار، عبادت گاہ یا کسی اجتماع کو نشانہ بنائیں اور مسلمانوں کو مار کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ اس افسانے میں بھی ایک سادہ لوح نوجوان جہادی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے ماں باپ کے اس کے لیے سہانے خواب تھے کہ وہ اسے تعلیم دلوا کر اچھی ملازمت حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر حالات ساز گار نہ ہونے کی وجہ سے وہ قریبی مدرسے سے ہی تعلیم حاصل کرنے لگتا ہے۔ باپ نے کہانی کے راوی سے منت سماجت بھی کی کہ وہ اس کو شہر میں کسی کام دھندے پر لگا دے۔ مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ مولوی صاحب سے کہتا ہے:

"مولوی صاحب اگر اس کا رجحان دینی تعلیم کی طرف ہے تو اسے پڑھنے دیں۔ آئندہ چل کر وہ آپ کی جگہ سنبھال سکے گا۔ اگر اتنی سی بات ہوتی تو مجھے کیا اعتراض تھا۔ وہ بولے، مگر وہاں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعد بچے کسی جہادی تنظیم میں شامل ہو جاتے ہیں اور جنت کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ تو کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا بچہ جنت کی خواہش کرے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ یہ ضروری تو نہیں جہاد پر جانے والا ہر بچہ شہید ہی ہو۔ ایسے کئی لڑکوں کی میتیں آچکی ہیں۔ پھر بھی لوگ اپنے لڑکوں کو وہاں داخل کراتے ہیں؟ لوگوں کا کیا پوچھتے ہو بھائی! یہاں تو بعض ایسے والدین بھی ہیں جنہوں نے منت مانی ہوئی ہے کہ اولاد ہوئی تو ایک بچہ اللہ کی راہ میں شہادت کے لیے پیش کریں گے۔ میں چاہتا ہوں وہ اس ماحول سے دور چلا جائے۔ کیا وہ دور جانے پر رضامند ہو جائے گا؟ ابھی اس پر زیادہ رنگ نہیں چڑھا، اس لیے شاید میری بات مان جائے۔ کچھ اور دیر ہو گئی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"(۵۷)

مگر شومئ قسمت امین اس دلدل سے نکل ہی نہ پایا اور بالآخر اس کے والد کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ حالات کی ستم ظریفی اسے اس گہرے کنویں میں جا دھکیلتی ہے۔ اگر اسے بھی دینی مدرسے کی بجائے

اسکول میں پڑھنے کے مواقع میسر آتے تو وہ بھی اپنے جیسے دیگر افراد کی طرح عام معمولات زندگی میں مصروف ہو جاتا مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کا جذبۂ جہاد اور شہادت کے شوق کا ذمہ دار مولوی سراج الدین کو کہنا مناسب نہیں کیوں کہ مولوی سراج الدین بذاتِ خود کسی طاقت کا شکار ہوا تھا اور امین پھر اس کا شکار بن گیا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا تھا۔ اس میں کوئی بڑی طاقت ہی ملوث تھی جو کہ اس سارے سلسلے کی باگ ڈور کہیں کسی اور خطے میں تھامے بیٹھی تھی۔ کہانی صرف اس کی شہادت تک ہی محدود نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس میں اس وقت تجسس کی فضا قائم ہوتی ہے جب مولوی سراج الدین کی طرف سے ایک آدمی راوی کے پاس امین کا وصیت نامہ لے کر آتا ہے۔ اس وصیت نامے میں ان گروہوں کے مقاصد اور سائیکی کی عکاسی ہوتی ہے جو برین واشنگ کے فعل میں ملوث ہیں۔

> "میرے پیارے والدین، عزیز بھائیو اور علاقہ کے لوگو! جب آپ کے پاس کاغذ کا ٹکڑا پہنچے گا، ان شاء اللہ میں اللہ تعالیٰ کی بلند درجات والی جنت میں پہنچ چکا ہوں گا۔ میری شہادت کی خبر سن کر پریشان نہیں ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اور شکرانے کے دو نوافل ادا کرنا۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے۔ اور شہید کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے۔۔۔۔۔ لیکن شہادت سے امید ہے قیامت کے دن آپ کے احسانات کا کچھ بدلہ چکانے کے قابل ہو سکوں گا اور جنت کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔ کیوں کہ مجھے ۷۰ رشتہ داروں کی سفارش کرنے کا اعزاز ملے گا۔ بشرطیکہ وہ شرک نہ کرتے ہوں۔"(۵۸)

راوی امین کی شہادت کا پہلے بھی سن چکا تھا اور اس پر غمزدہ بھی تھا کیوں کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خلش ضرور تھی کہ اس نے مولوی صاحب کی دل آزاری کی۔ اس میں ایک معصوم بچے کی روداد صاف نظر آتی ہے جس کو مذہب کے نام پر جان قربان کرنے پر آمادہ کیا گیا اور اس کے معصوم اور پاک جذبات کا استحصال کیا گیا۔ مزید برآں ان تنظیموں کے مقاصد اور چہرہ صاف نظر آتا ہے۔

> "جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے۔۔۔۔۔ کہ اللہ نے حضرت مولانا سراج الدین صاحب کے ایک شاگرد حضرت ابو معاویہ ثانی شہید کے درجات بلند کیے اور شہادت قبول کی۔ قبلہ مولانا صاحب جمعرات کو مراقبہ فرماتے ہیں اور اللہ رب العزت کے حکم سے ان کا رات بھر آسمان سے رابطہ رہتا ہے۔ اس بار امام الشہداء نے خاص طور پر انہیں حضرت

معاویہ ثانی شہید کے مزار مبارک کی تعمیر کا ارشاد فرمایا ہے۔ علاقے کے ایک زمیندار
چودھری غلام حسین نے مزار اور عرس مبارک کے لیے مطلوبہ زمین مہیا کر دی
ہے۔اس کی بابرکت تعمیر کا شرف آپ کے حصے میں آیا ہے۔یہ ہے اس کا نقشہ۔"(۵۹)

راوی یہ پیغام سنتے ہی مبہوت ہو جاتا ہے کہ اس کی آمدنی تو قلیل ہے جب کہ مزار کی تعمیر کے لیے خطیر سرمایہ درکار ہے۔اس کی پریشانی بھانپ کر وہ آدمی یہ جواب دیتا ہے:

"میرا کام تو مولانا صاحب کے ارشاد کی تعمیل تھی۔ وہ میں نے کر دی۔ آپ میں ہمت
ہے تو نافرمانی کر کے دیکھ لیجیئے۔اللہ حافظ۔"(۶۰)

کہانی کے آخر میں قاری کو ایک جھٹکا لگتا ہے کہ کس طرح سے دھمکیوں اور زور زبردستی سے شرفاء کو لوٹا جاتا ہے۔مذہب کو بنیاد بنا کر لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے اور دین کے ٹھیکیدار ہونے کا دعویٰ کرنے والے پرامن شہریوں کو خوفزدہ کرتے ہیں۔افسانہ نگار نے بہت مہارت اور چابکدستی سے اس افسانے میں سوالوں کے کئی جواب بھی پوشیدہ کر دیے ہیں۔دین کی جنت دکھانے والوں کا اصلی چہرہ بھی واضح کیا ہے اور ان کرداروں کی منافقت اور دوغلے معیاروں پر بھی پردہ اٹھایا ہے۔اس وصیت نامے کا سائیکلوسٹائل ہونا اس کی کہانی کو لمبی مسافت پر لے جاتا ہے۔جس میں یہ کہانی محض محمد امین تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ بالفاظِ دیگر ایک عام سے سوال کا مخصوص سا جواب بن جاتی ہے۔

رشید امجد کا شمار برصغیر پاک وہند کے نمائندہ لکھاریوں میں ہوتا ہے اور تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ ان کی اصل وجہ شہرت ان کی افسانہ نگاری ہے اور بعد میں انہوں نے صنف افسانہ کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کر دیا۔ان کے ابھی تک ۱۴ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔صنف افسانہ نگاری میں انہوں نے نت نئے تجربات کیے اور اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا۔رشید امجد نے جن موضوعات کو افسانے کا حصہ بنایا وہ کوئی عام موضوعات نہ تھے بلکہ ہمارے معاشرے کے ارد گرد پھیلے ہوئے موضوعات تھے۔قیام پاکستان سے لے کر اب تک کی ساری سیاسی، سماجی، معاشی صورتِ حال سے وہ پوری طرح آگاہ تھے۔ہمارے معاشرے میں ہونے والے تمام حادثات اور سانحات سے پوری طرح شعور رکھتے تھے۔

رشید امجد حقیقت میں ایک خلاق افسانہ نگار اور نقاد ہیں اردو افسانہ نگاری کا مستقبل جن مخصوص افسانہ نگاروں کی وجہ سے روشن اور تابندہ نظر آتا ہے اُن میں رشید امجد کا نام سرِ فہرست ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد اردو افسانہ نگاری کا ایک جانا پہچانا اور ایک مایہ ناز نام ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو کے علامتی افسانوں میں بھی ان کا بہت

بڑا کردار ہے۔ کہانی کو یوں بیان کرتے ہیں کہ کہانی پڑھنے والے کو حقیقی دنیا کی جھلک نظر آتی ہے۔ دیگر موضوعات کے علاوہ بھی پاکستان میں آئے دن ہونے والی دہشت گردی کے بہت سے ہولناک اور درد بھرے واقعات نے بھی متاثر کیا اور اِن حالات وواقعات سے متاثر ہو کر انکو اپنے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی۔ رشید امجد کے افسانوں کو پڑھ کر انسان پر خوابناک کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ زندگی کس چیز کا نام ہے؟ اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ مرنے کے بعد انسان کا ٹھکانا کدھر ہے؟ اِس نے کدھر جانا ہے؟ اور اس کا اصل مقام کیا ہے یا اس کی اصلیت کیا اور زندگی کی پائیداری کیا ہے؟۔

شمیم حنفی "گملے میں اگا ہوا شہر" کے فلیپ میں لکھتے ہیں:

> "رشید امجد گنتی کے ان لوگوں میں سے ہیں جو کہانی کی بنیاد بننے والی سچائی سے لے کر کہانی کے وجود میں آنے تک کے سارے مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانی صرف ان کا ہی نہیں ہمارا تجربہ بھی بنتی ہے تجربے کی تنظیم پر، بیان اور اسلوب پر، اپنے مخفی، جذباتی، ذہنی اور لسانی رد عمل پر رشید امجد کی گرفت غیر معمولی ہے۔"(۶۱)

اس حوالے سے ان کا افسانہ "پژمردہ کا تبسم" ایک اہم افسانہ ہے۔ جس کو علامت نگاری کے ذریعے ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔ وہ حالات و واقعات پیش کیے گیے ہیں کہ کس طرح طاقت ور کمزور لوگوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بناتے ہیں۔ جس میں علامت کے ذریعے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ایک بادشاہ کی نظر فرغانہ پر پڑتی ہے اور اسے پسند کرنے لگا ہے اور حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن وہ فرار حاصل کرنے کے باوجود بھی فرار حاصل نہیں کر پاتی۔ جب وہ سفر کر کے لاہور ائیر پورٹ پر پہنچتی ہے تو وہ پھر ایک شہنشاہ کو پسند آجاتی ہے اور بادشاہ کی زینت بنانے کے لیے انتظامات کیے جاتے ہیں۔

> "وہ برسوں پہلے قندھار کے تالاب میں، جو ان کے گھر میں پائیں باغ میں گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ وہ اسی طرح بجلی کی لہر بنی تالاب میں اتر رہی تھی کہ وہ کہیں سے سامنے آگیا۔ فرغانہ چیخ مار کر تالاب میں کود پڑی، وہ کنارے بیٹھ گیا۔ شہنشاہ کے آتے ہی کنیزیں ہٹ گئیں۔ شہنشاہ نے اپنا ہاتھ تالاب میں ڈال کر اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ مسکراتے ہوئے دور ہٹ گئی۔ کھردرے ٹھنڈے فرش پر قلعہ کی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے وہ نہ جان سکا کہ اس مسکراہٹ میں بے بسی تھی یا اطمینان۔"(۶۲)

افسانہ تاریخ میں چھپے ہوئے ان اوراق کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ جن میں صرف دہشت اور المیے ہیں۔ جس میں صرف طاقتور پسماندہ لوگوں کی اچھی اور معیاری چیزوں پر اپنا تسلط قائم کرتے تھے کیونکہ ایسے لوگ طاقت کے نشے میں مست ہو کر اور کمزور لوگوں پر اپنی حکمرانی قائم کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی فطرت میں شامل ہے اور تباہی و بربادی کمزور اور لاچار لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔

"اے خاک، بکھر کر بھی تو خاک ہی رہتی ہے اور ختم نہیں ہوتی، بس اڑتی رہتی ہے۔ خاک قندھار سے اڑی، ہوا کو چھوتی دلی پہنچی، یہ جغرافیہ کا سفر تھا اور تاریخ تو میں خود ہوں۔ ہوائی اڈہ کی ضرورت سے فارغ ہو کر وہ جب لاؤنج سے گزر رہا تھا تو نظر ٹی۔ وی پر پڑی، سلائیڈ چل رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قندھار پر امریکی طیاروں کی شدید بمباری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔،، اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ بیگ نیچے جا پڑا۔۔۔۔۔۔ قندھار اور، دلی سب ملبے کا ڈھیر بن گئے۔

وہ تن تنہا اپنے ہی ملبہ پر کھڑا اپنا جغرافیہ ڈھونڈ رہا ہے۔"(۶۳)

دہشت گردی کے حوالے سے رشید امجد نے کئی اہم افسانے لکھے ہیں۔ البتہ ان کا انداز علامتی ہے جبکہ مطلب کی تہہ داری میں بہت زیادہ گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ ان کا افسانہ 'شہر گریہ" دیگر افسانوں کی نسبت تھوڑی الگ نوعیت کا حامل ہے۔ جس میں ملکی صورتِ حال اور آئے روز کے بم دھماکے اور انسانی جانوں کے نقصان پر اب حیرت نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاشرے کے حساس طبقے کے لیے ایک پریشانی اور رونا بن چکا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بنی اسرائیل کے لوگوں کا رونا ہوتا ہے جب ان لوگوں کو بخت نصر نے بابل و نینوا میں قید کر رکھا تھا اور ان کے پاس صرف اور صرف دیوار گریہ رہ گئی تھی۔ خودکش بم دھماکے معمول بن گئے ہیں۔ جس میں مرنے اور مارنے والے ایک ہی ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔

"پہلا دھماکہ بہت ہی حیران کن اور بہت ہی اداس کرنے والا تھا۔ کئی گھر اجڑ گئے تھے سب روتے تھے۔ چند دن بعد معمول نے اپنی بکل میں لے لیا۔۔۔۔ لیکن صرف چند دن، پھر دھماکے خود معمول بن گئے۔ چوک پر سگنل بند ہوا تو گاڑی رکی، اگلا دروازہ کھلا رہ گیا تھا، پلک جھپکنے میں ایک سفید ریش دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، سفید ریش نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بولا، "اللہ نے تمھیں جنت میں جانے کے لیے چن لیا ہے۔ جدھر میں کہوں خاموشی سے چلتے رہو ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔

بے بسی سے سفید ریش کو دیکھا، راستے میں بیٹے کو دفتر سے لینا تھا، پھر بیوی کو سکول اور پھر۔۔۔۔۔۔۔۔گھر تو اب خواب سا لگ رہا تھا۔"(۶۴)

افسانہ نگار اس تباہی کو قیامت کی تباہی سے کم نہیں سمجھتے۔ جس طرح روز محشر ایک حشر سا برپا ہو گا، اسی طرح انہوں نے اسکول میں دھماکے کی منظر کشی کی ہے۔

"اپنے کیے کا کوئی علاج نہیں۔" سوچتا "اور جو بویا ہے وہ تو کاٹنا ہی ہے۔" اور اب کٹائی کا موسم تھا، سر بھی کٹا رہے تھے اور جگہیں بھی پرزہ پرزہ ہو رہی تھیں بلند و بالا عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن رہی تھیں۔" قیامت کیا کوئی اور ہو گی!" سوچتا' اور پھر یہ قیامت اس کے اپنے گھر پر بھی ٹوٹی۔ سکول میں دھماکہ ہوا، اس کی برسوں کی رفاقت لمحہ بھر میں پہچان سے بھی باہر ہو گئی، لو تھڑے تھیلوں میں بھرے تھے، کس کے ساتھ کس کے ٹکڑے، کون جانے تھیلوں میں کون کہاں ہے؟
بیٹے نے کہا، اب یہاں نہیں رہا جا سکتا، میں تو جا رہا ہوں، آپ بھی چلیں۔"(۶۵)

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ مرنے اور مارنے والے دونوں ایک ہی کرہ ارض کے مکین ہیں جن پر ان کا رہنا ہی تنگ کر دیا ہے لوگ اپنی سرزمین کو چھوڑنے پر مجبور ہیں اس سے بڑا المیہ انسانی زندگی کے ساتھ اور کیا ہو گا۔ ہر سو دہشت گردی کا راج ہے پورے ملک میں پولیس اور آرمی مسلح جدوجہد میں سرگرم عمل ہے۔ پورے کا پورا شہر ہی وحشت میں گھرا ہوا ہے۔ خاص اور اہم جگہوں پر جانے پر پابندی عائد کر دی ہوئی ہے۔ کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ لوگ نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف خوف و ہراس کی کیفیت پھیلی ہوئی ہے۔

دہشت گردی کے حوالے سے ڈاکٹر امجد رشید کا افسانہ "رات" موضوع کے لحاظ سے اپنی اہمیت مسلم رکھے ہوئے ہیں کہ لوگ اپنے ہی آبائی خطوں میں غیر محفوظ ہیں، گھروں سے بھاگ کر دور کہیں پناہ گاہیں ڈھونڈ نے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ جن لوگوں سے عوام تحفظ محسوس کرتی تھی انہوں نے آگے بیریئر لگا رکھے ہیں۔ مر مر کے جینا اور جی جی کے مرنا لوگوں کی زندگی کا معمول بن چکا ہے۔ ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کب فون کی گھنٹی بجے اور یہ خبر سننے میں آئے کہ فلاں جگہ دھماکہ ہوا ہے۔

"سنا ہے شہر میں لوگ کھڑے کھڑے پانی ہوئے جاتے ہیں۔ دائیں طرف بیٹھا ہوا مٹکا نما شخص ہنستا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ تو قدرت نے آبادی کم کرنے کا طریقہ خود ہی پیدا کر دیا ہے۔۔"" قدرت کے کاموں میں کسے دخل ہے؟" بائیں طرف زیبرا جیسی گردن والا

کہتا ہے۔۔۔"آبادی کم ہو تو حکمرانوں میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔" بادشاہ سلامت بلوری آنکھوں والی گداز رانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتے ہیں، ٹی۔وی سکرین کے نیچے لائن چل رہی ہے خودکش حملہ، تیس لوگ مارے گئے۔۔۔۔۔خودکش حملہ چالیس لوگ۔۔۔۔ریموٹ کنٹرول دھماکہ،۔۔۔لوگ،"انگلیوں کی گنتی تو ختم ہوگئی" وہ خود سے کہتا ہے۔۔۔۔۔۔"اب تو تعداد کے لیے کیلکولیٹر کی ضرورت ہوگی۔"سیاہ حاشیے۔۔۔۔۔۔۔۔اخبار سیاہ حاشیوں سے اٹے ہوئے ہیں۔افسردہ چہرے، خاموش آنکھیں۔ماں باپ کے ماتھے پر بوسہ دیتی ہے۔"بیٹا ہجوم والی جگہ سے بچنا اور جو محافظ ہیں ان کے قریب بھی نہ جانا، بیٹا سوچتا ہے "کیا زمانہ آگیا ہے؟ پہلے حفاظت کے لیے جن کے قریب جاتے تھے۔اب ان سے دور بھاگتے ہیں۔"لیکن بھاگ کر بھی کہاں جایا جاسکتا تھا۔۔۔اطلاع تعزیت کے ساتھ معاوضے کا چیک۔۔۔۔۔ماں سینے پر دو ہتھڑ وارتی ہے۔۔۔۔۔ میرے بیٹے کی قیمت نہ لگاؤ۔۔۔۔"رکھ لو۔۔۔۔رکھ لو" کوئی سرگوشی کرتا ہے۔آنے والے برے وقت میں کچھ تو کام آئیں گے۔"سروں کی قیمت ۔۔۔۔۔منڈی لگی ہے۔"میرے پاس تو صرف سوت کی یہ اٹی ہے۔"(۶۶)

اس افسانے میں خودکش حملوں میں ہونے والے جانی ومالی نقصان کی تصویر کشی نہایت باریکی سے بیان کی گئی ہے۔مصنف نے اس دل خراش نکتہ سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان واقعات میں ضائع ہونے والی انسانی جانوں کی قیمت چند روپے مختص ہوتی ہے جو کہ بطور معاوضہ دے دی جاتی ہے۔اس طرح مرنے والوں کے سروں کی قیمت لگانا نہایت کریہہ عمل ہے۔

رشید امجد کا افسانہ "مجال خواب" اپنی نوعیت کا ایک الگ اور منفرد افسانہ ہے جس میں معاشرے کی بے حسی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے قبروں کو ڈھونڈنے والے زندگی کی حقیقت کا ساتھ کیسے نبھا سکتے ہیں۔بلکہ اس کے پس منظر کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ایک اچھا افسانہ نگار صرف ماضی کے المیے اور معاشرے کی صورتِ حال کو منظر عام پر نہیں لاتا بلکہ تاریخ تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔اس حوالے سے طاہرہ اقبال کہتی ہیں:

"افسانہ نگار نے محض دہشت گردی کے مناظر ہی پینٹ نہیں کیے ہیں بلکہ ان کے محرکات اور عوامل کو بھی افسانوی اور علامتی اسلوب میں بیاں کیا ہے کہ اچھا تخلیق کار محض تاریخ کے دھاروں کو ہی ادب میں منتقل نہیں کرتا بلکہ تاریخ فیصلوں کے محرکات تک اس کی نگاہیں ہوتی ہیں۔یوں بھی آج کا ادیب زیادہ باخبر اور تاریخی وسیاسی

شعور کا حامل ہے پاکستانی تاریخ کے ابتدائی برسوں والا ابہام اب ختم ہو چکا ہے۔اب حکمرانوں، محافظوں، ایجنسیوں حاکموں اور درپردہ تنظیموں، سازشوں اور منصوبوں کی اسے بہتر آگاہی ہے۔"(۶۷)

رشید امجد کا افسانہ "مجال خواب" تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے جس میں تاریخ میں پنہاں عروج وزوال کی داستانوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔انہوں نے قبرستان اور قبروں کا استعارہ استعمال کر کے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

"مجال خواب" میں ڈاکٹر رشید امجد نے تمثیلی انداز میں تاریخ کے قبرستان کا سفر بیان کیا ہے جہاں کہانی کا راوی واحد متکلم اپنے مرشد کی ہم راہی میں اپنی جڑوں کی تلاش میں دوسری مرتبہ پہنچتا ہے۔وہاں پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ ہر کتبے پر عروج وزوال کی داستانیں رقم ہیں اور ساری داستانیں ایک سی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ہر قبر ایک زمانہ ہے اور ہر کتبہ اس زمانے کا چہرہ۔ کہانی کا راوی اپنی قبر اور کتبہ تلاش کرتا ہے مگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندوں میں شمار ہوتا ہے نہ مردوں میں اور یہی اس کا عذاب ہے۔"(۶۸)

قبرستان کو اگر ہم تمثیلی تناظر میں دیکھیں تو ایک طرح سے قبرستان قبر یا پھر کتبے سب عبرت دلاتے ہیں اور انسان جس کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔اس کا آخری مسکن قبر ہے۔ بقاء اور فنا کے تصور کو مصنف نے نہایت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

مصنف آگے جا کر افسانے میں قبر اور اس کے کتبوں کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولا۔"ان قبروں کی اور کتبوں کی حقیقت کیا ہے۔""ہر قبر ایک زمانہ ہے اور ہر کتبہ اس زمانے کا چہرہ ہے۔وقت نے انہیں دھندلا دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔قبروں کو تلاش کرنے والے زندوں میں نہیں ہوتے۔"مرشد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "لیکن میں مردوں میں بھی نہیں ہوں۔"اس نے تیزی سے کہا۔"یہی تمھارا عذاب ہے۔"عذاب سہتے عمریں بیت گئی ہیں، وہ تاریخ کے اس قبرستان کے بیچوں بیچ کھڑا اپنی قبر اور اس کا کتبہ تلاش کر رہا ہے۔وقت ایک ماہر گورکن کی طرح ایک تازہ قبر تیار کر رہا ہے اور زمانہ ایک ماہر سنگ تراش کی طرح ایک نیا کتبہ بنا رہا ہے۔وہ دفنانے کے انتظار میں کھڑا کھڑا اشل ہو گیا ہے۔ مرشد جانے کب کا جا چکا ہے۔"(۶۹)

لوگ ہجوم والی جگہوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے ہی محافظوں سے ڈرتے ہیں۔

"مجال خواب "میں تمثیلی انداز میں واقعہ کو بیان کیا گیا ہے جس میں راوی مرشد کی مدد سے اپنی حقیقت کو تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے جب وہ قبرستان جاتا ہے تو وہاں پر مختلف کتبوں پر مختلف کہانیاں رقم ہیں اور ان سب کہانیوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں:

> "عورت، فقیر اور دکان کی حکایت سننے کے بعد کہانی کے راوی کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے ارد گرد سے وقت غائب ہو گیا ہے۔" مرشد اس کی رہنمائی کرتا ہے کہ وقت اور زمانے کا تعلق زندگی سے ہے اور قبرستان میں اس کا کوئی کام نہیں۔ نیز یہ کہ ہر قبر ایک زمانہ ہے اور ہر کتبہ اس کا چہرہ۔ کہانی کار راوی اپنی قبر اور اور کتبہ تلاش کرتا ہے مگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندوں میں شمار ہوتا ہے نہ مردوں میں اور یہی اس کا عذاب ہے ۔رشید امجد نے وقت اور فنا کے تحریری تصور کو قبرستان کے امیج کے ذریعے پیش کیا ہے۔ یہ فنا محض انفرادی زیاں نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی زندگی کے عروج وزوال اور حیات و قوت سے جڑا ہوا تصور ہے۔تاریخ کے قبرستان میں ہر قبر پر ایک کتبہ موجود ہے جس پر پوری داستان مرقوم ہے مگر کوئی تاریخ سے سبق لینے کو تیار نہیں۔۔۔۔۔یہی اس کہانی کی تھیم ہے۔"(۷۰)

وقت اور فنا کا تصور ایک قبرستان میں دفن سینکڑوں لوگوں کے انجام کی کہانی سناتا ہے جب کہ کتبے پر لکھی تحریریں جیتے جاگتے انسانوں کے لیے سبق ہیں۔ وقت گزرتا جارہا ہے جب کہ انسان اپنے انجام سے مرتے دم تک بے خبر رہتا ہے اور بالآخر وہ بھی دوسرے انسانوں کے لیے ماضی کا ایک بھولا ہوا قصہ بن کر رہ جاتا ہے۔

رشید امجد کے افسانوں میں قبر، وحشت ،دہشت اور قیامت جیسی علامات کے ذریعے دور حاضر کی صورت حال بیان کی گئی ہے اور تاریخ پر لکھے گئے کتبوں کو واضح کیا ہے جو ورق بہ ورق تغیر کا شکار رہیں۔

محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے صنف افسانہ نگاری میں خوب جوہر دکھائے ہیں اور افسانہ نگاری میں اپنی الگ اور منفرد پہچان بنائی انہوں نے اپنے افسانوں میں نائن الیون اور اسکے بعد انسانی نفسیات، جنس اور ملکی اور غیر ملکی صورت حال کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور عصری شعور طبقاتی تقسیم، لوگوں کے ساتھ اپنایا جانے والا غیر منصفانہ رویہ اور ظاہر و باطن میں فرق کو موضوع بنایا ہے۔

نائن الیون کے بعد ان کے افسانوں میں ایک واضح تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے۔ نائن الیون کے واقعہ نے جہاں عالمی برادری کو متاثر کیا وہاں اس کے اثرات اردو فکشن پر بھی پڑے۔ اس سانحہ کو موضوع بحث بنانے والوں میں حمید شاہد کا نام صف اول کے افسانہ نگاروں میں آتا ہے۔

اس واقعہ نے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کیسے متاثر کیا اور کیوں کر لوگ عدم تحفظ اور انتہا پسندی کا شکار ہوئے؟ ایک عام شخص کس طرح اجتماعی اموات کا سبب بنتا ہے۔ ایسے لوگ بیرونِ ملک پاکستانیوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ انسان کا فنا کی طرف سفر جاری و ساری ہے۔ دورِ حاضر میں انسان کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ انسان اس بھری دنیا میں خود کو اکیلا تصور کرنے لگا ہے۔ حمید شاہد اپنے موضوع کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنا نقش قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ان کے موضوع اپنے ارد گرد کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات جاندار ہیں۔ حمید شاہد مناظر کی عکاسی ایسے کرتے ہیں کہ وہ زندہ اور جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جس سے افسانے کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں وہ ایک ذرخیز ذہن اور فعال طبیعت کے تخلیق کار ہیں۔ اردو افسانے نام حمید شاہد عصری مسائل پر یوں قلم اٹھاتے ہیں جیسے ان میں چولی دامن کا ساتھ ہو اور نائن الیون کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے موجودہ دور کا نوحہ ہیں۔ ان میں یہ خداداد صلاحیت موجود ہے اور عصری ہنگامی موضوعات کو ادب کا حصہ بنانے میں ملکہ حاصل ہے۔ حمید شاہد کا افسانہ گانٹھ ۹/۱۱ کے پس منظر میں لکھا گیا۔ یہ افسانہ اس پاکستانیوں کی آہ بکار ہے جو اپنی تہذیب کو پس پشت ڈال چکے ہیں اور اپنے آپ کو مغربی تہذیب میں شامل کر چکے ہیں۔

اس افسانے انہوں نے بتایا کہ ایک پاکستانی ڈاکٹر جو عرصہ بعید سے امریکہ میں آباد ہے۔ اس نے اپنے کلچر کو چھوڑ کر اپنے خیالات، تصورات، احساسات اور شناخت کو مکمل طور پر مغربی تہذیب میں ڈھال دیا۔ وہ عرصہ دراز سے امریکہ میں اپنی خدمات سرانجام دیتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر توصیف نے کیتھرین نامی لڑکی سے وہاں شادی تک کر لی اور کیتھرین سے دو بچے "ڈیوڈ" اور "راجر" پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت امریکہ کے باشندوں جیسی ہے، ۲۰ سال امریکہ گزارنے کے بعد بھی ڈاکٹر توصیف کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ آج تک صحیح معنوں میں امریکی نہیں بن سکا اور یہاں تک کہ وہ اپنی شناخت بھی کھو چکا ہے۔

> "وہ مکمل طور پر اس سوسائٹی کا حصہ ہو کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس قدر مطمئن کہ حادثے کے بعد بھی ناموافق رد عمل کے باوجود وہ اس فریضے کو انسانیت کی خدمت کا تقاضہ سمجھ کر ادا کرتا رہا حتٰی کہ خفیہ اداروں نے اسے دھر لیا۔۔۔۔۔۔ کیتھی، راجر اور ڈیوڈ کو بھی

یاد نہ رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ سب اچانک یوں آ گے جیسے بھولی ہوئی کوئی یاد آیا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ایک تلخ سی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی جس کے باعث اس کے عقبی ریشوں کی گانٹھ کی تانت بڑھ گئی اور اسے پژمردگی رگیدنے لگی۔ جب وہ پوری طرح نڈھال ہو چکا تو کیتھی، راجر اور ڈیوڈ آ گئے۔۔۔۔۔اس نے افسوس کے ساتھ سوچا کاش کیتھی کبھی نہ آتی۔ نہ دیکھنے کی خواہش کے ساتھ وہ جب آخری بار اسے دیکھ رہی تھی تو وہ کیتھی کے یوں چلے آنے کا مدعا سمجھ چکا تھا۔"(۱۷)

اس کہانی کا ایک تکلیف زدہ رخ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو اپنی شناخت بھول چکے ہوتے ہیں جب وہ آخری دفعہ اپنی بیوی بچوں سے ملتے ہیں تو ان کا برتاؤ بالکل غیر مانوس ہوتا ہے جیسے کہ چھان بین کرنے والے آفیسروں کا ہوتا ہے۔ اسطرح ہمارے معاشرے کی پامالی کا نوحہ ہے۔ حمید شاہد نفسیاتی رجحان کو ہمارے سامنے لائے ہیں، بیوی بچوں کی مطلب پرستی کہ وہ ساری زندگی باپ کی محنت پر اپنی ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں لیکن بالآخر وہ تصویر جو اس نے کبھی چھوٹے ہوتے ہوئے بنائی تھی سب کچھ اس میں جمع ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنی بہن اور بھانجوں کا پیار حاصل کرتا ہے تو وہ تمام تلخ حقائق بھول جاتا ہے۔

محمد حمید شاہد کا افسانہ " سورگ میں سئور " تمثیلی طرز میں لکھا گیا ہے جس میں وہ موجود حالات و واقعات کا منفرد انداز میں احاطہ کرتے ہیں ۔ بستی والے ریوڑ کی دیکھ بھال کرنا اپنا ایک فرض عین سمجھتے تھے۔ لیکن وہ سوروں کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے کیوں کہ وہ بکریوں کو کھا جاتے تھے ۔ان بکریوں کی حفاظت کے لیے بستی والوں نے کتے رکھنے شروع کیے۔ مگر دوسری جانب سوروں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بستی والوں نے بھی حفاظتی اقدامات اپناتے ہوئے کتوں کی تعداد میں مزید اضافہ کیا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں۔

"اس کے تدارک کے لیے انہوں نے کتے پالنے شروع کر دیے مگر سوروں کی تعداد میں حیرت انگیز تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اگرچہ انہوں نے بھی جواباً حفاظتی کتے کی تعداد بڑھائی مگر یہ کتے خود بھی غیروں سے مل گئے یا ان کے ڈر سے بستی والوں کی بکریوں کی حفاظت سے قاصر رہے۔ علامتی سطح پر یہ عالمی گاؤں آباد کرنے کی کوشش میں بسی ہوئی بستیاں اجاڑ دینے والی مرگ آثار تھوتھنیوں کی کہانی معاصر صورت حال کے بیان کے

لیے مصنف نے بکریوں ، کتوں اور سئوروں کے استعارے خوبی سے بیان کیے ہیں۔"(۷۲)

دراصل امریکہ اور اس کے حامیوں کو اس دھرتی پر قدم رکھنے کے لیے بہانے کی ضرورت تھی اور یہ پلیٹ فارم ان کو ۹/۱۱ نے فراہم کیا۔ اس طرح ایک بے قابو طاقت اس سرزمین کو خون کی لالی میں نہلاتی چلی گئی اور ہر طرف تباہی و بربادی نے سیاہ ڈیرے ڈال دیے تھے۔

"سورگ والوں نے کتوں کی تعداد بڑھائی ضرور تھی مگر یہ تعداد کبھی کافی نہ ہو پائی تھی کہ لائن لگانے والا یہ بے شرم جانور بڑھتا بھی بڑی سرعت سے تھا، ہر اڑھائی مہینے کے بعد ان کے حرام زادیوں کی بکھیاں بھر جاتیں اور سال بعد پتہ چلتا کہ پچھلے برس کے مقابلے اس بار تین گنا زائد آئے اور مونگ پھلی کے کھیتوں کو کھود کر پلٹ گئے۔"(۷۳)

یہ افسانہ علامتی رنگ ۹/۱۱ کے بعد جو حالات و واقعات سامنے آئے ان کی وجہ سے عدل و انصاف کی عدم دستیابی، بنیادی حقوق کی پائمالی سب کے سب پس پشت چلے گئے۔ اپنوں نے غیروں کے ہاتھ تھام لیے تھے اور اپنوں کو چھوڑ دیا تھا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد طاقتور قوموں نے کمزور اقوام کے ساتھ کیا سلوک کیا اس سارے واقعے کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

حمید شاہد کا افسانہ "سورگ میں سئور" اپنی نوعیت کا الگ اور منفرد افسانہ ہے جس میں تمثیلی انداز میں معاشرتی اور سیاسی حالات و واقعات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں ایک ایسی بستی کا تذکرہ ملتا ہے جن کو بکریاں رکھنے کا شوق تھا اور اس کو ایک اچھا کام تصور کرتے تھے لیکن سوروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی پہلے تو بستی والے اسلحہ پاس رکھتے تھے پھر حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی۔ مجبوراً ان کو کتوں کی تعداد بڑھانی پڑی تاکہ سوروں کے حملوں سے بچا جا سکے اور مونگ پھلی کی فصل کو بچایا جا سکے اس ساری کہانی میں حمید شاہد نے اپنا استعاراتی نظام قائم رکھا ہے

ایک طرف تو گیارہ ستمبر کے بعد کی کہانی کو قلم بند کیا گیا ہے تو دوسری طرف اس سرزمین پر ایسی بستی کا تذکرہ ملتا ہے جو محنت کش اور ان کی حیات کا بیان ہے۔

"گیارہ ستمبر کے پس منظر میں لکھی گئی اس کہانی میں سئوروں کی آمد، کتوں کی بہتات بکریوں کی اموات اور مونگ پھلی کی کاشت جیسی علامات کو بروئے کار لا کر افسانہ نگار نے کہانی کے رخ کو علامات کی طرف موڑ دیا ہے۔ اگر کہانی کے عنوان پر غور کیا جائے تو

یہ عنوان ہی علامت سے معلوم پڑتا ہے۔ اس میں کہانی کار نے عالمی استعمار کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کیا ہے اور علامتی پیرائے میں اپنی بات کی ہے۔ یوں تو اس کہانی کا پورا منظر نامہ دیہی ہے (کہ دنیا کو گلوبل ویلج بنادیا گیا ہے) لیکن جن مقامات پر بادشاہوں کا مونگ پھلی پر قلم دانی کا ذکر ملتا ہے وہاں قاری صاف طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس سے مراد کون لوگ ہیں۔"(۷۴)

محمد حمید شاہد کا ایک منفرد افسانہ جو سانحہ پشاور کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ پشاور کے ایک سکول میں دہشت گردوں نے جو ظلم و ستم ڈھائے تھے اس واقعہ کے ہفتے بعد توقیر نامی لڑکا مارا گیا تھا جو وہاں کے ایک مقامی اسکول کے ماسٹر سلیم الرحمٰن کا پوتا تھا۔ توقیر کی والدہ بچپن میں فوت ہو گئی تھی تو اس کا باپ امریکہ چلا گیا اور خود توقیر اپنے دادا دادی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن توقیر کی زندگی عام لوگوں کی طرح نہیں گزر رہی تھی۔ ماسٹر سلیم کا خیال تھا کہ اسلام میں جبر نہیں اور اسلام امن اور سلامتی کا مذہب ہے اور ایسے اسلحے کا استعمال کرنا جو عام لوگوں اور جنگ کرنے والے کے درمیان تمیز نہ کر سکے سب حرام کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ بھی ماسٹر سلیم الرحمٰن کے بارے میں اتنی اچھی رائے نہیں تھے رکھتے۔

"پہلے پہل انہیں روسی ایجنٹ کہا گیا اور جب روس پسپا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین دہشت گرد ہو گئے تو وہ اسی مولوی کی نظر میں امریکی ایجنٹ ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔ ماسٹر صاحب ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے خودکش حملوں اور ایٹم بم دونوں کو حرام ہتھیار کہا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ دونوں ظالم اور مظلوم میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ جس روز پشاور میں طالبان نے ڈیڑھ سو بچوں کو بے دردی سے مار ڈالا تھا، انہوں نے فوراً بعد والے جمعے کو بہت درد بھرا خطبہ دیا تھا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ اس خطبے والے جمعے کے بعد پڑنے والی جمعرات کو ان کا پوتا توقیر خودکش حملہ آور سمجھتے ہوئے گولیوں سے بھون ڈالا گیا تھا۔"(۷۵)

ماسٹر سلیم الرحمٰن دوسرے اساتذہ اکرام پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں جو طالب علموں کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں کرتے اور بچے طالبان کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ جو مذہب کی آڑ میں لوگوں کو ظلم و جبر کا نشانہ بناتے ہیں اور جانوروں کی طرح معصوم انسانوں کو ذبح کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بازار، مدرسے، مساجد اور دفاتر تک محفوظ نہیں ہے۔ ان سب سے بڑھ کر جب وہ دھماکہ کرنے والے ہوتے ہیں تو

نعرہ تکبیر کی صدا بلند کرتے ہیں جب کہ ان کے اندر خدا کا خوف بالکل نہیں ہوتا اور یہی وجہ تھی کہ لوگ ان کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے توقیر کے اندر بھی یہ رجحان غالب ہونے لگا۔ ایک دن وہ لوگوں کو ڈرانے کی غرض سے دادا کی جیکٹ پہن کر نکل گیا۔

توقیر نے اس کی جیبوں میں اپنے کھلونے بھر لیے تھے۔ ایک چادر سر پر باندھی اور اس کا پلو پیچھے لٹکنے دیا اور ہاتھ میں وہ کھلونا پستول اٹھالیا جو باپ نے پچھلے سال امریکہ سے بھیجا تھا۔ وہ یہ خیال کر کے ہی خوش ہو رہا تھا کہ لوگ اس سے ڈر کر بھاگیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے دادا چھتری لے کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے باہر نکلتے ہی ادھر ادھر دیکھا اور بھاگتے ہوئے بازار کی طرف ہو لیا۔ وہ کہتا جاتا تھا:

> "میں پھٹ جاااااؤں داا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں پھٹ جاؤں داااا۔ اس کے پیچھے ایک شور مچ گیا تھا: "خود کش آ گیا خود کش آ گیا"۔ وہ اس شور شرابے سے اور پر جوش ہو گیا۔ حتٰی کہ وہ جامع مسجد والے چوک میں پہنچ گیا۔ سانحہ پشاور کے بعد اب وہاں بھی پولیس والے کی ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ سپاہی چوکنا ہو گیا کہ اسی عمر کے نوجوان دھماکے سے پھٹ جایا کرتے تھے۔ توقیر کی نظر اس پر پڑی تو ٹھٹھک کر رکا، پھر یہ سوچ کر جی ہی جی میں خوش ہوا کہ وردی والے کو ڈرانے میں بہت مزا آئے گا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی جانب لپک رہا تھا۔ پولیس والا واقعی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر بندوق سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔"(۷۶)

یہ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم اس قدر نفسیاتی دباؤ میں آ چکے ہیں کہ تھوڑا سا ڈر اور غفلت ہمیں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتے ہے۔ نادانی اور پولیس والے کا ڈر توقیر کو ابدی نیند سلا دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

سانحہ گیارہ ستمبر کے بعد لکھا جانے والا افسانہ "لوتھ" سارے منظر کی تصویر کشی کرتا ہے جس میں حالات اس قدر سنگین اور صورت حال نہایت وحشت زدہ ہو گئی۔ جس میں باپ بیٹے کے درمیان خلا حائل ہو چکا ہے۔ اس کی تربیت ایسی ہوئی ہے کہ وہ بات کو دوسری طرز سے لیتا ہے۔

باپ اپنے تلوؤں کے زخم کو بیٹے سے چھپاتا ہے اور حالات کی اونچ نیچ کو گزرنے دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھاؤ ناقابل برداشت حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح یہ راز افشاء ہو جاتا ہے۔ راز ظاہر ہونے کا لمحہ بھی عجیب و غریب تھا۔ واقعہ کچھ اس طرح رونما ہوتا ہے کہ بیٹا ٹی وی کی سکرین پر ایک المیے کو بار بار

دیکھ رہا تھا۔ جہاں ایک جہاز بلند و بالا عمارت سے ٹکراتا ہے اور وہاں جمع لوگ بڑے تعجب سے سارا منظر دیکھ رہے ہیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب پہلے سے جانتے تھے کہ کبھی نہ کبھی تو ایسا ہونا تھا۔

"جب پہلی بار یہ منظر سکرین پر دکھائی دیا تھا۔ انوکھی طمانیت کی بھیک کے باعث اس نے اپنے ہی تلوؤں کے زخمی حصے کو سختی سے دبالیا تھا جس کے سبب اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی تھی۔ بیٹے نے پلٹ کر دیکھا اور فوری طور پر اس سسکاری کے کچھ اور معنی نکالے تھے۔۔۔۔۔ تاہم جب اس کی نظر رستے ہوئے تلوؤں پر پڑی تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے گلہ تھا کہ آخر اس سے ان زخموں کو اوجھل کیوں رکھا گیا تھا؟ وہ از حد فکر مندی ظاہر کرنے لگا تھا۔۔۔۔ اور شاید فکر میں مبتلا ہو بھی گیا تھا۔۔۔۔ لگ بھگ اتنا ہی فکر مند جتنا کہ دونوں فلک بوس عمارتوں کے ساتھ طیاروں کے ٹکرانے کے بعد ہوا تھا۔ بعد کے دنوں میں درد اور تشویش میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتٰی کہ دونوں کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔"(۷۷)

کچھ دن گزر جانے کے بعد سارا ماحول ہی وحشت زدہ ہو چکا تھا۔ ہر چیز میں تضاد نظر آ رہا تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب ہر کام عمدگی سے ہوا کرتا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ اچھا وقت گزرتا تھا ایک وہ وقت ہے جب ہر طرف خوف و ہراس، آہ بکا اور چیخیں ہیں۔ چھوٹی بیٹی کندھے پر سوار تھی اور بیوی پانی کو دیکھ کر چکرا کر گرنے لگی تھی اور بچی کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے۔ اتنے میں آنے والے بچے کی شہادت ہو جاتی ہے۔

یہی بچہ باپ کی ٹانگ کے پیچھے پڑا ہوتا ہے۔ جو عہد جدید کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ افسانہ گیارہ ستمبر کی تصور کشی کرتا ہے۔ جہاں پرانی اور نئی اقدار کے بیچ فاصلے کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنی اقدار کو دور جدید میں پس پشت ڈالتے ہوئے ذرا بھی سوچ وچار نہیں کرتے انسان کے زوال کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اپنی اقدار بدلتے انسانی رویوں اور آپس میں احترام انسانیت کے بدلنے یا ختم ہونے کا رونا رویا جا رہا ہے تو دوسری جانب کمزور ممالک کو دبانے کو جستجو جاری ہے۔ اسی سانحے کو مد نظر رکھتے ہوئے حمید شاہد نے اسی طرز پر دنیا ایک اور افسانہ "برف کا گھونسلا" لکھا۔

بظاہر یہ افسانہ مری کی سرد آب وہوا کے گرد گھومتا ہے۔ جہاں پر پورا خاندان ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں تو حالات سازگار رہے لیکن سردی کی آمد کے ساتھ ہی حفاظتی اقدامات کے بارے میں سوچنے لگ پڑے۔ حالات اس قابل نہ تھے کہ وہ کمبل وغیرہ لے سکیں انہوں نے

فیصلہ کیا کہ یہاں سے منتقل ہو جائیں اور بچیاں بھی ابھی چھوٹی تھیں۔ان کو عجیب حالات سے گزرنا پڑا۔ان کو معلوم تک نہ تھا کہ انہی کے ساتھ ایک فیملی بھی مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ایک چڑیا اور دو اس کے بچے۔ثوبیہ کے کہنے کے مطابق روشن دانوں کے آگے شیشے جوڑ دیے گئے جس کے باعث بچوں اور چڑیا کو رات باہر گزارنی پڑی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ بچے برداشت نہ کر سکے اور زندگی کی بازی ہار گئے۔ دراصل یہ دو خاندانوں کی کہانی ہے جس میں ایک طرف انسان اور دوسری طرف پرندے ہیں۔جو ایک جگہ رہنے کے باوجود الگ الگ قسمت/تقدیریں رکھتے ہیں۔ یہ کہانی علامتی طور پر ہمارے سامنے آتی ہے ، چڑیا مظلومیت اور معصومیت کی علامت ہے جو دوسرے لوگوں کے رحم و کرم پر ہے۔جب طاقتور اور ظالم ممالک اپنی توجہ کا مرکز کسی اور کو بنا لیتے ہیں اور کمزور اور غریب ممالک کا انجام بھی اس چڑیا کی طرح ہوتا ہے جو بے یار و مدد کے اپنے بچوں کو نہ بچا سکی۔ بالکل اسی طرح جب امریکہ نے اپنے حمایتی پاکستان کی طرف اپنی آنکھیں بدل لیں اور انکے معاشی حالات کا سوچے بغیر امداد پر پابندی لگا دی۔" برف کا گھونسلا" انسانوں اور پرندوں کے مابین ایک ایسا افسانہ ہے جو علامتی رنگ میں پنہاں ہے۔اگر ہم کمزور چڑیا کو علامت کے طور پر لیں تو ایک ریاست اگر کمزور ہے اور دوسرے کے رحم و کرم پر ہے اور اگر وہ بڑے اور طاقتور ملک اپنی نگاہیں بدل لیں تو کمزور ملک کا انجام بھی اس کمزور چڑیا جیسا ہو گا جو مری کی سرد ترین رات میں اپنے بچوں کی جان گنوا بیٹھی۔

محمد حمید شاہد کا نام ان لوگوں میں لیا جاتا ہے جو برصغیر پاک و ہند کے بہترین اور عمدہ لکھاری ہیں۔ یہ مقام و مرتبہ انہیں فن افسانہ نگاری نے عطا کیا ہے۔اور انہوں نے اپنا نام افسانہ نگاری کی دنیا میں مستحکم رکھا ہوا ہے۔افسانہ نگاری ان کا بہترین آرٹ ہے۔افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو سرفہرست رکھا۔

گیارہ ستمبر دنیا کے لیے ایک غیر معمولی اور حیرت انگیز دن ہے،جب پرانی اقدار کا خاتمہ ہوا مشرق اور مغرب کے درمیان ایک نیا تعلق سامنے آیا۔اس کے نتیجے میں امریکہ نے اپنا رویہ اچانک مسلم ممالک کے خلاف تبدیل کر لیا۔ یہ واقعہ بظاہر تو امریکہ کی ریاست میں وقوع پذیر ہوا لیکن اس کے غیر معمولی اثرات پوری دنیا پر رونما ہوئے اور اس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ بالخصوص اس کے اثرات زیادہ تر اسلامی ممالک پر پڑے اور اس واقعے کو پاکستانی افسانہ نگاروں نے ایک موضوع کے طور پر پیش کیا۔۹/۱۱ کے دردناک سانحے نے پوری دنیا پر ایک غیر معمولی اثر چھوڑا اور اس پس منظر میں لکھے گئے تمام افسانوں میں دہشت کا اثر پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہوا۔ دہشت گردی نے نئی صدی میں پوری دنیا کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔بظاہر یہ

اصطلاح اپنا ایک سیاسی اور معاشی مقام رکھتی ہے۔ اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ دہشت گردی کرنے والے تمام گروہوں کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہوتا۔

محمد حمید شاہد کے اکثر و بیشتر افسانے ۹/۱۱ کے سانحے کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں خاص طور پر ان کا افسانوی مجموعہ "دہشت میں محبت" قابل ذکر ہے حمید شاہد کے افسانوں نے بعد میں آنے والوں کے لیے نئے راستے ہموار کیے ہیں، انہوں نے اپنا رشتہ دھرتی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔

ارد گرد کے ماحول سے جب انسان تھک جاتا ہے تو وہ ایسی جگہ تلاش کرتا ہے جہاں اسے قلب سکون حاصل ہو سکے تاکہ وہ دنیا کو بھول کر مالک حقیقی سے رابطہ میں رہ سکے۔ دنیا میں بالخصوص پاکستان میں مساجد سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ عہد حاضر میں یہ جگہیں بھی اب غیر محفوظ ہو چکی ہیں۔

دور حاضر کے ایک نہایت معتبر افسانہ نگار **مبین مرزا** ہیں۔ جنہوں نے اپنی کہانیوں میں موجودہ صورت حال کا نوحہ پیش کیا ہے کہ ڈر اور خوف نے انسانی زندگی اور نفسیات پر کس حد تک اثر کیا ہے۔ شب و روز لوگ نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہو رہے اور اسی خوف میں ہیں کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے اور شاید یہ ہماری زندگی کا آخری دن ہو گا اسی حوالے سے مبین مرزا کا افسانہ "دام وحشت" لکھا ہے۔ جو اسی صورت حال کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس کا اصل کردار شیخ سخاوت علی ہے جو کراچی میں ایک مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے کے لیے جاتا ہے۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر مسجد کے اندر موجود ہے لیکن ذہنی طور پر وہ عورتوں کے جسمانی خدوخال میں گم تھا جبکہ مسجد کے امام منبر رسولؐ پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ یہ ذہنی بگاڑ نفسیاتی حوالے سے وقوع پذیر ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کی بیوی امریکہ جا چکی تھی۔ اس کی جنسی خواہش اس کو بے چین کیے ہوئے ہے۔ اور جلد ہی وہ دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے ایک نئی زندگی شروع کرتا ہے۔

> "جوان اور صحت مند شیخ سخاوت علی نے بیوی کے جانے کے بعد چند مہینے تو خاموشی اور صبر سے گزار لیے لیکن پھر عورت کی ضرورت پریشان کرنے لگی۔ وہ بہت متقی پرہیز گار تو نہیں تھا لیکن اب سے پہلے اسے اوباشی کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ دوستوں کے ذریعے سبیل بن گئی اور پھر عورتیں اس کی زندگی میں داخل ہونے لگیں۔ اس شہر میں کسی چیز کا حصول ناممکن نہیں تھا۔ سب کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا بس جیب میں روپے ہونے ضروری تھے اور ان بدلتے ہوئے حالات میں

بھی اس کی جیب میں اتنے روپے تو ہر وقت ہی رہتے تھے کہ ۔۔۔۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک گڑ بڑ ہو رہی تھی کسی بھی وقت اور کہیں بھی بیٹھے بٹھائے اس کے ارد گرد کا منظر بدل جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں کا ہجوم اطراف میں اکٹھا ہو جاتا۔ جوان، خوب صورت اور دل کش عورتوں کا ہجوم ۔۔۔۔ جن میں جسمانی خطوط زیادہ نمایاں اور دل کش ہو جاتے۔ اتنی عورتوں سے ملنے کے بعد وہ سوچنے لگا تھا۔ مختلف تو کچھ نہیں ہوتا۔ ہر بار ایک ہی تجربہ ایک ہی طرح کا نتیجہ۔ یکسانیت کا احساس لذت کم کرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ لذت کم ہو رہی تھی اور خواہش بڑھ رہی تھی ۔۔۔۔ لیکن اب اسے صورت حال سے وحشت ہونے لگی تھی۔"(۷۸)

وہ جمعہ کے دوران انہیں سوچوں میں محو تھا کہ اسی دوران اس کی نگاہیں ایک مشکوک شخص پر رکیں۔ اس کہانی کے ہیرو شیخ سخاوت علی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ مشکوک شخص کوئی خود کش حملہ آور ہے جو جلد ہی خود کش حملہ کرے گا۔ لیکن ساتھ ہی ذہن میں یہ خیال آیا کہ مسجد میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ دروازے پر گارڈ اور بم ڈسپوزل اسکواڈ مقرر تھے۔ دوران جمعہ وہ شخص نفسیاتی طور پر اسی کشمکش میں تھا۔ یہاں تک کہ دوران نماز اس کے سماعت میں قرأت کی جگہ زخمیوں کی آہ و بکار تھی۔ کسی بھی وقت زور دار بم پھٹے گا اور سب ختم ہو گا۔ اسی دوران امام صاحب کی آواز آتی ہے۔ "السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔" امام صاحب کی آواز اس کے کان پڑی۔ اس نے بھی یہی الفاظ دہراتے ہوئے دائیں بائیں گردن گھمائی۔ نماز مکمل ہو چکی تھی۔ شیخ سخاوت علی نے اضطرابی انداز میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ آدمی اپنی جگہ موجود تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ خود اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ وہ سر سے پاؤں تک ویسے کا ویسا زندہ سلامت تھا۔ کوئی خراش تک نہیں آئی تھی۔ بم نہیں پھٹا تھا۔ دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔

اگرچہ امریکہ نے عرصہ دراز پہلے ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹمی بم برسائے تھے لیکن آج تک اس کے اثرات ختم ہونے کو نہیں آرہے۔ اگر اب ایسا واقعہ رونما ہوا تو اس کی تلافی شاید ممکن نہ ہو سکے گی۔ شہروں کے شہر تباہ و برباد اور ملبے کا ڈھیر بن جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ تابکاری اثرات عرصہ دراز تک رہتے ہیں۔ اس تباہی و بربادی کی تصاویر اکثر و بیشتر افسانوں میں دکھائی گئی ہے۔ اس حوالے سے مبین مرزا نے بھی اپنی کہانیوں میں اس کا بیان کیا ہے۔

مبین مرزا کا افسانہ "خواب میں ہارا ہوا آدمی" قابل ذکر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کیسے ایک عام آدمی ایٹمی دھماکوں سے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور صورت حال اس حد تک گھمبیر ہو جاتی ہے کہ لوگ یہاں تک سوچنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد ہی پیدا ہی نہیں کریں گے کیونکہ اولاد کا غم، مسائل اور مشکلات والدین سے نہیں دیکھی جاتی ہے۔

> "صبح اٹھے تو بولے کوئی بھی آدمی جسے اپنی ہونے والی اولاد سے محبت ہو اسے چاہیے کہ بچے پیدا نہ کرنے کا تہیہ کر لے۔ میں بازو تھام کر بیٹھ گئی کہ سراج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کن سوچوں میں گم ہیں؟ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سائرہ! میں بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دنیا خراب ہو چکی ہے۔ یہ کسی امن پسند اور محبت کرنے والے آدمی کے رہنے کے لائق نہیں رہی۔ سیاست دانوں اور ایٹم بموں کے نرغے میں آئی ہوئی اس دنیا میں اپنی اولاد کو لانا اس کے ساتھ بد ترین ظلم کرنا ہے۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم بچے پیدا نہیں کریں گے۔ ہم ایسے بچوں کو اقتدار پرستوں اور ایٹم بموں کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے۔"(۷۹)

آج کے دہشت زدہ ماحول میں انسان اس قدر پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ اس حد تک سوچ لیتا ہے کہ اب انہی مزید نسل تک نئی بڑھائے گا کیونکہ یہ دنیا اب مزید رہنے کے قابل نہیں ہر طرف لا قانونیت ہے ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے دنیا میں سنگینی اور حیرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور بڑے انوکھے انداز سے ماحول کی منظر نگاری کی گئی ہے۔ حساس لوگوں کے لیے ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال نفسیاتی امراض کو بڑھانے کا سبب ہے۔ یہ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ لوگوں کی سوچ وچار ہی بدل گئے ہیں۔

افسانہ "سفید پردہ" میں مبین مرزا نے پوری کہانی کو کرداروں کے ذریعے سمیٹا ہے اور دو لڑکوں کی بات چیت سے پورے افسانے کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ کہانی ایک متوسط گھرانے کی ہے جس میں گھر کا سربراہ (والد) اصول پسند آدمی تھا۔ بیٹا اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد بے روزگار رہتا ہے۔ بارہا کوشش کے بعد بھی نوکری نہیں ملتی، بیٹا گھر والوں سے کہتا ہے کہ کسی سے سفارش کروا دیں مگر گھر والے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آخر کار بے روزگاری سے تنگ آ کر وہ ایک تنظیم میں آنا جانا شروع کر دیتا ہے۔ تنظیم کے خلاف کاروائی کے دوران وہ مارا جاتا ہے اور گولیوں سے چھلنی لاش ایک دن گھر پہنچ جاتی ہے۔

ایک رات "بالم بھائی" جو ان کے گھر کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ انہوں نے خالد کو رات بلایا۔ خالد اس چیز سے بے خبر تھا کہ وہ پہلے سے کسی آپریشن کی تیاری کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر کسی وجہ سے ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا اور وہ اسی جگہ قید ہو کر رہ گئے۔ خالد ان تمام حالات و واقعات سے بے خبر تھا۔ وہ شخص جس نے کبھی ہتھیار کو چھو کر نہیں دیکھا تھا، آج کلاشنکوف اس کے ہاتھ کے نیچے تھی۔ یہ سارا معاملہ اس کی بے خبری میں ہوا تھا۔ آخر کار وہ لاعلمی میں مارا گیا۔

> "چند لمحوں بعد وہ بلڈنگ کے آہنی دروازے پر تھا۔ اس نے رک کر دیکھا۔ گلی میں فرح کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ گلی کے درمیان تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے سوچا وہ وہیں رک کر فرح کا انتظار کرے مگر جیسے کوئی قوت دھیرے سے دھکیل کر اسے آگے لے آئی۔ باہر آکر وہ ایک پل کے لیے ٹھٹکا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کئی پٹاخے ایک ساتھ چھوئے اور ہواؤں کے کئی جھونکے باریک باریک کنکریوں کی طرح اس کے جسم سے آکر ٹکرائے۔ اسے لگا ہواؤں نے اسے پیچھے کی طرف اچھالا اور اس کے بدن میں سے راستہ بناتی ہوئی گزر گئیں۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ گرتے ہوئے اس نے فرح کی چیخ سنی، "نہ۔۔۔۔۔۔۔ہیں۔۔۔۔۔۔ ں ں۔۔۔۔۔ں ں۔۔۔۔ں ں!" "اسے کچھ اور پٹاخوں کا شور سنائی دیا، پھر بھاری بھاری بوٹوں کی دھمک محسوس ہوئی اور ساتھ ہی گہری، بہت گہری نیند تیزی سے اس پر طاری ہونے لگی۔"(۸۰)

افسانہ "خوف کے آسمان تلے" کراچی کی موجودہ صورت حال کا نوحہ ہے۔ جہاں کسی بھی وقت کہیں بھی حالات یکسر بدل جاتے تھے لوگوں کو پر یقین نہیں ہوتا کہ وہ شام خیر خیریت سے واپس آجائیں گئے۔ ہر وقت لوگوں کے ذہنوں اور چہروں پر خوف اور اضطراب ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انسانیت ختم ہو گئی ہے۔ مگر دوسری جانب نہتے اور بے بس لوگوں کے اندر انسانی جذبہ آج بھی زندہ ہے اور آپس کے مسائل و مشکلات کو سمجھتے ہیں۔

لوگوں کو ذہنی طور پر اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ ان کو جبراً گھروں سے نکال کر پولنگ اسٹیشن پر لے جایا جاتا ہے اور مرضی کے مطابق مہر لگوائی جاتی ہے اسی موقع پر انسانیت کو بھی اپنی شکست خوردگی کا احساس ہوتا ہے۔ مختلف گروہوں نے مختلف جگہوں پر قبضے کیے ہوئے ہیں، شہریوں کو یرغمال بنا لیا جاتا ہے۔ یہیں سے

لوگوں کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے وہ کام کرنے پڑ جاتے ہیں جن کے کرنے کو ضمیر نہیں مانتا۔ ہر وقت خوف و ہراس میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہر طرف تاریک سائے مجسم محسوس ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی مرضی سے ووٹ بھی نہیں ڈال سکتے۔

"پروفیسر صاحب ووٹ کا پرچہ لے کر بیلٹ باکس کے پاس گئے جو وہیں ایک طرف سب کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ووٹ ڈالنے والا سب کے سامنے مہر لگا کر پرچہ بیلٹ باکس میں ڈال دیتا تھا، پروفیسر صاحب گھر سے تہیہ کر کے آئے تھے کہ ووٹ نہیں دیں گے۔۔۔۔۔۔اس لیے جب مہر اٹھائی تو ان کا ہاتھ خود بخود دوسرے خانے کی طرف بڑھ گیا۔۔انہوں نے ایک غیر اہم امیدوار کے خانے پر مہر لگا دی۔ یہ صوبائی الیکشن کا پرچہ تھا۔۔۔۔انہوں نے دیکھا کہ ایک اور آدمی ووٹ کے پرچے تھامے ان کے قریب پہنچ چکا ہے۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا تو واقعی تین آدمی دائیں بائیں ذرا فاصلے پر یوں کھڑے تھے جیسے ووٹ ڈالنے والے کی نگرانی کر رہے ہوں۔"(۸۱)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک شکست خوردہ معاشرے کی تصویر کشی ہے جس میں خوف و دہشت کی فضا نے ہر خاص و عام کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں دہشت گردی کا شکار وہ لوگ ہیں جن کو گن پوائنٹ پر کٹھ پتلی بنا کر اپنے اشاروں پر نچایا جا رہا ہے۔ معاشرے کی اجتماعی شکستگی کا بار بار احساس نظر آتا ہے۔

افسانے کی کہانی مزید اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ:

"ایک دفعہ ایک جماعت کے گروہ نے پروفیسر صاحب کو اچھا خاصا خوف زدہ کر رکھا تھا۔ الیکشن قریب تھے، پروفیسر صاحب اس تنظیم کو ووٹ دینے کے حق میں نہ تھے، مگر اتنا بھی جانتے تھے کہ بغاوت کرنے کی صورت میں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ کیونکہ ان کی تین جوان بیٹیاں تھیں، ایک چھوٹا سا بیٹا اور بیوی تھی۔ پورا گھرانہ مجبور ہو کر ووٹ دینے کے لیے پولنگ اسٹیشن چلا جاتا ہے اور یہاں تک کہ اپنی مرضی کے خلاف پروفیسر صاحب ان کے کیمپ میں چلے جاتے ہیں۔ کیمپ والوں کو مٹھائی کا وعدہ کر آتے ہیں، سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ وہ لوگ ٹھیک نہیں ہیں۔ پورا شہر ان سے تنگ ہے۔ بغاوت کی صورت میں پورے گھر کو عتاب کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ فیصلہ ان کو اپنے گھر والوں کی خیر و عافیت کی خاطر کرنا پڑا، لیکن ضمیر ان کو ملامت کرتا رہا۔"
(۸۲)

اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک منفرد افسانہ ہے جس کو مبین مرزا الگ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ المختصر! ان کے تمام افسانے خوف، دہشت، جبر اور اضطراب کی بہترین نفسیاتی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ مبین مرزا کا اس مخصوص ماحول سے براہِ راست تعلق ہے۔ اسی تعلق کی عکاسی ان کی تمام تخلیقات میں واضح دکھائی دیتی ہے۔

زاہدہ حنا صنف افسانہ نگاری میں کسی تعارف کی محتاج نہیں اور یہ مقام و مرتبہ ان کی شب و روز کی ریاضت اور سوچ وبچار کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو افسانہ نگاری میں جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ شاہد ہی ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں سے کسی کو حاصل ہوئی ہو گی۔ موضوع میں وسعت اور تکنیک نے جو تجربات زاہدہ حنا کے یہاں ملتے ہیں وہ کسی اور کے افسانوں میں نہیں ملتے۔ ان کے افسانوں میں دور جدید کے ثقافتی اور تہذیبی رنگ بڑے نمایاں اور منفرد انداز میں سامنے آئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں رونما ہونے والے تمام سانحات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ایک تاریخ کا حوالہ بن چکے ہیں۔ دراصل انہوں نے اپنے افسانوں میں ایسے موضوعات کو زیر بحث لایا ہے جو سیاسی، سماجی، تاریخی سانحات کے بطن سے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

اس حوالے سے زاہدہ حنا کا افسانہ "کم کم آرام سے ہے" امریکہ کی افغانستان پر کی جانے والی تباہی و بربادی کا نوحہ ہے کہ کس طرح امریکہ نے افغانستان میں تباہی و بربادی کی ایک نئی مثال قائم کر دی ہے۔ اس افسانے میں کم کم ایک خط کے ذریعے اپنی دادی کو صورت حال سے آگاہ کرتی ہے جو کہ افغانستان میں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ رہائش پذیر ہے تمام حالات و واقعات کو پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

> "ہم بامیان گئے تو کچھ دیر کے لیے وہاں گئے جہاں پہاڑوں کی اونچی اونچی چٹانوں کو تراش کر مہاتما بدھ کی مورتیاں بنائی گئی تھیں۔ چنگیز خان نے پوتے کے انتقام میں بامیان کا کوئی جاندار جیتا نہیں چھوڑا تھا۔ طالبان نے اپنا غصہ پتھر کی مورتیوں پر نکالا۔ چنگیز خان اور اس جیسے دوسرے بادشاہوں، راجاؤں، مہاراجوں کا غصہ ان شہروں پر اترتا تھا جو ان کے راستے میں آتے تھے اور ان کی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے تھے لیکن دادی اماں! امریکہ کا غصہ تو قندھار سے قندوز اور خوست سے قلعۂ جنگی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے لڑاکا ہوائی جہاز تورا بورا اور طالقان پر بمباری کرتے ہیں۔ یہاں کی دھرتی میں بارودی سرنگیں یوں بوئی گئی ہیں جیسے کسی کھیت میں بیج چھڑک

دیے جاتے ہیں۔ موت کے بیچ۔ بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب ہی ان کا نوالہ بنتے رہتے ہیں۔"(۸۳)

یہ صرف معصوم افغان بچی پروین کی کہانی نہیں بل کہ تمام بچوں کی داستانِ غم ہے۔ جن کی قابلیت کو دہشت گردی نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے بلکہ پروین سے اس کے معصوم بچپن کی خوشیاں تک لے لی اور اپنی عمر سے بڑھ کر وہ سب سیکھ گئی جو بڑی عمر میں جا کر سمجھ بوجھ ملتی ہے اس کے گھر والے امن وسکون کی خاطر گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے باجوڑ پہنچتے ہیں لیکن اس گھرانے کو یہاں پہنچ کر بھی سکون میسر نہیں ملتا۔

امریکی افواج نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی ہے اور اس حد تک تباہی برپا کر دی ہے کہ وہ سرزمین کاشت کاری کے قابل بھی نہیں رہی۔ انتقام کی آگ میں آج بھی طالبان جانیں قربان کیے جا رہے اور ان کا غصہ ٹھنڈا تک نہیں ہو رہا۔

"میں نے جب کئی طالبان لڑکوں کی مرہم پٹی کی، کچھ کا آپریشن کیا تو انہیں غور سے دیکھتی رہی، جن کے سروں پر بچپن میں کسی گھر کی چھت نہ ہو، جنہیں اپنی گود میں بٹھا کر کلیجے سے لگانے والیاں اور لگانے والے نہ ہوں،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دنیا طالبان کو برا بھلا کہتی ہے، میں بھی یہاں آئی تو ان کے لیے میرے دل میں غصہ اور نفرت تھی لیکن یہاں رہ کر وہ میری سمجھ میں آ گئے۔ کسی غریب اور بنجر ملک کے بچوں سے جب ان کا بچپن چھن جائے۔ جنہیں بڑی بہنوں نے انگلی تھام کر سہج سہج چلایا نہ ہو، ان سے آنکھ مچولی نہ کھیلی ہو، پھر وہاں طالبان ہی اٹھتے ہیں اور وہ نفرت کرتے ہیں عورتوں کے نام سے۔"(۸۴)

نائن الیون کے سانحہ کے بعد ظلم و ستم کی ایسی داستان رقم کی جا چکی ہیں، جن کو تاریخ کے اوراق کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان گنت بے گناہ اور معصوم لوگوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ تاریخ اس گھناؤنے مظالم کو فراموش کر سکتی ہو گی، مگر ادیب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ لوگوں کی تکالیف اور آہ و بکا آسانی سے سن اور سمجھ سکتا ہے۔ اس حوالے سے زاہدہ حنا کا ایک اور اہم افسانہ "نیند کا زرد لباس" ہے جس میں تیرہ برس کی ایک افغان بچی کے انتہائی گہرے تجربات، مشاہدات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو خداداد صلاحیتوں اور تلخ تجربات کی بدولت اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں سیکھ چکی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ کابل آباد تھی، حالات کی سنگینی کے باعث انہیں باجوڑ جانا پڑا لیکن ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ اعلیٰ حکام کی

طرف سے حکم جاری ہوا کہ باجوڑ کا علاقہ جلد خالی کر دیا جائے۔ بالآخر یہاں سے بھی ہجرت کرنی پڑی اور دوبارہ کابل جانا پڑا۔ راستے میں بمباری شروع ہوئی جس میں پروین زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس فانی دنیا سے کوچ کر گئی اور اس کے ہاتھ سے ایک خط ملا جو امریکی صدر کے نام تھا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ :

"عالی جناب !

آج ہماری عید کا دوسرا دن ہے، جب میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ ہر سال آپ دنیا کے تمام مسلمانوں کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ ان کی خوشیوں کے لیے دعائیں کرتے ہیں لیکن پھر فوراً ہی اپنی دعاؤں کو قتل کرنے کے لیے بمبار بھیج دیتے ہیں۔ میرا نام پروین ہے جناب ! میں ۱۰ برس کی تھی جب آپ نے مجھے کابل سے نکال دیا۔ ہم وہاں سے نکلتے نہیں تو اور کیا کرتے ؟ بم آپ نے بنائے ہوئے تھے، بمبار آپ کے بھیجے ہوئے تھے اور وہ ہمارے گھر اڑا رہے تھے۔ میری بہن پروانہ اور بھائی جلال اس بمباری میں مارے گئے۔ آپ نے میرے بھائی بہن چھینے۔ میرا شہر، میرا گھر، میری گلیاں، میرا بچپن ،میرے خواب چھینے ۔۔آپ نے میری ہتھیلی بھی چھین لی۔۔۔۔۔۔۔۔۔امریکی بچے بارودی تتلیوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ یہ تتلیاں خاص طور پر ہمارے لیے بنی تھیں۔ سنا ہے آپ جب اپنے بچوں کے لیے کھلونے بناتے ہیں تو ان کے ڈبوں پر ان سے کھیلنے والے بچوں کی عمر بھی لکھ دیتے ہیں لیکن آپ نے ہمارے لیے ایسے کھلونے کیوں بھجوائے تھے جو ہماری جان لے لیں جو ان کی ہتھیلیاں اور ان کے پیر ساتھ لے جائیں ؟۔"(۸۵)

اس خط میں معصوم بچوں کا نوحہ جس انداز میں بیان کیا گیا ہے ،وہ قابل دید ہے۔ دور حاضر کے وہ معصوم پھول، جن کے کھلونوں سے کھیلنے کے دن ہیں، وہ اس دہشت زدہ ماحول میں اپنے ذہنوں میں بارود اور اسلحے سے ہونے والی تباہی کا خوف پال رہے ہیں۔ جس سے ان کی نفسیات پر بھی گہرا اثر پڑا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف اس حوالے سے کہتی ہیں:

"یہ طویل خط افغانستان کے بچوں کی فریاد ہے جس میں تتلیوں کی شکل کے بم برسانے سے لے کر، بچوں کی آنکھوں کے سامنے ان کے ماں باپ کو ظالمانہ طریقے سے مار ڈالنے کے مظالم کا شکوہ ہے۔ یہ خط اس منافقت کا پردہ چاک کرتا ہے۔ جس کے تحت

بموں کے ساتھ ساتھ خوراک کے بنڈل بھی طیاروں سے پھینکے جاتے ہیں۔افغان بچوں اور امریکی بچوں میں کیا فرق ہے۔"(۸۶)

"نیند کا زرد لباس" میں افسانہ نگار معصوم بچی کے ذریعے تلخ حقائق کو منظر عام پر لائی ہیں، جو ہو سکتا ہے کبھی کوئی مؤرخ بھی سامنے نہ لا سکتے۔ جیسے وہ کہتی ہیں کہ اس کے پس منظر میں کون سے حقائق پوشیدہ ہیں؟ کیا وہ خود بخود پیدا ہو گئے تھے؟ اور ان کی تربیت کیا ہوئی؟

"آپ ذرا یوں سوچیں کہ یہ آپ کے بچے ہیں۔ بھتیجے، بھانجیاں یا پڑوسیوں کے بچے۔ آپ ذہن میں منظر لائیں کہ آپ کا بیٹا زخمی ہے۔اس کا ہاتھ یا پیر کاٹ دیا گیا ہے۔ وہ درد سے چیخ رہا ہے۔ مگر آپ اس کے درد کو دور کرنے کے لیے یا اس کو آرام پہنچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔اس کا تصور کریں کہ آپ کی بیٹی کسی ایسی عمارت کے ملبے تلے دبی رو رہی ہے۔جو گر گئی ہے۔ مگر آپ اس کو باہر نہیں نکال سکتے۔ذرا تصور کیجیے کہ آپ کے بچوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور اب وہ سڑکوں پر بھوکے پیاسے تنہا بھٹکتے پھر رہے ہیں۔"(۸۷)

ایک اور افسانہ "رقص مقابر" افغان جنگ کے حوالے سے لکھا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح افغانستان کی پر امن زندگی تباہی و بربادی اور دہشت میں تبدیل ہوئی۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جس کو طبع کرنے کی کسی بھی رسالے یا جریدے کو ہمت نہ ہو سکی۔آخر کار اس کہانی کو پہلی دفعہ انڈیا سے شائع کرانا پڑا۔ سارا افسانہ اپنے اندر خون کے آنسو لیے ہوئے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس دھرتی کی خون کی پیاس کبھی بجھتی ہی نہیں ہے۔پوری کی پوری کہانی ہی خون میں لتھڑی پڑی ہے۔

"لوگ بھاگ رہے ہیں۔ گرتے پڑتے، ٹھوکریں کھاتے، گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے، آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے شہر اور دیہات، کھیت اور باغات، بارودی سرنگوں سے اٹے ہوئے، ہٹے ہوئے ہماری عظیم طاقتوں کی ایجادوں سے پناہ کہیں نہیں۔ بچے باپ سے محروم، ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ندارد۔ کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئی۔میری نگاہوں میں اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ کابل کے وہ وارڈ گھوم جاتے ہیں جہاں میں نے ان سینکڑوں معذور بچوں کو دیکھا تھا جو لینڈ مائیز اور بلائینڈ راکٹوں کا شکار ہوئے۔ سوراخ

دار ہڈیاں، کھوپڑیاں چٹخی ہوئی۔ کسی کے دونوں ہاتھ کسی کے دونوں پیر کٹے ہوئے یہ جوئے خون ہے۔۔ یہ جوئے خون ہے۔"(۸۸)

آخر یہ طالبان کیسے پیدا ہوئے ؟ان کا بیج کس نے بویا تھا؟ یہ کیسے پروان چڑھے ؟ یہ ایک دو دن کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے اچھا خاصا وقت اور پیسہ درکار ہے۔ان کی پشت پناہی کرنے والا کون ہے ؟اس حوالے سے مصنفہ اس پر سخت تنقید کرتی ہیں۔

"ان گستاخوں کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔انہیں ہل چرخی کے زندان میں بند کیا جائے۔ہم کفار کو تہس نہس کرنے آئے ہیں اور ہمیں اسلحہ چاہیے خواہ وہ افرنگی ہو یا امریکی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ دشمنان اسلام ہیں۔ ہم اسی کی جان بخشی کریں گے جو ہماری سربراہی تسلیم کرے۔۔۔۔۔اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی ؟ایک اور فوج خون کابل کے سر سے گزر رہی ہے۔دنیا بھر میں سوالوں کا ایک ہجوم ہے یہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کون ہے ان کے پیچھے ؟۔"(۸۹)

طالبان نے عورتوں کے حوالے سے خود ہی اصول وضوابط متعین کیے ہوئے تھے۔ جس میں ان کا گھر سے باہر نکلنا سختی سے منع تھا۔وہ اسکول کالج نہیں جاسکتی تھیں اور نہ ہی ملازمت کے سلسلے میں۔چاہے وہ غربت کی وجہ سے ہی کیوں نہ مر جائیں۔عورتوں کے لیے دھمکی بھی ہے کہ اگر وہ گھر سے باہر نکلیں تو ان کی ٹانگیں اور پاؤں کاٹ دیے جائیں گے اور بلاوجہ باہر جانے سے عورتوں پر آسیب ہوتا ہے۔افغانستان میں دہشت اس قدر زیادہ ہے کہ یہ سب دیکھ کر انسانی روح پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔لوگ آپس میں ایک دوسرے کا قتل عام کر رہے ہیں اور اس کام کو باعث سعادت سمجھتے ہیں۔بغیر کسی ثبوت کے ایک دوسرے پر فتوے جاری کیے جارہے ہیں۔ آج یہ دھرتی انسان کے لیے عذاب بن چکی ہے۔لوگوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔جو لوگ زندہ بچ گئے ہیں وہ دوہرے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یہاں تک کہ وہ فاقوں کی وجہ سے ہڈیاں تک فروخت کرنے کو تیار ہیں کہ اس کے بدلے روٹی مل جائے۔

"شور سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔گلی میں شاید بہت سے بچے آوازیں لگا رہے ہیں۔ان کی آوازیں میری سمجھ نہیں آتیں۔میں سر کو جھٹکتی ہوں اور اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں ۔بچوں کا ایک ہجوم ہے جو گلی سے گزر رہا ہے۔ آوازیں لگاتا ہوا۔"ہڈیاں لے لو اور نان دو۔۔۔۔۔۔نان دے دو اور ہڈیاں لے لو۔"ان کے شانے

بڑی بڑی بوریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہیں ۔۔۔۔میں گردن گھما کر دیکھتی
ہوں۔دور تک کھلی ہوئی قبریں۔ان میں اترتے ہوئے بچے ہڈیاں چنتے ہوئے۔"(۹۰)

اس افسانے میں افغانستان کی خستہ حالی کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔امریکہ کے تسلط کے بعد وہاں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے انسانی ہڈیاں برائے فروخت ہیں۔بچے قبروں سے ہڈیاں لے کر ان کو فروخت کر کے اپنے پیٹ پال رہے ہیں، جو کہ نہایت عبرت کا مقام ہے۔افسانہ نگار نے ایک افسانے میں ہی پورے افغانستان کی کہانی کو قلم بند کر دیا ہے۔لوگوں کی مشکلات اور ان کے درپیش مسائل کو مختصر مگر جامع انداز میں ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔

طاہرہ اقبال کا نام عہدِ حاضر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔تاحال ان کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں متعدد موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔جس میں سیاست دانوں کی چالاکیاں، لوگوں کو بے وقوف بنانا، عام آدمی کے مسائل اور ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے کافی موضوعات ملتے ہیں۔لیکن دیگر موضوعات کے علاوہ ان کا ایک خاص زیر بحث موضوع دہشت گردی بھی ہے۔

دور جدید میں دہشت گردی کا مسئلہ پوری دنیا کے لیے ایک گھمبیر مسئلہ بنا ہوا ہے۔اس مسئلے سے دنیا کے تمام لوگ متاثر ہوئے ہیں۔روح ارضی میں کوئی ریاست ایسی نہیں جو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکی ہو۔ سائنس کی نت نئی ایجادات نے جہاں انسان کو سہولیات فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، وہیں بے شمار مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔ایٹم بم کا منظر عام پر آنا اس دہشت گردی کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جو نسل انسانی کی تباہی و بربادی کا سبب بنا اور اس جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہیروشیما اور ناگاساکی کی سرزمین پر کیا گیا۔جس کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ متاثر ہوئے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔آئے روز دہشت گردی سے متعدد ریاستیں، گھرانے اور افراد تاریکی میں ڈوب رہے ہیں۔آنے والے وقت کے بارے میں حتمی رائے نہیں دی جاسکتی کہ کب کیا ہو جائے۔دنیا میں پاکستان ایک ایٹمی طاقت کے طور پر جانا جاتا ہے جہاں دہشت گردی کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔اردو ادب میں تقریباً ہر افسانہ نگار نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ان میں ایک نام طاہرہ اقبال کا بھی ہے۔

دہشت گردی کے حوالے سے طاہرہ اقبال کا اہم اور غیر معمولی افسانہ "یا پروردگار" ہے۔جو بیک وقت ہمارے سامنے دو پہلو لاتا ہے۔جس کا آغاز گھریلو مصائب سے ہوتا ہے، قریبی رشتے داروں اور گھریلو مصائب اور مشکلات کا اثر عام انسانی زندگی پر کس طرح وارد ہوتا ہے۔انسانی حقوق کو جب گھر کے اندر رہتے

ہوئے پاش پاش کیا جاتا ہے تو اس کے اثرات ملکی سطح پر کس طرح مرتسم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ہمارے قریبی عزیز واقارب ہماری بے عزتی کا سبب بنتے ہیں۔ یہ تذلیل صرف ایک فرد تک نہیں رہتی بلکہ اس کے اثرات بڑے بڑے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔

اس افسانے میں ایک فتین قسم کی لڑکی کو بغیر کسی وجہ کے طلاق ہو جاتی ہے۔ اس واقعے کا لڑکی اور اس کے گھر والوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ گھر والے لڑکی کی منگنی کا بندوبست کرتے ہیں لیکن جس دن منگنی ہو رہی ہوتی ہے، لڑکی کی خالہ طلاق کا ذکر کر کے حالات وواقعات کو سنگین بنا دیتی ہے۔

جب اس سارے واقعہ کا صائمہ کے بھائی کو چلتا ہے، جو کہ ایم بی بی ایس کا طالب علم ہوتا ہے، غصے میں آکر خالہ کے ہاں جاتا ہے کہ ان سے بات چیت کر سکے مگر وہاں پر پہنچنے کے بعد حالات اور ہی ہو جاتے ہیں۔ مستقبل کے ڈاکٹر اور صائمہ کے بھائی سے ایک بندہ زخمی ہو جاتا ہے اور وہ ۳۰۲ کے کیس میں جیل چلا جاتا ہے۔ جیل میں رہنے کے دوران اس کی ملاقات دہشت گردوں سے ہوتی ہے۔ صائمہ اس واقعے کو سہہ نہیں سکتی اور ذہنی عارضے میں مبتلا ہو جاتی ہے اور باپ بھی بیٹے کے غم اور انتظار میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماں کی ذہنی حالت کو طاہرہ اقبال اس طرح بیان کرتی ہیں:

> "لبیک لبیک کی صدائیں تہہ خانے کی دیواریں ہلا دیتیں۔ شہادت کے خانے میں نام لکھوانے والے بڑھ بڑھ کے ہاتھ کھڑے کرتے اور عاصم کا ہاتھ سب سے بلند ہوتا۔ موت کی طلب زندگی کا منہ چڑاتی۔ صائمہ کی ماں کے دل کا تار اس تہہ خانے سے جڑا تھا اور وہ جھولی پھیلائے کھڑی تھیں۔ "یا پروردگار" ہمارے بچوں کی شہادت کے تحفے کو قبول فرما کر تیری راہ میں دینے کو ہمارے پاس اور کچھ نہیں بچا، ہاں اگر ان بچوں کو اس قربانی سے بچانا ہے تو آسمانوں سے کوئی دنبہ اتار کہ دنیاوی دنبے تو کٹ گئے، یا اسیر ہو گئے، یا غلام ہو گئے اور عاملوں کے حکم کی بجاآوری میں معمولی بن گئے، یا خدا ! تو میری فریاد سن لے، ایسا نہ ہو کہ ایک دن سارے بچے کٹ جائیں اور تیری راہ میں قربانی دینے والا اس قوم میں کوئی نہ بچے۔"(۹۱)

دہشت گردی کے حوالے طاہرہ اقبال کا قابل ذکر افسانہ "سلیپنگ بیوٹی" ہے۔ اس افسانے میں اسکول کے عملے اور طالب علموں کے درمیان بحث ہوتی ہے۔ ادارے کی ہیڈ کے مطابق بچوں کو خطرات سے بچانے کے لیے ان کے بیچ جسمانی ورزشوں کا انعقاد ہونا ضروری ہے تاکہ بچوں کا ذہن موجودہ حالات وواقعات

میں الجھنے کی بجائے ترقی کی طرف رہے۔ ممبران اسکول کے باہمی مشورے اور تعاون سے ایک پروگرام کا بندوبست کیا گیا ہے۔ پروگرام میں بچوں نے ناقابل فراموش ذہانت کا ثبوت دیا۔ بچے گلابی لباس زیب تن کر کے آتے ہیں جس سے اسٹیج اور بچوں کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ پروگرام میں شامل تمام افراد اس تقریب کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور دلی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ نائن الیون کے حادثے نے دہشت گردی جیسے موضوع کو ایک نیا جنم دے دیا۔ اس سانحے کا اثر صرف میچور یا بڑی عمر کے لوگوں کے ذہنوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ چھوٹے معصوم بچوں نے بھی اس کا گہرا اثر لیا۔ اس واقعے نے ساری دنیا میں ایک خاص کوریج حاصل کی۔ خاص کر میڈیا نے اس واقعے کو بہت اچھالا۔ اس دور میں معصوم ذہن جو صرف گیمز اور کارٹون تک محدود تھے، اب خبروں میں عجیب و غریب اور قتل و غارت پر مبنی واقعات دیکھ رہے تھے۔ ان کے کچے ذہن دہشت کے سائے میں پروان چڑھ رہے تھے۔ ان کے لیے اب کھلونوں کی جگہ ہتھیاروں اور گولیوں کی زیادہ کشش تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کسی ایک رونما ہونے والے واقعہ کو میڈیا اتنا اچھال دیتا تھا کہ کوئی بچہ، بوڑھا یا جوان لاشعوری طور پر ان واقعات کے اثرات قبول کرنے کو تیار تھا۔ گویا ۹/۱۱ کے واقعہ کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ آج کی نسل شدت پسندی کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہے۔ اس واقعے کے بعد کرۂ ارض نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔

> "دنیا نے تباہ کاری وتاراجی کے ایسے عبرت خیز مظاہرے دیکھے ہیں جن کے سامنے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء، ۸:۴۸ صبح نیویارک شہر ممکن ہے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو، مگر بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ حادثہ اور اس کے عواقب ہمارے زمانے کی ایک تشکیلی حقیقت بن گئے ہیں۔ ایک تو اس سلسلے کا طریقہ واردات، دوسرے اس کا پیمانہ اور اثر کا دائرہ کار، آہستہ آہستہ نمایاں ہوتے ہوئے واقعات نے ایسی لفظیات بلکہ اندازِ خطابت کو جنم دیا جس نے جنگی جنون اور تاریخ کے بوسیدہ صفحات میں خوابیدہ تعصبات سے قوت حاصل کی اور جوابی کاروائی وانتقام نے بہت دور کے ایک چھوٹے سے ملک کو اس طرح نشانہ بنایا کہ پرائے گھر کے شعلوں کی آنچ ہمارے آنگن تک آ پہنچی۔"(۹۲)

"سلیپنگ بیوٹی" میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے وہ دہشت گردی اور اس کے ان مٹ اثرات کی عکاسی کرتی ہے۔ کہانی کا عنوان بھی ایک اقتباس پیدا کرتا ہے۔ "سلیپنگ بیوٹی" کو علامتی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مصنفہ نے افسانے کی ابتداء میں ایک فیملی کے ڈائینگ روم کا منظر پیش کیا ہے جس میں لوگوں کے ذہنوں

پر حالات حاضرہ کی دہشت زدہ خبروں کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ ٹی وی پر آنے والی خبروں میں جب ایک معصوم بچہ "انیق" ظلم، لہو اور آنسو دیکھتا ہے تو اپنے باپ سے اس کے متعلق سوالات کرتا ہے:

"پاپا! ایسا ہی کچھ بہہ رہا تھا نہ اس لڑکے کے گال سے جو ابھی ابھی ٹی وی پر دیکھا تھا۔ اس خوفناک حد تک مضحک خیز تشبیہ پر دونوں ماما پاپا نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن ہنسی ان کے مخرج سے نکلنے کے بجائے مسوڑھوں کی جڑ میں گھر گھرائی جس میں کچھ نمکین سا گندھا تھا۔۔۔۔۔۔ٹی وی سکرین لال تھی۔ ماما کی آنکھیں لال تھیں۔ پاپا کے مسوڑھے سوچ کر لال ہو گئے تھے اور اس کے اپنے گال سے ٹپکتا سوئیوں کا لچھا بھی لال تھا۔ ماما نے ٹانگ کی بوٹی اس کی پلیٹ میں ریزہ ریزہ کر دی جس کی اندرونی سطح پر کچھ برگنڈی سا جما تھا۔ "پریوں، جنوں، شہزادوں اور نیک صفت بزرگوں کی شبیہیں کیوں گم ہو گئی ہیں، ہمارے بچوں کے خوابوں سے۔"(۹۳)

بچے کے ایک سوال نے ماں باپ کے ذہنوں میں مزید کئی سوال پیدا کر دیئے۔ شہروں میں ہونے والی سفاکی و رہزنی نے لوگوں کو بھی پتھر دل بنا دیا ہے، ایک معصوم بچہ جب ایسے ماحول میں آنکھ کھولتا ہے جہاں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اس کا معصوم ذہن ایسے واقعات کو دیکھنے لگے۔ ایک خوف اور سراسیمگی کا احساس اس کے لاشعور میں سرایت کر جاتا ہے۔ جو آگے جا کر سفاکی میں بدل جاتا ہے۔

"یہ تشنگی اور کسک صحرائی ریت کی طرح انیق کے دل و دماغ میں اس وقت بھی اڑتی رہی تھی۔ جب اسے سوال کرنا نہیں آتا تھا اس وقت بھی سوالوں کا منظر نامہ اس کے ذہن و نظر میں ترتیب پا رہا تھا۔ دھواں اور بارود، لہو اور اعضاء توڑ پھوڑ اور پتھر آخر کیوں؟ سب سوالیہ مناظر اس نسل کے دماغوں کی کھیتیاں انہی سوالیہ مناظر سے سیراب ہوتی ہیں۔ دماغ کی کوسچن شیٹ پر لکھے ہوئے سوالنامے جن کے سارے جواب سوال نما ہیں۔"(۹۴)

معصوم ذہنوں کی ناسمجھی کی عمر میں ہی خارجی مناظر شاید دودھ کے ذریعے ہی رگوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے کھلونے اس کے آس پاس ہونے والے آگ و خون کے واقعات کے چشم دید گواہ بن جاتے ہیں۔ بچپن سے ہی پستول، بندوق اور مشین گنیں ان کے کھلونوں کی جگہ لے رہی ہیں۔ انیق کے دل و دماغ پر بھی انہی واقعات کے گہرے نقوش تھے، اس کے سامنے روز ایسے لاتعداد مناظر پردہ سکرین پر چلتے تھے۔ جن میں آواز اور چہرے دونوں لہولہان ہوتے تھے اور بھاگنے والے آہنی نالیوں کی نسبت کم رفتار میں بھاگتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے گر جاتے تھے۔ انیق جلتے گوشت کی مہک محسوس کر سکتا تھا اور ماما کی آنکھوں میں خوف، دہشت اور غم کی تصویر واضح دکھائی دیتی تھی جیسے آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہو، وہ گرد جو پتھر کے شہروں میں اڑتی تھی اور یہی پتھر ان بچوں کے ہاتھوں میں تھے اور وہی پتھر کے غلیلوں میں ڈال کر گولوں کی طرح چلا کر پھینکتے تھے۔ جن کی بہتات ہوتی جارہی تھی اور کثرت سے جو چیزیں مہیا ہوں، بچوں کے لیے تو ان کو حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔

طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے میں ۹/۱۱ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ سکول میں بچوں نے کھیل کھیل میں پتھروں کے ذریعے کھڑکیاں اور گاڑیاں توڑ دیں۔ بچوں کی نظر میں یہ سب محض ایک گیم تھی۔ جس نے ہیڈ مسٹریس تک کو بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا تھا۔ میڈم کے سوالوں کا جواب محض یہی تھا۔From where did you learned it'' کہ تو بچوں نے یہ جواب دیا کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ے دوبارہ ان سے پوچھا کہ میڈم''Just a game'' جس نے سینئر سٹاف کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا نیوز بلیٹن گیمز سکھاتے ہیں۔ جبکہ ہیڈ مسٹریس کے دماغ میں ''From T.v News bulletin''ایک سوال بار بار ٹھاٹھیں مار رہا تھا کہ ہمارا کلچر بچوں کو وائیلنس سکھا رہا ہے۔ جب کہ پی ٹی ٹیچر ان کو تسلی دیتا ہے کہ بچوں کا ایسا کردار ادارے نہیں تعمیر کر رہے بلکہ جدید کلچر اور رجحانات ان کو بدل رہے ہیں اور ان کی اقدار بھی بدلتی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے بچوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان سب سے پسندیدہ موضوع بم، گولی، پستول وغیرہ ہی ہے۔ مگر اس سب نے ہیڈ مسٹریس کے ذہن پر گہرا اثر کر دیا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آج کی نسل میں قوت کا خوف دلوں سے اٹھ سا گیا ہے اور مرنے کی خواہش بڑھ گئی ہے جبکہ خودکشی اسلام میں حرام ہے۔ یہ ایک جنونی بیماری ہے۔ جس نے وبا کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی لیے وہ پی ٹی ٹیچر غفار کو تنبیہ کرتی ہیں کہ بچوں کو روایتی کھیلوں کی طرف راغب کریں۔ بچوں کی جس ماحول میں پرورش ہوتی ہے وہ اسی سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی سوچ بدل رہی ہے اور کھیل کے رجحان بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کا نصاب ان کے اپنے کلچر سے نہیں بلکہ یورپ سے بن کر آتا ہے۔ پیرنٹس ٹیچر میٹنگ میں بھی یہی سوال اٹھائے جاتے ہیں۔ جس میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے بچے آسودہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ جبکہ پسماندہ اقوام کے بچے بچپن جیسے حسین دور سے گزر رہی نہیں پاتے کہ ان کا بچپن ایک دھماکے یا قحط کی مار ہو جاتا ہے۔ آموں کی طرح انہیں قبل از وقت پکا لیا جاتا ہے اور بہت جلد ہی یہ

سب ان کو کرخت اور سائیکیک بنا دیتا ہے۔ ان سب حالات میں بچے فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جن کے دماغ غفلت کی بجائے شدت پسندی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

"جب تک بچوں کے دماغوں میں خوابوں اور تخیلات کی جگہ نہیں بنے گی۔ اس وقت تک ذہن پر گندگی جاری رہے گی۔ ابنارمل ذہن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اسے خواب دکھائی دینے بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے عہد کے بچوں نے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے ہیں۔ وہ ناموافق حالات پر صبر اور تدبر کی بجائے احتجاج کرتے ہیں۔ پر تشدد احتجاج کیوں کہ وہ کلر بلائینڈ ہو گئے ہیں۔ تصویر کا صرف ایک تاریک رخ انہیں نظر آتا ہے۔ نرم اور سبک جذبات کو غصے اور ہیجان نے لپیٹ دیا ہے۔ گویا ہمیں یہ بات مان کر آگے بڑھنا ہے کہ بچے ذہنی طور پر صحت مند نہیں رہے اور ذہنی صحت مندی کے لیے Creative activities کا ہونا ضروری ہے۔"(۹۵)

اساتذہ اور والدین کے درمیان ایک بات طے ہوتی ہے کہ بچوں کی مثبت سوچ کی طرف رہنمائی کرنی ہے، تاکہ وہ منفی رجحانات کی طرف راغب نہ ہوں، اس لیے ایک اسٹیج ڈرامے کا انعقاد کیا جاتا ہے تاکہ بچے مایوسی اور تشدد جیسے جذبات سے باہر نکلیں۔ سب سے پہلے ایک کھیل "سلینگ بیوٹی" منعقد کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے بہترین آرائشی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ رنگوں کا خوبصورت امتزاج کیا جاتا ہے تاکہ سکون اور خوشی کا احساس ہو۔ جادو گرنی والے سین نے کئی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے خاص کر کھیل کی شہزادی کی ماں اس سین کو دیکھ کر اشکبار ہو جاتی ہے، شہزادہ جس طرح شہزادی کو نیند سے بیدار کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس سے پورا ہال تالیوں سے گونج جاتا ہے۔ میڈم روبینہ عرصہ دراز کے سوئے ہوئے رومانی اور تخیلاتی جذبات ابھارنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ہر طرف شادیانے بج رہے تھے۔ خوشی کا سماں تھا۔ تالیاں گونج رہی تھیں کہ آن کی آن میں بلڈوزروں، ٹینکوں اور بمبار طیاروں کی صداؤں نے فضا کا سینہ چیر دیا اور ہر چیز پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ڈرامے کا اینڈ ایسا طے نہ ہوا تھا۔ مگر ہیڈ مسٹریس کو اب تک اس سب کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ میڈم روبینہ اس سب کو مس پلاننگ قرار دے کر چلا رہی تھیں کہ یہ اس ڈرامے کا تو یہی اینڈ تھا۔ اسٹیج پر لگا سیٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور شہزادی ابدی نیند کی آغوش میں جا لیٹی تھی۔ اس کا گلابی فراک برگنڈی میں ڈھل چکا تھا۔ اس کے سینے پر وہیچ کا پاؤں تھا جو مسلسل چیخ رہی تھی اور اعلان کر رہی تھی۔

"God is the one,

Earth is the one,
Ruler is the one,
I am the one,
I am the Power"(96)

ہر طرف سے اڑنے والے محل کے ٹکڑے بچوں کے ہاتھوں میں تھے، جو کہ جادو گرنی کے آس پاس تھے۔اس تقریب کے انعقاد کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اچھائی کو برائی پر فوقیت حاصل ہے مگر افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی حالات دفعتاً بدل جاتے ہیں اور برائی ہی اچھائی پر غالب آجاتی ہے اور اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

طاہرہ اقبال کا ایک اور افسانہ "واکنگ ٹریک۔۔۔۔۔۔دو کلو میٹر "صغیہ واحد متکلم میں لکھا گیا ہے جس میں مصنفہ نے ایک پبلک پارک کی مصروف زندگی کی کہانی بیان کی ہے۔اس پارک میں واکنگ ٹریک کا رقبہ تقریباً 2 کلو میٹر پر محیط ہے اور دو کلو میٹر کے مختلف زاویے، اشکال اور رخ سموئے ہوئے ہے، اس پارک میں ہر طرح کے لوگ مرد عورتیں بچے واک کی غرض سے روزانہ آتے ہیں اور کوئی خراماں خراماں چل رہا ہے تو کوئی بھاگ رہا ہے۔ دونوں اطراف میں سیکیورٹی اور حفاظت کی غرض سے تنو مند محافظ چاق و چوبند کھڑے ہیں۔ بائیں طرف پام کے درختوں کا کنارا لڑکیوں اور خواتین کے لیے مخصوص ہے اور پارک کے درمیان میں آہستہ آہستہ چلنے والے لوگ جو فون پر کاروباری باتیں کرنے میں مشغول ہیں۔ پھر ایک ایسا خاص انسان جس سے راوی کا کوئی براہ راست تعلق تو نہیں مگر پارک میں اس کی موجودگی ایک خاص قسم کی راحت کا باعث ہے۔اس نوجوان کا سراپا ملاحظہ ہو:

> "ان بھاگتے، چلتے ہوؤں کے بیچ رفتار کو معتدل رکھے ہوئے وہ ہوتا، وہ جس کا خصوصی نام جاننا ضروری نہیں ہوا کرتا اور جس کا عمومی نام ہر کوئی جانتا ہے۔ وہ جو ہر ماحول، ہر مجلس، ہر تقریب میں موجود ہوتا ہے اور جس کے سامنے سارا ماحول، ساری مجلس، ساری تقریب، ساری فضا، اجتماعی پسپائی اختیار کر جاتی ہے اور فاتح بڑھ کر غلبہ پالیتا ہے اور پھر ماحول کی ساری تفصیل، ساری جزئیات اسی کی ذات سے ترتیب پاتی ہیں۔ وہ ہیرو سا شخص یہاں بھی موجود تھا۔ جس کی موجودگی حس جمال کے ظرف کا امتحان ہوا کرتی ہے۔ قدرت کی صناعی کا شہکار، جیسے پتھروں کے سینے سے پھوٹتا ہوا چشمہ، جیسے بلندیوں سے گزرتی سفید جھاگ کے گالے بناتی ہوئی آبشار، جیسے کوہ ہمالیہ پر جمی برف، وسعتوں

میں بچھتی کھیتوں کی ہریالی، اپالو کی عظمت اور سبھی وہ کچھ جو جمالیات کی تعریف میں آسکتا ہے۔ اگر ان سب کا ست، نچوڑ کر ایک نمونہ تشکیل دیا جائے۔ تو پھر "وہ" بہتا ہے۔"(۹۷)

دیگر واک کرنے والے لوگ ہر طرح کے طبقے، پیشے، عمر، مذہب، نسل اور فرقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس واکنگ ٹریک پر ایک دوسرے کے ہم قدم ساتھ ہیں۔ وہ ہم قدم اس ٹریک پر چلتے ہیں اور اس کی تمام ناہمواریوں کو یکساں بنا دیتے ہیں۔ اس پاکستانی ماڈل ٹریک پر چلنے والے لوگوں کی پہچان قدموں کی چاپ میں مقید ہے۔ ان کے پائنچوں اور پنڈلیوں کی ساخت میں ہے اور ان کے جسموں کی اپنی مخصوص باس بھی ہے۔ مگر اس سب کے درمیان وہ "ہیرو سا شخص" نہایت نمایاں ہے اور ہوا میں بکھری مہک اس کی شناخت بن گئی ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے روزانہ ملتا ہے۔ بات ہو یا نہ ہو، ان کی موجودگی بھی سکون کا باعث ہے۔ اگر کوئی ایک دن نہ آئے تو اس کی کمی اضطراب کا باعث۔ وادی آس پاس گزرے والے لوگوں کی آپس میں مشابہت تلاش کرتی ہے۔ کوئی کسی سیاستدان سے مشابہت رکھتا ہے تو کوئی کسی ادیب سے۔ کسی بزرگ کا سایہ گھنے برگد کے پیڑ کی مانند محسوس ہوتا ہے اور کوئی نوجوان تیز دوڑنے والے گھوڑے سے مماثل ہے۔ انہی کے بیچوں بیچ وہ ہینڈسم نوجوان بھی ایک خوبصورت لباس اپنے سڈول جسم پر زیب تن کر کے یہ احساس پیش کرتا ہے کہ جیسے وہ لباس اس کے جسم پر رکھ کر تراشا گیا ہے۔ اس ٹریک پر کچھ کالی وردیوں میں ملبوس بندوق بردار گارڈز بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں مگر ان کی موجودگی سے ایک کھٹکا سا ہوتا ہے کہ اس طرح کی پر سکون جگہ پر ان لوگوں کی موجودگی آخر کیوں۔

بعض اعلیٰ افسر اپنے پیچھے محافظ لگائے اس ٹریک پر واک کرتے جس کا ہر پودا اپنی علیحدہ علیحدہ خوشبو دار کاربن خارج کرتا۔ یہ خوشبوئیں ہر انسان کا پیچھا کرتی ہیں جس رفتار سے وہ چلتا یا دوڑتا ہے۔ ہر طرح کے پرندے خوبصورت سروں میں چہچہا کر مزید رنگین بنا دیتے ہیں اور لوگوں کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔ اس خوبصورت پر سکون ماحول میں اچانک ایک دن موت کا بگل بج جاتا ہے جس کا منظر یہ ہے:

"جب صور پھونکا گیا اور ہر شے ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ وہ گاؤدم کلائیاں، زیور اسی سجی مسکراہٹ والے ہونٹ اور بدن کے سانچے پر چڑھا خوب صورت لبادہ، سفیدے کے تنے سے مضبوط جسم، جن کے قدموں سے چنگاریاں پھوٹتی تھیں، دھات کا بنا نفیس ہاتھ اور دانہ دانہ گرتی تسبیح، سب جیسے کسی سے مٹکے میں ڈال کر برقی مدھانی

نے بلو دیا ہو یا چھاچھ میں ٹھیک ٹھیک ،فضا میں تنکا تنکا اڑا دیا گیا ہو۔ بارود کے اربوں کھربوں ذرات کے ہمراہ ذرہ ذرہ ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے۔ میں نے سوچا آخر وہ کون ہے جس نے خدا کی احسن تخلیق کو مسخ کر دیا۔ شاید وہ جو کالی وردیوں والے محافظ بنے پھرتے تھے، لیکن کٹی پھٹی سیاہ وردیاں بانسوں کی شاخوں سے اٹکی تھیں۔ جنہیں آگ کے لپکے نے گھیر دیا تھا۔ پھر شاید وہ بزنس مین، جن کے کانوں سے موبائل فون لگے رہتے تھے۔ لیکن فون پکڑے ہاتھ فواروں کے تالابوں میں تیرتے تھے اور موبائل کی گھنٹیاں بجتی اور پگھلتی تھیں اور انہیں سننے والے کان درختوں کے پتوں سے چپکے تھے۔ یا پھر وہ نوجوان جو واکی ٹاکی لگائے جاگنگ کرتا تھا لیکن واکی ٹاکی کا رنگ جس پر چڑھا تھا وہ سفیدے کی شاخوں میں الجھا تھا اور جسم برگد کے تنے سے نشست کے انداز میں یوں لگا تھا جیسے ستانے کو بیٹھا ہو۔ یہاں تو سب اپنے تھے، سبھی خود ہی خود تھے ۔ پھر یہ انسانی جسموں کا کترا۔۔۔"(۹۸)

مصنفہ نے دہشت گردی کے ایک سانحے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ دلوں کو دہلا دینے والی ہے۔ ایک واکنگ ٹریک جو کہ انسان کی چلتی ہوئی زندگی کو بیان کرتا ہے۔ اس میں سکون اور اطمینان سے رواں دواں زندگی اچانک سے حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ مصنفہ نے ملک میں ہونے والے سینکڑوں واقعات کو تمثیلی انداز میں بیان کر دیا ہے۔ جہاں بے قصور اور معصوم لوگ آئے روز لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور کسی کو معلوم تک نہیں ہوتا کہ یہ سب کس نے کیا اور کیوں کیا؟ آئے روز ہونے والے دہشتگردی کے واقعات میں مجرموں تک کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔ اور کسی دہشت گرد تنظیم پر ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے۔ جس طرح سے اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے:

"کل شام چھ بج کر اڑتالیس منٹ پر جناح پارک کے واکنگ ٹریک پر زبردست دھماکہ ہوا، کئی کلو وزنی بم پھولوں کے عقب میں رکھا گیا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کئی فٹ گہرے گڑھے بن گئے اور انسانی جسموں کے پرخچے اڑ گئے۔ کسی بیرونی دہشت گرد تنظیم کے ملوث ہونے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ حادثے کی تحقیقات کا حکم دیا جا رہا ہے۔"(۹۹)

مصنفہ کے خیال میں اس سانحے کو حادثہ کو کہنا درست نہیں۔ اگر قیامت کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے اور جو اس قیامت سے گزرے ہیں ان پر یہ قیامت بیت گئی اور جو بچ گئے ان کے لیے مستقبل میں کوئی ایسی قیامت

منتظر ہے۔اس سانحے نے آن کی آن میں زمین کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔زمین تانبے کی شکل میں ڈھل گئی اور درخت بانجھ ہو کر رہ گئے۔لوگوں کے اعضاء پروانوں کی مانند ہوا میں اڑ رہے ہیں مگر اس سب کا قرآن یا الہامی کتابوں میں تو تذکرہ نہیں کہ انسان کی شناخت ہی مٹ جائے گی اور اسے بارود کی غذا بنا دیا جائے گا۔

"جنگل سکرین" طاہرہ اقبال کی حقیقت اور تخیل کے مابین مربوط طلسماتی اور ڈرامائی کہانی ہے۔جس میں انجام تک یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ حقیقت کیا ہے اور ڈرامہ کیا ہے۔مصنفہ نے زمان و مکاں کا ایک انوکھا التباس کیا ہے۔جس دہشت گردی کے رونما ہونے والے واقعات روزمرہ کا معمول بن گئے مگر ٹی وی پر پیش کیا جانے والا ایک سیریل "جنگل سکرین" اپنی سفاکی اور نت نئے تجربات اور سنسنی خیز کہانی کے باعث ریکارڈ توڑ دیا ہے اور بچوں کے لیے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔بچوں کے معصوم ذہنوں میں اس طرح کے سنسنی خیز پروگرام کے متعلق ان گنت سوال جنم لیتے ہیں۔سات سالہ نریمان کے لیے یہ سب ہضم کرنا مشکل ہے۔اس سیریل کی مقبولیت اور دلچسپی کے باعث ٹی وی پر بار بار اس کے ٹریلرز دکھائے جاتے ہیں اور اقساط نشر کی جاتی ہیں۔نریمان ٹی وی آن کرتی ہے تو اس وقت جنگل سکرین کی وہ مقبول سہ ماہی نشر کی جا رہی ہوتی ہے جس میں کاک پٹ بمباری کا سین فلمایا گیا تھا۔اس قسط کا ذیلی عنوان تھا۔"موت ہی موت" جس میں کٹے پھٹے انسانی اعضاء بہتا خون اور مسخ لاشوں سے اٹھتے دھوئیں سے سیٹ کو سجایا گیا تھا۔اس قسط میں روح قبض کرنے کی ریسرچ کو پیش کیا گیا تھا۔اور خوفزدہ کرنے والا میوزک بج رہا تھا ایسے مناظر دیکھ کر ننھی نریمان کی آنکھیں خوف و دہشت میں دھنس گئیں۔اور وہ اپنے چھوٹے ذہن پر زور دے کر ماما کو بتانے لگی کہ کس طرح جنگلی باز منہ میں خون بھر کر اڑتے ہیں اور غوطے لگاتے ہیں۔ہڈیوں کو اپنی لمبی چونچوں سے کھرچ کر دوبارہ اڑ جاتے ہیں۔"جنگل سکرین" کے نشر ہونے کے بعد معصوم بچوں کے چھوٹے چھوٹے ذہنوں میں ان گنت سوالات جنم لیتے ہیں جو کہ اپنی نوعیت میں نہایت عجیب و غریب قسم کے ہوتے ہیں۔مثلاً پانچ سال کا صہیب پوچھتا ہے کہ:

"ماما یہ بڑے Animals چھوٹے animals کو کیوں کھا جاتے ہیں؟" میں نے کہا "بیٹا یہ جنگل کا قانون ہے کہ بڑے جانور چھوٹے جانوروں کو کھا جاتے ہیں۔ "
تو پھر ماما! بڑے humans چھوٹے humans کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟"(۱۰۰)

دوسری قسط کا نام "جال اور صید" تھا۔جس میں شکار کو جال بچھا کر اس میں پھنسا دیا گیا اور پھر اس پر آسمان سے گولے بارود کی موت کی صورت میں بارش برسائی گئی۔جس نے معصوم صہیب کے دماغ میں مزید سوالات کا طوفان برپا کر دیا اس کے لیے جو بات سب سے زیادہ تجسس سے بھرپور ہے کہ انسان انسان کا شکار

کیوں کرتا ہے۔ماں کے پاس اس طرح کے سوالات کے کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔اس لیے وہ خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتی ہے۔ مگر نیتا اپنے بھائی کی بات کا جواب دیتی ہے کہ انسان بھی تو گوشت خور ہے اور وہ جانور ہوتے ہیں جو گوشت کھاتے ہیں، مگر صہیب تذبذب کا شکار ہو کر یہ سوال کرتا ہے کہ جانور تو پہلے شکار کو مارتے ہیں اور اس کے بعد اس کے ٹکڑے کرتے ہیں اور انسان تو زندہ انسان کے ہی ٹکڑے کر لیتا ہے۔نیتا اس کو بتاتی ہے کہ انسان بہت طاقتور ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ننھا صہیب ماں سے دوبارہ سوال کرتا ہے کہ یہ انسان "خدا" ہے کیوں کہ "طاقت تو خدا کے پاس سب سے زیادہ ہے۔ماما اس کا جواب دیتی ہیں:

"نہیں بیٹا نہیں نعوذ باللہ خدا تو نہیں لیکن بڑی طاقت ضرور رکھتے ہیں۔ہر ایک پر حکمرانی ان کا حق ہے اور سرتابی کی جرأت کرنے والے کو مار ڈالنا ان کا فرض ہے۔"(۱۰۱)

صہیب حیرت زدہ ہو کر یہی جواب دیتا ہے کہ پھر یہ خدا ہی ہوئے نہ کیوں کہ خدا کے پاس ہی اتنی طاقت ہے۔ مگر نینا اس کو کہتی ہے کہ احمق خدا معصوم لوگوں کو سزا نہیں دیتا۔ مگر صہیب تاسفانہ لہجے میں پوچھتا ہے کہ اگر خدا کے ہاتھ میں سب کچھ ہے تو وہ انسانوں کو اتنا طاقت ور کیوں بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کر کے معصوموں کو سزا دیتے ہیں تو خدا طاقت دینے میں انصاف کیوں نہیں کرتا۔

"جنگل سکرین" کی سب سے خوفناک قسط میں مغلوب قوموں کے جسموں پر غالب قوموں کا جشن دکھایا جاتا ہے۔ جس میں وہ ان کے جسموں کو نوچ نوچ کر ان کی تکہ بوٹی کر رہے ہوتے ہیں۔ جشن میں طرح طرح کے لوازمات مثلاً کھوپڑیوں میں شراب ڈال کر پی جاتی ہے اور دریاؤں میں پانی کی جگہ خون بہانے کا شوق وغیرہ۔ مگر افسانہ نگار کے نزدیک یہ سب اب پرانا ہو چکا ہے۔آج سیٹلائیٹ سسٹم نے ساری دنیا کو گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔دنیا بھی "جنگل سکرین" کی سی صورت اختیار کر گئی ہے۔ جس میں قانون انسان نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اپنے سے کم کو اذیت ناک سزائیں دے کر عبرت ناک انجام تک پہنچایا جاتا ہے۔افسانہ نگار نے "گنجی بار" کے علاقے کا تذکرہ کیا ہے جہاں تعلیم کا نام و نشان نہیں اور وہاں کے باسی ترقی کے نام سے بھی ناآشنا ہیں ۔ایک بستی میں طاقت کا سلسلہ شروع ہو کر دوسری بستی پر محیط ہو جاتا ہے اور جن ناخداؤں نے قانون اپنے ہاتھ لیا ہوا ہے ان کے نزدیک طاقت کا نشہ ایسا ہے کہ اس کا اظہار ناگزیر ہے۔ کیونکہ ظلم بھی ایک فطری جبلت ہی ہے۔جنگل سکرین میں جس بستی کو دیکھایا گیا ہے، وہ تو نیست و نابود ہو کر رہ گئی ہے۔ جس نے باقی لوگوں کو خوف میں مبتلا کر دیا ہے کہ اب طاقت کے استعمال کے لیے کون منتخب ہو گا اور سارے کمزور لوگوں کو یہی ڈر تھا کہ کیا پتہ اگلی باری ان کی ہو اور ان کے جسموں کو بھسم کر کے ان کی تکہ بوٹی کر دی جائے۔ بھوک کی تسکین

کے لیے انسان کچھ بھی سکتا ہے۔ جنگل سکرین کی ایک قسط میں لوگوں کو مارنے سے پہلے ان پر خوراک کی بارش کی جاتی ہے۔

اس طرح مرنے کی تڑپ اور جان کنی میں زیادہ دیر رکھ کر مزے لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور قسط میں وہ بچے دکھائے جاتے ہیں جن کے گھر جل کر راکھ ہو چکے ہیں اور ان کے اعضاء کٹے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے والدین کے کٹے ہوئے اعضاء کے ٹکڑوں سے وہ سیٹ ترتیب دیا گیا تھا اور ایک ہی بگل بج رہا تھا۔

"زردار ہوں سخاوت ہے کام میرا
بھک منگے بنانا ہے شعار میرا
پہلے انہیں یتیم و یسیر بناتا ہوں
پھر بعوض نان جویں خرید لیتا ہوں۔"(۱۰۲)

اس افسانے میں مصنفہ نے عالمی طاقتوں کے ظلم و جور کو ایک پروگرام کی صورت میں بیان کیا ہے جس میں کمزور اور معصوم لوگوں کا مالی و جانی استحصال کیا جاتا ہے اور موت کے دہانے پر دھکیل دیا جاتا ہے۔ ان کی نسلوں کو اپنا دست نگر بنا کر اپنی طاقت کا لوہا منوایا جاتا ہے اور انسانیت کی ساری حدیں پار کر کے جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

ادبی دنیا میں طاہرہ اقبال کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے بہت کم عرصے میں اپنے متنوع موضوعات اور خوبصورت اسلوب کے سبب سنجیدہ ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کی اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بنیادی اور پہلی شناخت افسانہ نگار کی ہے۔ مگر ان کی تخلیقی شخصیت دیگر اصناف تک بھی اپنا پھیلاؤ رکھتی ہے۔ جس میں کالم نگاری، تنقید اور تحقیق سبھی شامل ہیں۔

نیلوفر اقبال نے امریکہ کے ان مذموم خیالات کی عکاسی اپنے افسانے "آپریشن مائس" میں کی ہے۔ یہ افسانہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں افسانوں کا موضوع جنگ ہے۔ جس میں امریکی افواج کے ظلم و ستم اور جنگی جنون کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جنرل مرسی ہے۔ جب وہ اپنی کتیا کو کسی تکلیف کی وجہ سے موت کا انجیکشن دے رہا ہوتا ہے تو نہایت غم زدہ ہوتا ہے۔ اس کی بیوی اس کی اس حالت پر ہنس رہی ہوتی ہے۔ اس جنرل کی اپنی کتیا سے محبت کو افسانہ نگار نے بیان کرنے کے بعد اس کی سنگ دلی سے پردہ اٹھایا ہے کہ وہی جنرل عراق کو جنگ کی لپیٹ میں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ وہ عرب اور عراقی اقوام کو "مائس (چوہوں) سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس کے تناظر میں امریکی انتظامیہ اس کا نام "آپریشن مائس" رکھتی ہے۔ اس جنرل کے اپنی بیوی

کے ساتھ جنگ سے متعلق مکالمے درج ذیل ہیں۔

" آج سے پانچ سو سال بعد یہ بھی ہسٹری ہو گی مارتھا۔ شاید تم نے وقت کے بارے میں اس انداز سے سوچا ہی نہیں تمہارے لئے وقت شاید لمحہ ہی ہے۔ اور پھر مارتھا سویلائزیشن تو سویلائزڈ کے لئے ہوتی ہے۔ تم ان چوہوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ان کے وجود کا کوئی مقصد نہیں ان کا کام صرف بریڈ (Breed) کرنا ہے۔ ان کو تو اپنے بچوں کی صحیح تعداد کا بھی پتہ نہیں ہوتا ان کا تو ایک ہی کام ہے ۔ Forminate and breed, breed and forminate

.....مارتھا ان کے لیڈر اتنے بزدل ہیں کہ اپنا روپیہ بھی اپنے ملک میں نہیں رکھتے۔ ڈرتے ہیں کہ ان کے لوگوں کو ان کی دولت کی انتہا کی خبر نہ ہو جائے۔ ہنسنے والی بات تو یہ ہے کہ ہم جو آئل ان سے خریدتے ہیں اس کی رقم بھی زیادہ تر ہمارے بینکوں میں آتی ہے۔ پھر ان میں سے کوئی چوہا خاموشی سے مر جاتا ہے۔ اور دولت ہمارے سوئس بینکوں میں پڑی رہ جاتی ہے۔"(۱۰۶)

وہ جنرل جنگ کے بدلے تیل کے خزانوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی کتیا کی موت کا صدمہ تو برداشت نہ کر پارہا تھا مگر انسانوں کو مارنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ اور اس کا نام "مرسی" تھا جس کے معانی ہیں "رحم"۔

پاکستان میں یوں تو تقریباً ہر خطے نے دہشت گردی کے واقعات کے ضمن میں بھاری قیمت چکائی ہے۔ پہلے کراچی اور اس کے بعد پورا ملک ہی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ ''نائن الیون'' کے سانحے کے بعد بلوچستان اور خیبر پختونوا تو جیسے میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگے۔ چنانچہ اس خطے کے مکینوں کی زندگیوں اور اذہان پر اس کے نقوش ان مٹ ہوتے گئے۔ دہشت گردی کے ان واقعات نے وہاں کے تحقیق کاروں کو بھی جھنجھوڑ دیا اور ان کے قلم ان خونی واقعات اور بم دھماکوں کی کہانیاں اپنی زبانی لکھنے لگے۔ ان نمائندہ افسانہ نگاروں میں محمد جمیل کا چوخیل، زبیر شاہ اور مشرف مبشر کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے اپنے حلقوں میں وقوع پذیر ہونے والے ان اندوہ ناک سانحوں کی داستانیں رقم کیں اور اہل فکر و نظر کو اس جانب متوجہ کیا۔ ذیل میں بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کے ان افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

محمد جمیل کا چوخیل کا نام اردو افسانے میں اپنی جگہ بنا چکا ہے اور جس اذیت اور خوف نے ان کو کہانیاں لکھنے پر آمادہ کیا ہے وہ انسانی وجود کو گھن کی طرح کاٹ رہا ہے۔ خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والے محمد جمیل کا

چوخیل نے اپنے موضوع، کہانیوں کی سطر بہ سطر میں اتار کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے جس منظر نامے کو ان کہانیوں کا حصہ بنایا ہے وہ اردو میں جدید ہے۔ دہشت گردی کے تناظر میں انہوں نے جو افسانے تحریر کیے ان میں " مکافات"،" نام بے نام"، خوف کا بیریئر" اور "کس کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کروں" نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ " نوحہ بے نام" پشاور کے سانحہ " APS" کے معصوم شہید بچوں کے نام کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے اپنی کہانیوں میں دہشت گردی جیسے ناسور کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ انہوں نے اپنے ارد گرد کے ماحول میں جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے قلم کے ذریعے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ انہوں نے معاشرے کے مظالم، ناانصافیوں، ظلم و جبر، غربت، دہشت گردی اور مجبوریوں کے حقیقی زہر کو انسانی شخصیت اور سماجی ترقی کا قاتل بتایا ہے۔ انہوں نے سوات کے اندوہ ناک حالات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ مثلاً ان کا مجموعہ "نوحہ بے نام" سوات میں درپیش دہشت گردی کے اس علاقے پر اثرات کی تصور کشی کرتا ہے۔ مصنف نے اس حسین وادی کے راکھ ہوئے کے مناظر کو نہات خوب صورتی سے عوام کے سامنے رکھا ہے۔ جو کہ ہر حساس اور ذی شعور انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ محمد جمیل کا چوخیل نے مرگ عام کی نوحہ گری کی ہے اور انہوں نے ۲۰۰۹ء-۱۰-۲۰ کے معروضی حالات کے تناظر میں مذہبی و سماجی شدت پسندی اور تنگ نظری کا نوحہ لکھا ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے سوات کی تاریخ کے بدترین سالوں کی کہانیاں، یادداشتیں اور افسانے تحریر کیے ہیں۔ ان کی نظر میں یہی وہ دور ہے جس میں دھرتی کی روایات کو نہایت بری طرح سے مسخ کیا گیا۔ وادی میں طالبان اور فوج کے مابین مزاحمت کے نتیجے میں سوات کے عوام جن مصائب کا شکار ہوئے یہ مجموعہ اس المیے کی تصویر ہے۔ ان کا افسانہ " پگلی" ان خوں چکاں مناظر کی بہترین غمازی کرتا ہے:

> " دوائی لے کر جوں ہی دوکان سے باہر نکلا ویسے ہی ایک فور وہیل گاڑی طالبان سے بھری آ پہنچی۔ ان سب نے اپنے چہرے کو نقابوں میں چھپا رکھا تھا۔ ان میں چند جاوید کے گاؤں والے بھی تھے۔ انہوں نے جاوید کی نشاندہی اپنے کمانڈر سے کی۔ اسی وقت وہ پکڑا گیا۔ وہ ہاتھوں میں دواؤں کا شاپر پکڑ ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس پر چاروں طرف سے کلاشنکوفیں تنی ہوئی تھیں۔ اسے یقین کامل تھا کہ وہ اس فانی دنیا میں جتنا وقت لے کر آیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس وقت اس کی جان میں دوا اور جانیں اٹکی

ہوئی تھیں ۔اسے اپنی جان سے زیادہ زرینہ کا غم تھا۔وہ کسی طرح بھی زرینہ کو بچانا چاہ رہا تھا۔اس لیے وہ طالبان کے آگے گڑگڑانے لگا۔اس سے بات نہ بنی تو دکھ اور بے بسی کے شدید جذبے سے رونے لگا ، اور بھی لوگ اس ہنگامے کے دوران جمع ہو گئے ۔"(۱۰۷)

محمد جمیل کاچوخیل نے ایک مخصوص عہد کے محدود دائرے میں اپنی کتابوں کے مقامات، موضوعات اور کرداروں کا چناؤ کیا ہے لہٰذا ان کی کہانیاں مختلف ،موضوعات ، سماجی تعلقات، واقعاتی حادثات اور انسانی نفسیات کے باوجود ایک ہی زنجیر کی کڑیاں لگتی ہیں۔

"جون کے مہینہ میں بھی اس علاقے کا موسم کافی سرد تھا۔توپ کا پہلا گولہ ان کے گاؤں میں گرا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا اس کے بعد ہیلی کاپٹر اور جنگی طیارے بھی پہنچ گئے ۔ وہ پہلے دھماکے کے ساتھ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔اس وقت اس کے حواس پر صرف ایک چہرہ چھایا ہوا تھا۔اس کی آنکھوں میں صرف ایک صورت تھی،اس کا بچہ۔اس کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی اور وہ گھر کی جانب وحشت زدہ ہرنی کی طرح بھاگنے لگی۔ابھی وہ گھر سے کچھ دور تھی۔ اس کے گھر کا دروازہ سامنے نظر آرہا تھا۔اس کی رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک زور دار دھماکے نے اس کے قدم زمین سے اکھڑوائے اور وہ ہوا میں تیرتی ہوئی دور جا گری۔اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے گھر سے دھواں اور غبار ایک ساتھ اٹھ رہا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح پھر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو دھواں اور غبار کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ کھانستے کھانستے تیر کی طرح بچے کے گہوارے تک پہنچی اور وہ کمبل اٹھایا جس میں سویا ہوا تھا۔اس کے بعد وہ بھاگی اور بھاگتی چلی گئی۔نہ جانے وہ کب تک بھاگتی رہتی۔اس کے زخمی سر سے گرم گرم خون بہہ کر اس کی آنکھوں میں جمع ہو گیا۔ (۱۰۸)

یہ افسانہ دراصل ایک واقعاتی حقیقت ہے جس کو کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور ایک لحاظ سے وادی سوات کی حالیہ تاریخ کا ایک ایک باب رقم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس افسانے میں زرمینہ کا کردار پختون قدامت پسند معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جس میں جکڑے ہوئے پسماندہ رسوم اور سماجی قتور میں ڈوبے ہوئے خیالات و تصورات کی پیچیدگیوں میں نئی نسل کے جوان مچلتے جذبات واحساسات کو نیم باغی اجتماعی رویوں کے دھندلے عکس لیے ہوئے ہے مگر اس کہانی کا اصل پہلو دہشت گردوں کے ہاتھوں سوات کی امن وآشتی کی تباہی اور بے گناہ عوام کا مذہب کے نام پر غیر منصفانہ قتل وغارت اور فوجی آپریشن کو واضح کرتا ہے۔ اس قتل و غارت گری کے انسانی نفسیات پر جو اثرات مرتب ہوئے، افسانہ نگار نے ان کو نہایت خوب صورتی قلم بند کیا ہے۔

> گاؤں کے دوسرے لوگ زرمینہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ زرمینہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ ریلیف کیمپ لے گئے۔ جب کوئی اس سے تکیہ لینے کی کوشش کرتا تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتی۔ کیمپ میں وہ پگلی کے نام سے مشہور تھی جو ایک چھوٹا سا تکیہ سینے سے لگائے پھرتی تھی وہ اسے بار بار اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہتی جب تکیہ دودھ نہ پیتا تو وہ اسے زور زور سے مارنے لگتی۔ پھر قہقہہ لگاتی اور میرا بچہ کہہ کر سینے سے چمٹا لیتی۔"(۱۰۹)

مصنف نے اس افسانے میں جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ ان کی حق گوئی وبے باکی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اردو ادب میں حقیقت نگاری کے اسلوب کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جمیل کاچو خیل نے محض اسلام کے نام پر قتل وغارت، فوجی جوانوں کی طالبان کی غیر موجودگی میں دیہاتوں کی بے گناہ عوام پر گولہ باری کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا اور نہ ہی سوات کے عوام کی سادہ لوحی اور چند مفاد پرست مذہبی پیشواؤں کی اندھی تقلید کو تمام برائیوں کی بنیاد قرار دیا ہے بلکہ انہوں نے زندگی کے تمام تضادات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کی کہانیوں میں وادئ سوات میں طالبان کی آمد اور آغاز میں وہاں کے عوام کی جانب سے خیر مقدم، تربیتی کیمپوں، مورچوں، اسلحے کے گوداموں کی تعمیر اور اس پر وہاں کی انتظامیہ کی خاموشی پر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی اسٹبلشمنٹ کے

کردار اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے حوصلہ افزائی کے بارے میں اشاروں کنایوں میں کوئی نکتہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ طالبان کوئی غیر نہیں تھے۔ وہ باہر سے حملہ آور نہیں ہوتے تھے۔ جن کی کہانیاں افسانہ نگار نے بیان کی ہیں وہ اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو جیت کی خاطر لقمۂ اجل بنا دیتے اور خود کش حملوں میں فدائین بن کر اپنی آخرت سنوارنے کے چکر میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ مزید یہ کہ ان عسکریت پسندوں کے مضبوط ہونے اور ان کے تسلط سے قبل فوج اور طالبان کی آنکھ مچولی اور عوام کی نظروں میں ایک جیسا کردار ادا کرنے کے حوالے سے بھی کہانیاں خاموش ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی مصنف نے بات کہنے کے فن کو پوری طرح آزمایا ہے ان کے ہاں ان افسانوں میں حملوں کی معنویت اور وسعت و گہرائی ہے۔ مثلاً

'' وجہ تنازعہ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا تھا۔۔۔ قبروں میں جا چکے تھے''(۱۱۰)

''نوحۂ بے نام'' کی اکثر کہانیاں خوف و حشت سے متعلق ہیں۔ اس افسانے میں مصنف نے عمومی انسانی نفسیات اور سماجی تعلقات کے تناظر میں افراد اور قبیلوں کے آپسی تنازعات اور نسل در نسل منتقل ہونے والی انتقامی غیرت کو بھی موضوع سخن بنایا ہے اور فوجی آپریشن کے نتیجے میں ہونے والے نقصان پر بھی توجہ مبذول کرائی ہے ''نوحۂ نے نام'' دراصل وادئ سوات کے حالات و واقعات کو ہی بیان کرتا ہے۔ ۲۰۰۹ء سوات کی تاریخ کا وحشت ناک سال تصور کیا جاتا ہے جس کے اثرات آئندہ آنے والی نسلیں بھی بھگتیں گی۔ اس سال کی قیامت میں نہ جانے کتنے گھر اجڑ گئے، بزرگوں کے عصاہائے میری شکستہ ہوئے۔ کتنے آنچل چھن گئے، کتنی عورتیں بیوہ ہوئیں، کتنی لاشیں گدھوں، کتوں اور سوٗروں کی خوراک بنیں۔ ایسی کہانیاں بھی ہیں جن کو بیان کرتے ہوئے روح تک کانپ جائے۔ گھر قبرستانوں کا منظر پیش کرنے لگے۔ ان واقعات میں باپردہ خواتین کی چادر چار دیواروں کا تقدس تک پامال ہو گیا۔ مثلاً افسانہ '' ماں'' اس سارے منظر نامے کی بہترین عکاسی کرتا ہے:

> ''اتنے میں حکیم خان بھی گرتا پڑتا گھر آیا۔ اس کا ایک بازو زخمی تھا مگر بازو کے زخم سے زیادہ وہ گھاؤ دکھ رہے تھے جو ان کے ذہن اور دل پر لگے تھے وہ باہر سے اپنے ہی گاؤں

اپنے ہی لوگوں کی نہ جانے کتنی لاشوں کو پھلانگتا ہوا آیا تھا..... حکیم صاحب کے پاس ایک چھوٹی سوزوکی کار تھی۔اس کی بیوی اور بچے جلدی سے کار میں بیٹھ گئے۔اس میں مزید گنجائش نہیں تھی حکیم صاحب گومگو کی حالت میں کھڑا تھا۔وہ کبھی ماں اور کبھی بچوں کی طرف دیکھتا۔ بڑی ماں کی بارعب آواز نے اسے چونکادیا میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔جلدی نکلو۔" (۱۱۱)

اس افسانے میں مصنف نے ماں کے کردار کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ یہ کہانی طالبان کی لائی ہوئی مصیبت اور ابن آدم کی تذلیل و توہین کے تناظر میں واقعاتی حقائق پر مبنی ایک اجتماعی المیہ ہے جس میں فوج کی کارروائی سے بھی انسانوں جانوں کے ضیاع اور آبادیوں کو بربادیوں میں تبدیل کرنے کا عمل بھی شامل ہے۔اس افسانے میں طالبان کی مداخلت کے بعد اس علاقے کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔لوگ مرنے لگے تھے۔ حالات ہجرت تک پہنچ گئے تھے۔ مگر ایثار و محبت کا مجسمہ ''ماں'' ایک مضبوط چٹان کی طرح سینہ سپر ہو گئی۔ وہ سارے گاؤں کی ''ماں'' تھی۔ جو بچوں کو اپنی دعاؤں میں محفوظ مقامات پر بھیجتی رہی۔ مگر اس کو کوئی لینے نہ آیا کیوں کہ وہ تو ماں تھی، مگر اس کی کوئی ماں نہ تھی۔ کہانی کا یہ خوب صورت اختتام کہانی کو لازوال بنا دیتا ہے۔

ان افسانوں میں طالبان اور فوج کے مابین تصادم میں عام انسانوں کے پسنے کی داستان بیان کی گئی ہے۔ خوف اور دہشت کی فضا میں انسانی نفسیات کی کشمکش اور جان بچانے کی ہنگامی اور بحرانی کیفیت اور نفسا نفسی کے باوجود اپنے جگر کوشوں کا غم نہایت جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس مجموعے کا ایک افسانہ " میں کہا جاؤں "اسی صورتحال کی غمازی کرتا ہے۔ جس میں پورا گاؤں طالبان کے خوف سے یرغمال ہو کر رہ گیا تھا۔ کیوں کہ ان کی نافرمانی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ دوسری جانب فوجی جوان بغیر کسی تصدیق کے گاؤں میں بمباری کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ طالبان گاؤں کے گاؤں زمین بوس کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ معصوم ''صومیہ'' اور ''عائشہ'' تو علامتیں ہیں ان علاقوں سے زمینی حقائق کی کئی دلخراش اور انسانیت سوز کہانیاں وابستہ ہیں۔ جنہیں پڑھنے کی نہیں بلکہ محسوس کرنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

افسانہ '' انتقام'' بھی طالبان کے '' فلسفہ جنت'' اور نوجوانوں کی برین واشنگ کے نتیجے میں خاندانوں کی تباہی و بربادی کی واقعاتی حقیقتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ جس میں ایک ہی خاندان کے دو افراد چچا اور بھتیجا پولیس اور طالبان کے محاذوں کے محافظ تھے۔ طالبان چوں کہ پولیس کو فتوئوں کے ذریعے کافر و ملحد قرار دے چکے تھے لہٰذا جنت کے حصول کے لیے طالبان ایک خودکش دھماکے میں چچا اپنی ڈیوٹی کے دوران اور بھتیجا اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ سوات کے بے شمار گھرانوں میں اس قسم کے حادثے رونما ہوتے رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر گھر میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انتقام کی یہ کہانی اس کی مثال ہے۔

افسانہ '' آدم خور'' بھی طالبان کی سفاکی اور درندگی کے واقعات کی منظر کشی کرتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار دو جرمن شیفرڈ کتے ہیں۔ افسانہ نگار نے ان کتوں کی حرکات و سکنات کے موازنے سے اس وحشت زدہ ماحول اور طالبان کی ظالمانہ کاروائیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ''نوحہ بے نام'' اپنے اسلوب اور تیکنک کے حوالے سے بہترین مجموعہ ہے جس میں حقیقت نگاری کے باوجود فن افسانہ نگاری کی جادو گری صاف جھلکتی ہے۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں تجسس اور شاعرانہ صداقت کی کڑیاں ملتی ہیں۔ نوحے کو کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے مگر افسانہ نگار نے اسے '' نوحہ بے نام'' کہہ کر اس کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ نوحہ طالبان کے ظلم کی بازگشت ہے۔ جس میں ٹریجڈی اپنے عروج پر ہے۔ ان کہانیوں میں اہل سوات کا نوحہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ دلکش مناظر، دل چسپ اسلوب اور دل گداز موضوعات کے باعث اردو کے سانحاتی ادب میں ایک روشن باب بن چکا ہے۔

''محمد جمیل کا چوخیل کا دوسرا مجموعہ میں '' میرا برزخ''، فکر انگیز افسانوی مجموعہ ہے۔ ان افسانوں کا موضوع عام انسان ہے۔ مگر اس مجموعے بھی دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانے موجود ہیں۔ مثلاً ''رب کریم'' میں کراچی کے حالات کو موضوع بحث لایا گیا ہے۔ کراچی ایک عرصہ تک دہشت گردی کی لپیٹ میں رہا ہے، لسانیت، فرقہ واریت اور پر تشدد واقعات کی کہانیاں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔ مثلاً افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ اشعر جو گھر سے نکلنے کے نام سے خوف زدہ تھا۔ آج سارا دن شہر کی سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہ کراچی کے ان حصوں تک بھی گیا جہاں زندگی کی کوئی قیمت ہی نہیں تھی... کراچی نے ایک مہینے میں زیادہ لاشوں کا عالمی ریکارڈ بناڈالا تھا۔ چونکہ ہر شہر ہر قصبہ ہر گاؤں کی وسیبی جسامت کسی اانسان کی ہوتی ہے اور کسی بھی جسم کی شکست وریخت کے لیے ایک ناسور کافی ہوتا ہے لیکن کراچی پر کئی ناسور حملہ آور تھے لسانیت، فرقہ واریت اور متشددانہ سیاست کا ناسور۔،،(۱۱۲)

افسانہ نگار نے افسانے میں علامتی رنگ بھی اختیار کیے ہیں۔ جس سے کہانی میں تجسس اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ افسانہ ''گرگٹ'' میں سوات کے عہد کے تناظر میں کہانی بیان کی گئی ہے۔ گویا سوات کے اندوہناک حالات وواقعات مصنف کے ذہن میں شعوری ولاشعوری ہر دو سطح پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں مثلاً افسانے کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوات میں قیامت صغری جیسا حال تھا کوئی جان سے جارہا تھا۔ تو کسی کی عزت اور عصمت تار تار ہو رہی تھی۔ کسی کو ایک نوالے کے لالے پڑے ہوئے تھے تو کسی کے سر پر چھت نہ تھی۔ اس دور ابتلا میں سوات کے ایک دوست نے مجھ سے کسی نہ کسی رابطہ طرح کیا طالبان یا فوج مجھ کو مارے نہ مارے لیکن یہ درد میری نان لے کر رہے گا۔... میرے دوست کا پتا پھٹنے کے قریب تھا بلکہ کچھ مواد آہستہ آہستہ رسنے بھی لگا تھا''۔(۱۱۳)

افسانہ ''قیمت سے قیامت تک'' علامتی افسانہ ہے جس میں کتوں کی علامت میں انسانی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں کم زور کو کچل کر رکھ دیتا ہے اور اپنے مقصد کی آڑ میں اس جان اور خون دونوں کو بے وقعت کر دیتا ہے۔ ظالم اپنے ظلم میں حدیں پار کر دیتا ہے اور مظلوم اس کے مذموم عزائم کی نذر ہو جاتی ہے۔ یہی زمانہ حسین کا ہے۔ اس افسانے میں ظلم وجبر کو موضوع بنایا گیا ہے:

''دونوں پیچھے دیکھتے ہوئے آگے کی طرف بھاگنے لگے۔ ماں تو سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچ گئی مگر جوں ہی بچہ سڑک کے بیچ پہنچا تو اچانک ایک تیز رفتار منی بس اس کو روندتے ہوئے گزر گئی۔ ڈرائیور اپنی روایتی بے حسی اور سفاکی سے کچلے جانے والے پلے کو ایک غلیظ گالی سے نوازتے ہوئے گاڑی آگے بڑھاتا چلا گیا۔،،(۱۱۴)

افسانہ '' نام بے نام'' میں خود کش حملے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے فن اور ہنر کے تقاضوں پر پورا اترنے کی خوب کوشش کی ہے۔اس افسانے میں عوام کے مادی مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرتی بیزاری بھی نظر آرہی ہے۔ مثلاً:

''ہسپتال میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ڈاکٹروں کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ نرسیں اور پیرا میڈیکز سب حواس باختہ تھے۔ ایک طرف ایمبولینسوں کی ونگ ... ونگ کی ہیبت ناک آوازیں تھیں تو دوسری جانب پولیس ہوٹرز بج رہے تھے۔ لوگوں کی بھاگ دوڑ دھکم پیل، آنسو، آہ وبکا کا دل خراش شور تھا۔ ہر کسی کو اپنے کی فکر کھائے جارہی تھی... اقبال اس موقع پر موجود تھا۔ وہ بھی دھماکے کی زد میں آیا تھا بم کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں لگا تھا جس سے اس کے ہاتھ کی حساس ترین شریانیں کٹ گئی تھیں ..... اقبال کا نام اب اقبال کے بجائے نامعلوم ہو چکا تھا''۔(۱۱۵)

یہ افسانے اردو فکشن میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانی رشتوں اور انسانیت کا نیلا کڑتا وجود بار بار دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے جذبات کی حقیقت کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔ پاکستان میں بدحالی کی بہت ساری وجوہات ہیں مگر اس میں سب سے پہلی وجہ افغانستان کی جنگ ہے۔ جس نے پاکستان کو تحفے میں بہت کچھ دیا ہے ان تحفوں میں دہشت گردی، فرقہ واریت، مذہبی منافرت، کلاشنکوف کلچر، منشیات، بھتہ خوری، غنڈہ گردی، لسانی و نسلی فسادات کے علاوہ خانہ جنگی بھی شامل ہے۔ محمد جمیل کا چوخیل کا ایک افسانہ '' مکافات''(مجموعہ جلتا سر سلگتی روح) دہشت گردی کے ضمن میں لکھا ہوا افسانہ ہے۔ اس میں افغانستان میں

چھڑی ہوئی جنگ کے نتیجے میں رونما ہونے والے پر آشوب حالات پر بحث کی گئی ہے۔اس افسانے میں منشیات اور دہشت گردی جیسے حساس موضوعات کو قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

'' جب افغانستان میں لگی آگ نے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو غیر ملکی ایجنسیوں کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا اور دہشت گردی ہی بعض لوگوں کا پیشہ بن گئی تو جب طلحہ نے بھی دیکھا اس کام میں بہت پیسہ ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کل جن کے پاس سائیکل تک نہیں تھی آج بیش قیمت بڑی بڑی گاڑیوں میں گھوم رہے ہیں۔ وہ جھٹ سے دہشت گرد بن گیا مگر یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ اس کام کے لیے بالکل غیر موزوں تھا۔ وہ لومڑ کی طرح چالاک ضرور تھا مگر شیر کی طرح خون خوار اور نڈر نہ تھا۔۔۔ وہ جانی مانی غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اب صرف موت ہی اس کو آزادی دلا سکتی تھی۔ وہ مرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ مگر وہ منجھا ہوا شاطر تھا وہ ایسی طال چلنے والا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔،،(۱۱۶)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے طالبان کی مداخلت کے بعد پاکستان کے پیچیدہ حالات کے ساتھ ساتھ خود کش حملہ آوروں کے مذموم عزائم ملکی سالمیت کے خلاف محاذ آرائی، منشیات فروشی اور خود کش بمباروں کے خفیہ منصوبوں کے ذریعے حقیقت نگاری کا اسلوب پیش کیا ہے۔افسانے میں خود کش حملہ آور کی نفسیات اور اس کی شدت پسندی کو جس طرح بیان کیا گیا ہے مجموعی طور پر وہ تمام خود کش حملہ آوروں کی نفسیات کی تصویر کشی کرتی ہے مثلاً

"وہ سیدھا ائیر پورٹ چلا گیا اس نے ایک دور دراز کے غیر ملکی معروف ملک کے ویزے اور ٹکٹ کا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا۔۔۔ نیوز چینل دیکھ رہا تھا۔۔ اس میں ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جسموں اور زخمیوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ بڑی شخصیت کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ البتہ وہ پھر سے لیڈر بن گیا۔ کچھ دیر بعد شناخت شدہ لاشوں کو دکھایا جانے لگا جو

ٹکڑے ہونے سے بچ گئی تھی۔۔۔ طلحہ ان لاشوں کے نام سن کر قہقہے لگانے لگا وہ دونوں
اس کے اپنے بیٹے تھے۔"(۱۱۷)

ان افسانوں میں حقیقت نگاری کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ بعض اوقات ان کا قلم ایک تیز نشتر معلوم ہو تا ہے۔ ان کی ژرف نگاہی نے ان افسانوں کو گہرائی و گیرائی بخشی ہے۔ ان کے ہاں علامتیں اتنی مبہم نہیں کہ ابلاغ میں کسی طرح دقت پیش آئے۔ فکری و نظری اعتبار سے حساس قرار دیئے جانے والے بعض معاملات کو انہوں نے نہایت اخلاص اور دردمندی سے پیش کیا ہے کہ ان کی کہانیاں ہر محب وطن پاکستانی کے لیے ایک نیا جہان معنی آشکار کرتی چلی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ تمام افسانے اپنی تیکنیک، اسلوب اور ڈکشن غرضیکہ ہر حوالے سے بہت مختلف اور متنوع ہیں۔ یہ کہانیاں کرداری واقعاتی خلیج کے باوجود اپنے مشترک زوایہ فکر کی بنا پر ایسے نکتے پر مجتمع ہو جاتی ہیں کہ جس سے دلکش افسانوی صورت پیدا ہوتی ہے جو کہ فن افسانہ نگاری میں ایک پر فضا اضافہ ہے۔

"سب سچ" مشرف مبشر کے افسانوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانے حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ افغانستان کی وادیوں اور پہاڑیوں میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ جس تواتر کے ساتھ گونج رہی تھی سنگلاخ پہاڑوں کی اوٹ میں دور دور تک طالبان ٹولیوں کی صورت میں چوکس کھڑے تھے ان کے چہرے مکمل چھپے ہوتے تھے۔ منصف نے ان طالبان کے ظلم و ستم کی کہانیاں اس مجموعے میں نہایت خوبصورتی سے بیان کی ہیں روس اور امریکہ جیسی سپر طاقتوں کے درمیان کئی عشروں سے کچلتا افغانستان ہمارے کندھوں پر رکھی ہوئی بندوق سے، ان بہادر مگر بے بس افغانوں کو نشانہ بنانیوالی سپر طاقتوں کی کارستانیاں اور مجبور بے بس افغانوں کے زخم زخم وجود کو مشرف مبشر نے اس خوبی اور پر اثر انداز سے بیان کیا ہے کہ ساری سچائیاں ظاہر ہوتی چلی جاتی ہیں ان افسانوں میں کرداروں کی بنت اور ماحول کی حقیقی منظر کشی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے پس منظر میں کار فرما کردار چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ افغانوں کی بربادی ان

کی کٹی پھٹی لاشیں،افغان لڑکیوں کا امریکی فوجیوں سے اپنی عزت بچانے کی ناکام کوششیں۔۔۔افسانہ نگار نے سب کو نہایت چابک دستی سے اپنی تحقیقات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

''وہ اسے دبوچنے نیچے جھکا۔ لڑکی کے خوفزدہ چہرے پر بے بسی کے سائے اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ وہ اپنا بچاؤ نہ پا کر اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے، پیچھے ہٹنے لگی۔ سر سے ڈھلکی چادر کو ایک ہی جھٹکے سے شانوں سے گرادیا اور پلک جھپکنے میں نیچے گہری کھائی میں سر کے بل جھٹکا کھا کر کود گئی۔''(۱۱۸)

مصنف نے جنگ کے نقصانات کے علاوہ یورپ کے مادہ پرستانہ معاشرے میں فرد کی تنہائی کے کرب کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق عوام جنگ نہیں چاہتی بلکہ حکومتیں اپنے مفادات کی خاطر عوام کو جنگ میں دھکیلتی ہیں۔ مصنف کے مطابق جنگ انسانوں سے چین، سکون، عزت، راحت کے علاوہ رشتے، جوانی اور محبتیں چھین لیتی ہے۔ ان افسانوں میں نہایت سلیس اسلوب کے علاوہ جگہ جگہ اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی اور پشتو کے اشعار اور جملے بھی ملتے ہیں اس کے علاوہ تمام افسانوں کی تیکنیک بیانیہ ہے البتہ افسانے '' چاند کے پار'' اور ''نور زمان'' میں ریورتاژ اور سفر نامے کی تکنیک کے ہلکے رنگ نظر آتے ہیں۔

''کیمپ کے قید خانے میں زوردار دھپ کی ضرب خوابوں سے دور لے گئی۔ زخم زخم بدن زمین پر روندا جارہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھا کر دھپ دھپ نیچے پٹکا یا جاتا رہا۔ سیلن زدہ کھردری زمین کا فرش تھا۔ لہو کی بو اور اندھیرے کی گھٹن تھی۔ میرے کھوئے خواب تھے۔ سیب کے درخت اور انگور کی بیلیں نہ تھیں۔ اندھیروں میں سراب آبسے تھے ۔ میری زبان کھلوانے کے لیے تمام حربے آزمائے گئے۔۔۔۔دروازے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ لاشیں باہر پھٹکتی جاتی رہیں۔ مردوں کے ڈھیر میں میرا ادھ مواوجود دب گیا ''۔(۱۱۹)

افسانہ ''دھماکہ '' دہشت گردی کے تناظر میں لکھا گیا ہے اس افسانے میں '' نیاز گل'' کا کردار خود کش حملہ آروں کی سائیکی کی بالکل درست عکاسی کرتا ہے۔ دہشت گرد بھی انسان ہی ہیں اور خود کش حملہ آور برین واشنگ کے باوجود آخری لمحے میں بعض اوقات اپنے ضمیر کی آواز سن کر خود کو ختم کر دیتے ہیں۔ مگر انسانیت کے قتل کا الزام بری ہو کر لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سینے پر لگی ٹائم واچ کی ٹک ٹک سے اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔ ٹک ٹک کی آخری ضرب سے پہلے وہ یہاں سے دور نکلنا چاہتا تھا۔ بدن پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اُسے بے آباد خالی جگہ کی تلاش تھی۔ لوگوں کے ہنستے مسکراتے خوش باش چہروں سے ہر صورت دور ہونا تھا۔ یکدم لوڈشیڈنگ نے اندھیرے کی چادر تان دی۔۔۔۔ زوردار دھماکہ سے زمین دور دور تک لرز اٹھی۔ شعلے بھڑکے۔ دھوئیں کے کالے بادل اٹھے۔ مگر یہ سب کچھ گٹر کے اندر ہی اندر ہوا ٹوٹ پھوٹ بربادی کا ملبہ آس پاس کی خالی زمین پر دھماد ھم گرتا رہا۔ باہر کا سارا علاقہ محفوظ رہا۔ بس ایک خوفناک دھماکہ دور دور تک سنائی دیا۔ رات گیارہ بجے ٹیلی ویژن کے تمام چینلز پر بریکنگ نیوز چلی۔ دہشت گردی کی تباہ کن واردات ناکام ہوئی۔ خود کش بمبار نے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دیا ''۔(۱۲۰)

افسانہ "تصادم" ایک اتحادی فوجی کے احساسات کے جی اٹھنے کی کہانی ہے۔ موضوع اور بیان کا اچھوتا پن قاری کے جذبات واحساسات کو ایک الگ اور نیا موڑ دیتا ہے:

''بدن میں ذرا توانائی آئی تو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ سامنے گھاٹی کی طرف اشارہ کر کے بولے جا رہی۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔ اس اجنبی ملک میں آ کر ان کی بول چال سمجھ میں آنے لگی تھی۔ ہم اتحادی فوجی آپس میں اکثر ان کی زبان کی نقل اتارنے لگے۔ میرا ساتھی فوجی اس کی جوان بہن کو زبردستی کھینچتا ہوا گھاٹی میں اتر گیا تھا۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرا ہاتھ پیٹی میں اڑے ہوئے پستول پر پڑا میں نے اس پر فائر کر دیا۔ اوندھے منہ پتھر پر گرا۔ سینے سے ابلتے لہو نے سبزے پر گلکاری کر دی۔ میرے لیے ایسے مناظر بے معنی

تھے۔ میں ان کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت یہ گولیاں کسی اپنے کے سینے میں اتری تھیں۔ اس افغان دوشیزہ میں مجھے اپنی بہن نظر آئی۔ میں نے بہن کی آبرو بچائی تھی۔ اپنے ساتھی کی جان لینے کا مجھے کوئی افسوس نہ تھا۔اب ان لڑکیوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچانے کی زیادہ فکر تھی۔"(۱۲۱)

ان مندرجہ بالا افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان میں موجود منظر نگاری اور منظر نگاری کرتے ہوئے مرقع نگاری کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ لہذا فنی اور فکری دونوں حوالوں سے زیر بحث مجموعہ نہ صرف خیبر پختونخواہ کے افسانوی ادب کے لیے خاصے کی چیز ہے بلکہ پورے اردو ادب کے افسانوں کے ایوانوں میں ایک روشن امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے پیش بہا اسلوبیاتی، فنی، تکنیکی اور فکری غرض تمام ادبی جہتوں کے بل بوتے پر قابل تحسین ہے۔

ڈاکٹر سید زبیر شاہ کا تعلق بھی خیبر پختونخواہ سے ہے۔انہوں نائن الیون کے تناظر میں افسانے تخلیق کیے ہیں "خوف کے کتبے" ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ایک ان دیکھا خوف پایا جاتا ہے ایسا خوف جو انسانوں کی روح تک کو زخمی کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ افسانے اکیسویں صدی کے مسائل پر محیط ہیں۔ زبیر شاہ نے اپنی کہانیوں میں افراتفری اور انتشار کو علامتی انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی کہانیوں کی فضا میں دہشت گردی، خوف وہراس اور بے چینی ہے۔ جس میں ہر کردار کے گرد خوف کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں ی ہ کردار اپنے ہم زاد کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ مگر ان کے اندر کی دنیا مزید خوف ناک ہو جاتی ہے۔ وہ چیختے چلاتے ہیں مگر یہ چیخیں پلٹ کر ان تک واپس آجاتی ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار تنہائی کا شکار ہیں۔ ان کے افسانے " ابنِ آدم" انقلاب" دو مونہے" اور کولے میں شدت پسندی، دہشت گردی، انتہا پسندی، فرقہ واریت، مذہبی نفرت، بم دھماکوں اور انسانی خوف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ سارے علامتی افسانے ہیں جنہوں ہمیں ان دھماکوں کی منظر کشی کی گئی ہے جس نے عہد حاضر میں اسکولوں، مساجد، گھروں، گلیوں دفاتر وغیرہ کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

''زبیر شاہ کی کہانیوں کا خمیر خوف سے اٹھا ہے بچپن میں اندھیرے یا اچانک آواز کا خوف، خواب میں کسی کا ڈراؤنے منظر کا خوف، کسی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے معاشرے کی نظروں میں مجرم بن جانے کا خوف، انسانی اژدحام میں اپنے تشخص کے قائم نہ ہونے یا پھر کھو جانے کا خوف، بچوں کے مستقبل کا خوف، راہ چلتے کسی اچانک حادثے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خوف، ۔۔۔۔ یہ وہ سب خوف ہیں جو زبیر شاہ کے افسانوں میں مختلف کرداروں کے ذہن میں سرایت کیے ہوئے نظر آتے ہیں''۔(۱۲۲)

دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں نہ صرف عصری صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ ان حالات و واقعات کے خلاف خوب احتجاج بھی کیا گیا ہے۔ چرند پرند کے علامتی کرداروں کے ذریعے افسانہ نگار نے اسلوب فن کو معنویت بخشی ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سوچ میں تضاد اور اجتماعیت نہ ہونے کی وجہ سے خانہ جنگی کی ابتداء ہوتی ہے۔

''فائر کی آواز ایک بار پھر پورے ماحول میں گونجی تو بارود کی بو اور دھوئیں نے گرد و پیش کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہر طرف ہولناک چیخیں "مدد مدد" پکارنے لگیں۔ مائیں جیسے گود میں لیے ہوئے بچوں کی آڑ میں چھپنے لگیں۔ انسانی گوشت کے چیتھڑے زمین پر بکھرے دیکھ کر ذہن مفلوج ہو گئے۔ زمیں آگ اُگل رہی تھی، آسمان شعلے برسا رہا تھا۔ جہاد اور دہشت گردی کا یہ مظاہرہ ایک عرصہ سے جاری تھا اور دونوں اطراف بمطابق ان کے صحیح تھے۔ مجاہد تھے، شوق شہادت کا جذبہ دونوں طرف برابر تھا۔ ان کی توپوں اور بندوقوں سے برسائے گئے گولوں نے ہر منظر دھندلا کر دیا۔ انا کی اس جنگ میں عداوت اور دہشت گردی کی تشہیر ہو رہی تھی''۔(۱۲۳)

افسانہ نگار نے قرآنی آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے انسان کی شر پسندی اور فساد انگیزی پر آواز اٹھائی ہے جب کہ جہاد کے بارے میں لوگوں کو خود ساختہ تقریروں پر بھی طنز کیا ہے۔ افسانہ "انقلاب" بھی خوف و دہشت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس افسانے میں ملکی فسادات اور قتل و غارت گری کے انسانی اذہان پر اثرات کو

موضوع بنایا گیا ہے۔افسانہ نگار نے انسان کے ذہن میں ان خدشات اور ڈر کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جو تجسس سے ہی اسے خوف میں مبتلا رکھتے ہیں۔اس افسانے میں بھی قرآنی آیات کے حوالے دیئے گئے ہیں افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''عوام الناس کے تحفظ کو مد نظر رکھ کر حکومت وقت وقتاً فوقتاً اعلانات کرتی کہ کوئی اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔۔۔اور پھر ایک اعلان سے دوسرے تک گھروں میں مقید لوگوں کی بے شمار لاشیں برآمد ہوتیں تو حکومت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں دیکھتی رہ جاتی گویا کسی مداری کا یقین میں نہ آنے والا کرتب دیکھ رہی ہو۔موت باہر کی ہوا میں بھی تحلیل ہو چکی تھی اور گھروں کے اندر بلوں میں بھی چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔کہیں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔(۱۲۴)

سید زبیر شاہ افسانوں میں خوف کا تاثر ابھارنے کے بجائے امن اور انقلاب کا راستہ بھی دکھاتے ہیں ان کے ہاں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ان افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں انسانی نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ان کا اسلوب نہایت رواں ہیں۔ان کے افسانے میں سب سے بڑی خوبی اختصار ہے۔انہوں نے ان افسانوں میں اسلوب اور تیکینک کی یکسانیت سے گریز کیا گیا ہے۔ان کی کہانیاں علامتی اور تجریدی ہیں۔

"یخ بستہ دہلیز" ڈاکٹر سید زبیر شاہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس کے افسانے "ہجوم مرگ میں زندگی"، "جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، "کفارہ"، محبت خط تنسیخ کی زد میں" اور "ہجوم مرگ میں زندگی" دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ان افسانوں میں عصری ہنگامی معاشرتی صورت حال کو بلا جھجک بیان کیا گیا ہے۔زبیر شاہ نے پختون قبائل کی فرسودہ روایات، خاندانی دشمنیاں، انتقامی جذبات، سانحہ مشرقی پاکستان، سانحہ پشاور، دہشت گردی اور ملک کو درپیش اندرونی وبیرونی خطرات، امیر شہر کا ظلم وستم اور موجودہ حالات پر نوحہ جیسے موضوعات ملتے ہے۔افسانہ نگار نے معاشرے کے انتشار کو اپنی کہانیوں میں منتقل کیا ہے۔"ہجوم مرگ" میں زندگی کا موضوع دراصل سانحہ APS سے تعلق رکھتا ہے۔اس میں انہوں نے الفاظ کو خوب

صورت علامتوں کا جامہ زیب تن کرایا ہے۔ مگر یہ سانحہ اتنا دل دوز تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ میں ناسور کی طرح آج بھی تازہ ہے اور معمولی سا اشارہ بھی ذہن اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

"ماں !۔۔۔۔۔۔۔۔۔بہت سارے ایمبولینس تھے، ہوٹر بج رہے تھے، کہیں دور سے
مسلسل گولیوں کی تڑتڑاہٹ آ رہی تھی۔۔اتنے شور میں بھی اعلان ہر طرف گونجتا رہا،
بڑے چوک میں لاش پڑی تھی، شناخت کر کے لاش لے جائیں۔(۱۲۵)

اس میں دادا کی مسکراتی تصویر میں امن ماضی کی علامت ہے۔ جب کہ دانیال کی پریشانی آج کے منتشر حال کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ سورج کو پھندا معصوم طالب علموں کو بے رحمی اور سفاکی سے قتل کرنے کا استعارہ ہے۔

ماں !۔۔۔۔اس ہجوم مرگ میں زندگی دشوار ہے۔۔۔۔ جہاں تاریکیاں زندگی کو قوت
سے پہلے ہی نگل لیں وہاں سورج کو روشن رہنے کا کوئی حق نہیں"(۱۲۶)

افسانہ "کفارہ" انتہا پسندی پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ جس میں زبیر شاہ نے ایسے کردار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کہ ذہنی و نفسیاتی سطح پر مفلوج ہو چکا ہے۔ اس افسانے میں.... قعامیت..... کا عنصر حاوی ہے۔ اس افسانے میں نفسیاتی الجھن، فلیش بیک اور شعور کی رو کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ اس افسانے کا کردار دہشت گردی کی لہر میں سرحدوں پر مجبوری میں دہشت گردوں کا سہولت کاروں کی مدد کرنے کی وجہ سے ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ ملک کے خراب حالات، خون خرابے اور ٹارگٹ کلنگ نے اس کو نفسیاتی عارضے میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسے ہر طرف خون اور لاشوں کی بو محسوس ہوتی ہے۔ زبیر شاہ اس کردار کے ذریعے پورے پاکستان اور خصوصاً خیبر پختون خوا کے لوگوں کی ظاہری و باطنی عکاسی کر رہے ہیں۔

"بس آپ پہلے جیسے ہو جائیں، ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔،،
اس کی بیوی ہر دفعہ معصومیت سے یہی بات دہراتی تو اسے یوں لگتا جیسے کسی نے اس کی شہ
رگ پر گولی چلائی ہو، کمرے میں پھیلتی ہوئی سڑاند کی اذیت سے بچنے کے لیے وہ غصے اور

ندامت کی کیفیت میں باہر نکل آتااور دیر تک اپنے جسم کو سونگھتا رہتا۔ایسے میں اگر اس کی بیٹیاں گلی میں کھیلتی ہوئیں سب کچھ چھوڑ کر اس پیروں سے لپٹ جاتیں تو وہ بڑی حقارت سے ان کو بھی خود سے دور کر لیتا۔اپنے جسم سے اٹھنے والی اس بو کے باعث وہ اس اپنی بیوی کے قریب جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا، جو اس کی تمام تر محبتوں کا مرکز تھی۔"(۱۲۷)

اس کردار کو اپنی بزدلی اور ضمیر فروشی پر سخت پچھتاوا ہے۔اسی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے اپنی جان تک گنوادی۔اسی طرح کا ایک اور افسانہ "محبت خط تنسیخ کی زد میں" قابل ذکر ہے۔اس افسانے میں کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں مذہب اور سیاست کے غلط استعمال سے بے زاری ملتی ہے۔اس افسانے میں امریکہ کے جنگی جنوں اور پسماندہ ممالک میں انتہا پسندی کو موضوع بنایا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۹۸۰ء سے قبل اور بعد میں دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی۔ان افسانوں میں وحشت، دہشت اور معاشرتی جبر کے عناصر زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔دہشت گردی کے عفریت نے سارے کا سارا عالمی منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔جس کے اثرات اردو افسانے پر بھی صاف نظر آتے ہیں۔خود کش حملوں، بم دھماکوں اور ڈرون حملوں جیسے واقعات ان افسانوں میں موضوع بحث ہیں۔ان موضوعات میں تنوع سے اردو افسانے کے فکر و فن پر لا محالہ دور رس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔سیاسی اور معاشرتی جبر، جمہوریت کا قتل و آمرانہ نظام اور طبقاتی تقسیم کے ساتھ ساتھ خود کش حملوں اور جنگی جنون سے لیس نت نئی دہشت گردی کی وارداتوں اور لرزہ خیز داستانوں سے موضوعاتی سطح پر افسانے کا کینوس وسیع تر ہو گیا ہے جو کہ خوش آئند ہے۔

عہد حاضر میں اردو ادب نے برق رفتاری سے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ایک طرف وقت کی ضرورت کے تحت نت نئی اصناف وجود میں آرہی ہیں تو دوسری جانب پہلے سے موجود اصناف میں فکری اور فنی ہر دو سطح پر انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔دنیا آئے روز ان تجربات و تغیرات کی لپیٹ میں ہے۔یہ عہد ابتلاء کا دور ہے۔پر جانب مقابلے کی سی فضا ہے۔زندگی کے ہر شعبے میں نت نئے رجحانات اور تبدیلیاں آرہی ہیں۔اردو ادب کی شناخت قائم رکھنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس میں جدید رجحانات اور دیگر عالمی ادب کی برابری پر لانے کے لیے ایک معیاری ادب تخلیق کیا جائے جو ہر سطح پر اپنی ایک شناخت قائم کرے یہی حالات کا تقاضا ہے۔المختصر ۹/۱۱ کے واقعہ نے دور جدید کے تمام افسانہ نگاروں پر دور رس اثرات مرتب کیے ہیں اور افسانے

کے موضوع میں وسعت پیدا کی ہے۔ دہشت گردی جیسے ناسور نے ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے انسانوں کو متاثر کیا ہے۔ تمام افسانہ نگاروں نے دہشت گردی کے تناظر میں بہترین ادب تخلیق کر کے اس سنگین مسئلے کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ عصری زندگی کے دیگر مسائل، انسان کی تحقیر، ظلم و تشدد، سیاسی و معاشرتی جبر، طبقاتی تقسیم، فرقہ واریت، ملکی عدم استحکام، خوف اور دہشت، نفسیاتی کشمکش غرضیکہ وہ تمام چیلنجز جو آج کے انسان کو درپیش ہیں وہ ان افسانوں کا موضوع ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے کہانی میں کہانی پن پیدا کر کے حقیقت کی تمام پرتیں بے نقاب کی ہیں۔

آج کے افسانے کا اسٹرکچر مکمل طور پر توڑ دیا گیا ہے اور زبان کی شکست ریخت کے ساتھ ساتھ نت نئے موضوعات متعارف کرائے گئے ہیں۔ جن میں عصری، سیاسی، سماجی صورت حال کو علامتی و نیم علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور دہشت گردی کو بطور موضوع بالخصوص برتا گیا ہے۔ ان افسانوں میں انسانی زندگی کے مشاہدات و تجربات اور مطالعہ کو بیان کر کے جدید موضوعات پر نئی جہات کو کھولتے چلے جانے کی صورتیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس طرح دنیا کے گلوبل ویلج بننے کے معاملات ہوں یا پھر دہشت گردی یا مابعد ۹/۱۱ دہشت اور دحشت میں لرزتی زندگی یا پھر زندگی جینے کی مختلف صورتیں یا موت کے مختلف اسباب، سیاسی، سماجی انتشار اور اکھاڑ پچھاڑ یا اداروں کا انہدام، یا پھر فرد کی شکستگی اور بکھراؤ۔ یہ موضوعات آج کے افسانے کو مزین کرتے ہیں۔ جس سے موجودہ افسانہ جدید راہ پر گامزن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے تمام افسانے موضوعاتی لحاظ سے قابل تعریف ہیں اور بلاشبہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے آئندہ آنے والے افسانہ نگاروں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، جلد اول، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۸۳

۲۔ پریم چند، قاتل کی ماں، مشمولہ کلیات پریم چند از شیما مجید، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۹۶

۳۔ سید احتشام حسین، پریم چند کی ترقی پسندی، مشمولہ اردو افسانہ، روایت اور مسائل، مرتبہ گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۳

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو افسانہ چند باتیں، مشمولہ انتخاب افسانہ اردو (مرتب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸

۵۔ خالدہ حسین، سواری مشمولہ پہچان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۸۸-۸۷

۶۔ مسعود مفتی، امید، مشمولہ ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۴

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، (مرتب)، پاکستانی ادب، ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء (انتخاب افسانہ اردو)، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۸۔ احمد صغیر، ڈاکٹر: اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰ کے بعد) ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۸۵

۹۔ اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، ص ۸۶

۱۰۔ غضنفر، خالد کا ختنہ، مشمولہ: حیرت فروش، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۶۸

۱۱۔ ترنم ریاض، یہ تنگ زمیں، ایچ ایس آفسٹ پریس، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۔۱۵

۱۲۔ پروین اظہر، ڈاکٹر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ ء، ص ۴۳

۱۳۔ مرزا اطہر بیگ، خوشیوں کا باغ (تصویر سے ناول تک)، مشمولہ: ادبِ لطیف، لاہور، شمارہ: ۹، جلد: ۴۹، ۱۹۷۳، ص ۹۳

۱۴۔ سمیع آہوجا، جہنم جمع میں، چترکار، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸

۱۵۔ سمیع آہوجا، جہنم جمع میں، ص ۱۸

۱۶۔ جہنم جمع میں، ص ۲۰

۱۷۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، معاصر ادب، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۴

۱۸۔ سمندر کا پیٹ، مشمولہ، جہنم جمع میں، ص ۳۰

۱۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، (مرتب)، پاکستانی ادب، ۱۹۴۷ء۔۲۰۰۸ء (انتخاب افسانہ) اردو، ص ۱۷

۲۰۔ آصف فرخی، ڈرائے گئے، مشمولہ، شہر ماجرا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۴

۲۱۔ ایضاً، صلوۃ الخوف، ص ۱۴

۲۲۔ ایضاً، محاصرہ، ص ۳۴

۲۳۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۹

۲۴۔ ناصر بغدادی، خوف زدہ کتبے، مشمولہ، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ (انتخاب و تجزیہ)، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۳۶

۲۵۔ زاہدہ حنا، زمین آگ کی، آسمان آگ کا، مشمولہ تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۱

۲۶۔ الطاف فاطمہ، "جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، الحمد پبلی کیشنز، فروری، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۰

۲۷۔ احمد جاوید، سن تو سہی، مشمولہ گواہی، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۸

۲۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پت جھڑ میں مارے گئے لوگوں کے نام، ص ۴۳

۲۹۔ نجیبہ عارف، ۹/۱۱ پاکستانی اور دو افسانہ (انتخاب و تجزیہ)، یورپ اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۴۵

۳۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر، سراب، مشمولہ، عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۶۰۸

۳۱۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳۱

۳۲۔ مسعود صابر، سرخ، مشمولہ ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، انتخاب و تجزیہ، پورب اکیڈمی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۷

۳۳۔ علی حیدر ملک، دہشت گرد چھٹی پر ہیں، مشمولہ، افسانہ اور علامتی افسانہ، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۸

۳۴۔ حیدر قریشی، ''ایٹمی جنگ''، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۸۔۷

۳۵۔ اسلم سحاب، ''ہم سب افسانہ ہیں''، روہی پبلی کیشنز، ساہی وال، ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۶۵

۳۶۔ آصف فرخی، زمین اظہار چاہتی ہے، مشمولہ زمین کا نوحہ، مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۵ء، ص ۴۶

۳۷۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، اردو ادب یورپ میں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۹۔۱۰

۳۸۔ مسعود مفتی، شناخت، مشمولہ فنون، ۱۷۷، لاہور، اپریل تا اگست، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۱

۳۹۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، انتخاب و تجزیہ، پورپ اکیڈمی، اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء، ص ۷۶

۴۰۔ مسعود مفتی، شناخت، ص ۱۲۱

۴۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۲۴-۲۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۵

۴۳۔ مسعود مفتی، بھوک مشمولہ، معاصر، سہ ماہی انٹرنیشنل، ادارہ معاصر، لاہور، جنوری تا جون، ۲۰۰۳ء، ص ۸۹

۴۴۔ ضمیر نیازی، انسانی تمدن کا گہوارہ، مشمولہ دنیا زاد، اے جے پرنٹرز، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۳ء ص ۱۷

۴۵۔ الطاف فاطمہ۔ دید و ادید، مشمولہ، سہ ماہی فنون، شمارہ ۱۲۱، لاہور، س ن، ص ۱۳۶

۴۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۴۸۔ خالدہ حسین، ابن آدم، مشمولہ ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، منتخب افسانے، انتخاب و تجزیہ، نجیبہ عارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، مئی ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۰

۴۹۔ خالدہ حسین، ابن آدم، ص ۱۰۱

۵۰۔ خالدہ حسین، ابن آدم، ص ۱۰۶

۵۱۔ خالدہ حسین، ابن آدم، ص، ۱۰۶

۵۲۔ خالدہ حسین، ابن آدم، ص ۱۰۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۵۴۔ خالدہ حسین، جزیرہ، مشمولہ، دنیا زاد، اے جے پرنٹرز، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۳۶۸-۳۶۷

۵۵۔ منشایاد، پھندا، مشمولہ، شہر افسانہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۵۶۔ منشایاد، پھندا، ص ۵

۵۷۔ منشایاد، ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ، مشمولہ، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۶۶۔۶۷

۵۸۔ منشایاد، ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ، ص ۶۹۔۷۰

۵۹۔ منشایاد، ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ، ص ۷۲

۶۰۔ منشایاد، ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ، ص ۷۳

۶۱۔ شمیم حنفی، گملے میں اُگا ہوا شہر "فلیپ"، نیشنل بُک فاونڈیشن، اسلام آباد ۲۰۱۵ء

۶۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پژمردہ کا تبسم، مشمولہ گملے میں اُگا ہوا شہر، نیشنل بُک فاونڈیشن، اسلام آباد ۲۰۱۵ء ص ۲۴۰

۶۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پژمردہ کا تبسم، ص ۲۴۳۔۲۴۴

۶۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شہر گریہ، مشمولہ، دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بُک فاونڈیشن، اسلام آباد، مارچ ۲۰۱۶ء، ص ۲۰

۶۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شہر گریہ، ص ۲۱

۶۶۔ رشید امجد، رات، مشمولہ، گملے میں اُگا ہوا شہر، نیشنل بُک فاونڈیشن، اسلام آباد، مئی ۲۰۱۵ء، ص ۳۵۴-۳۵۵

۶۷۔ طاہرہ اقبال، پاکستان اردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۶۸۱

۶۸۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۱۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۳۷۔۳۸

۶۹۔ رشید امجد، مجال خواب، ص ۲۲

۷۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۱۹/۱۱ اور پاکستان اردو افسانہ، ص ۳۸

۷۱۔ محمد حمید شاہد، گانٹھ، مشمولہ، دہشت میں محبت، بُک کارنر جہلم، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۹۔۱۱۰

۷۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۱۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۴۰۔۴۱

۷۳۔ محمد حمید شاہد، سورگ میں سور، مشمولہ، دہشت میں محبت، ص ۱۴۶

۷۴۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، (تبصرہ) محمد غالب نشتر، بک کارنر، جہلم، اپریل ۲۰۱۵ء ص ۱۱

۷۵۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، مشمولہ، دہشت میں محبت، ص ۲۴

۷۶۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، ص ۳۱۔ ۳۲

۷۷۔ محمد حمید شاہد، لوتھ، مشمولہ، دہشت میں محبت، ص ۱۱۶

۷۸۔ مبین مرزا، دام وحشت، مشمولہ، خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۸

۷۹۔ مبین مرزا، خواب ہارا آدمی، ص ۱۴۹

۸۰۔ مبین مرزا، سفید پردہ، ص ۵۴۔ ۵۵

۸۱۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان کے تلے، ۶۹۔ ۷۰

۸۲۔ ایضاً، ص ۶۱

۸۳۔ زاہدہ حنا، کُم کُم بہت آرام سے ہے، مشمولہ، رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۱۷، ص ۱۵۴

۸۴۔ زاہدہ حنا، کُم کُم بہت آرام سے ہے، ص ۱۵۸

۸۵۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، ص ۲۱۳۔ ۲۱۴

۸۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر ۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۴۱

۸۷۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، ص ۲۱۶

۸۸۔ زاہدہ حنا، رقص مقابر، ص ۸۸

۸۹۔ ایضاً، ص ۸۵۔ ۸۶

۹۰۔ ایضاً، ص ۹۲۔ ۹۳

۹۱۔ طاہرہ اقبال، یا پروردگار، مشمولہ گنجی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۳

۹۲۔ آصف فرخی، دنیا دنیا دہشت ہے، مشمولہ، دنیا زاد، ۶، اے جے پرنٹرز، کراچی، مئی ۲۰۰۲ء، ص ۹۔ ۱۰

۹۳۔ طاہرہ اقبال، سلیپنگ بیوٹی، ص ۲۶۵

۹۴۔ ایضاً، ص ۵۶۶

۹۵۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۹۶۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۹۷۔ طاہرہ اقبال، واکنگ ٹریک—دو کلو میٹر، مشمولہ ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۲۔۱۵۳

۹۸۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۰۰۔ طاہرہ اقبال، جنگل سکرین، ص ۱۸۹

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۰۳۔ محمد جمیل، ''پگلی''، افسانہ مشمولہ '' نوحہ بے نام'' پشتو ادبی ٹولنہ مالاکنڈ، ۲۰۱۱، ص ۱۴،

۱۰۴۔ محمد جمیل، ''پگلی'' افسانہ مشمولہ ''نوحہ بے نام''، ص ۱۵

۱۰۵۔ محمد جمیل ''ماں''، مشمولہ نوحہ بے نام، ص ۳۰۱

۱۰۶۔ نیلوفر اقبال، آپریشن مائس، فنون لاہور، شمارہ ۱۱۰۹، ص، ۱۸۱

۱۰۷۔ محمد جمیل کاچوخیل، پگلی، مشمولہ، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۵۰-۵۱

۱۰۸۔ محمد جمیل کاچوخیل، پگلی، مشمولہ، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۵۳

۱۰۹۔ محمد جمیل کاچوخیل، پگلی، مشمولہ، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۵۴

۱۱۰۔ محمد جمیل کاچوخیل، ٹوٹا ہوا بازو، مشمولہ، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۵۵

۱۱۱۔ محمد جمیل کاچوخیل، ماں، مشمولہ، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۹۹

۱۱۲۔ محمد جمیل کاچوخیل، رب کریم، مشمولہ، میرا برزخ،، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۹ء، ص ۱۳،

۱۱۳۔ محمد جمیل کاچوخیل، گرگٹ، مشمولہ، میرا برزخ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء ص ۱۱۰

۱۱۴۔ محمد جمیل کاچوخیل، قیمت سے قیامت تک، مشمولہ، میرا برزخ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء ص ۱۱۹

۱۱۵۔ محمد جمیل کاچوخیل، نام۔بے نام، مشمولہ، میرا برزخ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء ص ۱۳۵-۱۳۶

۱۱۶۔ محمد جمیل کاچوخیل، مکافات، مشمولہ، جلتا سرا سلگتی روح، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۱۴۳

۱۱۷۔ محمد جمیل کاچوخیل، مکافات، مشمولہ، جلتا سرا سلگتی روح، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء ص ۱۴۶

۱۱۸۔ مشرف مبشر، ہیرے کی کان سب سچ، منگل کتاب کور، جنگی پشاور، اپریل، ۲۰۱۹ء ص ۳۲

۱۱۹۔ مشرف مبشر، ستم گذیدہ، مشمولہ، سب سچ، منگل کتاب کور، جنگی پشاور، اپریل، ۲۰۱۹ء ص ۲۸

۱۲۰۔ مشرف مبشر، دھماکہ، مشمولہ، سب سچ، منگل کتاب کور، جنگی پشاور، اپریل، ۲۰۱۹ء ص ۶۸-۶۹

۱۲۱۔ مشرف مبشر، تصادم، مشمولہ، سب سچ، منگل کتاب کور، جنگی پشاور، اپریل، ۲۰۱۹ء ص ۸۶-۸۷

۱۲۲۔ سید زبیر شاہ، خوف کے کتبے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱، ص ۹-۱۰

۱۲۳۔ سید زبیر شاہ، ابن آدم، مشمولہ، خوف کے کتبے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱، ص ۷۸-۷۹

۱۲۴۔ سید زبیر شاہ، انقلاب، مشمولہ، خوف کے کتبے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱، ص ۹۷

۱۲۵۔ سید زبیر شاہ، ہجوم مرگ میں زندگی، مشمولہ، یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹر، جنگی پشاور ۲۰۱۷، ص ۱۰۱

۱۲۶۔ سید زبیر شاہ، ہجوم مرگ میں زندگی، مشمولہ، یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹر، جنگی پشاور ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۷

۱۲۷۔ سید زبیر شاہ، کفارہ، مشمولہ، یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹر، جنگی پشاور ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۴-۱۱۵

باب سوم

دہشت گردی پر لکھے گئے منتخب افسانوں کا فنی مطالعہ

ہر نیا عہد جدت ادا اور نئے انداز بیان و طرز احساس کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ یہ اس عہد کے شعور و آگہی، مہم و ادراک اور جذبات و احساسات کی اولین سطح بھی اجاگر کرتا ہے۔ ہر دور میں معیار اور اقدار بدلتے رہتے ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف کی تکنیکیں اور فن میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ حالات و واقعات ان تغیرات کے ساتھ مدغم ہو کر انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ جس سے ادب کے معیار کے سانچے بدل جاتے ہیں اور کہانی کے پرانے ڈھانچے مثلاً اسلوب، تکنیک اور کہانی کی بنت سب کچھ تغیر کا متقاضی بن جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں جدید موضوعات کا اضافہ ہوا ہے جس سے حالات و واقعات کے پیش نظر اردو افسانے کے فن، اسلوب اور تکنیک پر بھی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں افسانے کی ہیئت مغربی ہے مگر مغرب سے متاثر ہونے کے باوجود اردو افسانہ اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ اس نے ہر عہد میں پروان چڑھنے والی کہانیاں اپنے اندر جذب کی ہیں اور تہذیب و تمدن ملکی معاشرت اور قومی زندگی کی عکاسی کی ہیں۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ افسانے کی تشکیلی عناصر میں جو اجزاء سب سے اہم ہیں ان میں پلاٹ، موضوع، تکنیک، اسلوب، وحدت تاثر اور کردار شامل ہیں۔ مگر یہ بات ضروری نہیں کہ یہ تمام عناصر بیک وقت ہر افسانے میں موجود ہوں۔ افسانے میں کرداروں اور واقعات کی تشکیل میں جب تخیل کی واردات ہوتی ہے تو افسانہ تخلیق ہوتا ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہانی پن ہو۔ مگر کسی واقعہ کے کرداروں کی حقیقی تصویر کشی یا پھر منظر نگاری سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ افسانے کی تخلیق کا باعث بن جائے۔ اس قسم کی بیانیہ تحریریں رپورتاژ، انشائیہ، خاکہ یا روزنامچہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کو افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ افسانے میں واقعات و حادثات اور مشاہدات کی نئی ترتیب کو پلاٹ کی تشکیل سے ہی سرانجام دیا جاتا ہے۔ کسی افسانے کا پلاٹ جتنا زیادہ منظم اور مربوط اور متناسب ہوگا۔ افسانے میں اس قدر دلچسپی اور انہماک کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ کہانی کی بنت اور ڈھانچہ دراصل پلاٹ سے ہی تعمیر ہوتے ہیں۔ پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار سازی کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ اس کے علاوہ عنوان کی تلاش، موضوع کا تعین اور آرائش بھی افسانے کے اجزاء کے زمرے میں آتے ہیں۔ اردو

افسانے نے فنی و فکری دونوں سطح پر ایک صدی کی طویل مسافت طے کی ہے۔ جدیدیت کی لہر نے اردو افسانے کو بھی متاثر کیا اور اس میں ایک طرف "نفسیاتی تصورات وقت" فلسفہ وجودیت"، "شعور کی رو" کو فروغ حاصل ہوا تو دوسری طرف اس میں علامت نگاری، استعاروں اور تمثیل نگاری کا رجحان بڑھا۔ جدیدیت آتے ہی افسانے میں بیانیہ اسلوب سے منحرف نظر آئی مگر مابعد جدید عہد میں "بیانیہ" کی واپسی ممکن ہوئی۔ آج کے دور میں لکھے جانی والی کہانیوں کا محور بنی نوع انسان کی ذات ہے۔ فکر انسانی کے تجربات کو مختلف زاویوں سے منعکس کر کے تہہ در تہہ ان کی پرتیں کھولی جارہی ہیں۔ دور حاضر کے افسانوں میں موضوعاتی عمارت کو خارجی ما حول کی صداقت، انسانوں کو درپیش روز مرہ کے سیاسی و معاشرتی مسائل مثلاً بھوک، بے روزگاری، غربت وافلاس، دہشت گردی جنس اور معاشی تضادات پر استوار کیا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی میں تخلیق کیے گئے اردو افسانے فنی اعتبار سے ایک حرارت اور جولانی سے بھرپور ہیں۔

دہشت گردی اور ۹/۱۱ پر لکھے جانے والے افسانے بھی موضوعاتی اور فنی سطح پر تخلیق کیے گئے بہترین افسانے ہیں۔ افسانہ نگاروں نے دہشت گردی جیسے موضوع کو معیاری فن اور اسلوب کے ساتھ ہم آہنگ کر کے افسانے کو بلندیوں پر پہنچادیا ہے۔ ان کی بدولت تجربات کی نئی راہیں متعین ہوئی ہیں اور تخلیق کا کینوس بھی مزید وسیع ہو رہا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے دہشت گردی کے تناظر میں جو افسانے تحریر کیے ہیں ان کا فنی اور اسلوبیاتی جائزہ درج ذیل ہے:

دور جدید میں دیگر علوم کی طرح اردو ادب بھی جدت اور تغیر کی راہ پر گامزن ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ جہاں ایک جانب وقت کی ضرورت کے تحت نت نئی اصناف کی تشکیل ہو رہی ہے تو دوسری جانب پہلے سے مروج اور موجود اصناف میں فکری اور فنی ہر دو سطح پر انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جن سے تخلیق کار اور قاری بیک وقت متاثر ہو رہے ہیں اور یہ اثرات براہِ راست متاثر کر رہے ہیں۔ دنیا گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس میں ہر لمحہ تغیر کی سی کیفیت ہیں۔ ہر گھڑی ارتقاء کا عمل جاری و ساری ہے۔ جس سے تمام شعبہ ہائے زندگی میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ فکر کے نئے محور تشکیل پا رہے ہیں اور علم و آگہی میں وسعت آگئی ہے۔ یہی علم و عرفان نئے فلسفوں کو جنم دے رہا ہے۔ اردو ادب بھی زمانے کی کروٹوں کے ساتھ رویہ تغیر ہے اور اس میں فکر اور فن کے انداز میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ جس نے تمام اصناف ادب مثلاً شاعری، ناول، افسانہ اور تنقید و تحقیق کے موضوعات اور اسالیب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جس سے اردو ادب میں عموماً اور افسانوی ادب میں خصوصاً وسیع پیمانے پر تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور آج کے دور میں تخلیق ہونے والا

افسانوی ادب بلاشبہ معیاری ادب میں شمار ہوتا ہے۔ خصوصاً مختصر افسانہ دور جدید کی سب سے مقبول صنف ادب ہے۔ موضوعات اور تیکنیکوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے افسانے کو نئے دور میں داخل کر دیا ہے۔ یہ بات اس امر کی شاہد ہے کہ اردو افسانہ زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کے ساتھ وسیع ہوتا گیا ہے اور تمام تر تبدیلیوں کو اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا ہے۔ یہی بات افسانے کی عظمت و انفرادیت اور اس کی زیست کی دلیل ہے۔

ہر دور اپنے ساتھ نئے مسائل کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات لے کر آتا ہے۔ زمانے نے جس جانب کروٹ بدلی، موضوعات میں تنوع آتا گیا۔ اس کا سہرا افسانہ نگاروں کے سر جاتا ہے کیوں کہ ایک تخلیق کار حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اور انسانی نفسیات اور پیش آنے والے نازک سے نازک حالات و واقعات کا ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی نسبت اس میں احساسات اعلیٰ سطح پر جنم لیتے ہیں۔ وہ زمانے کو اپنے تجربات کی عینک سے دیکھتا ہے اور پیش آنے والے انہی مسائل کو تخلیقی قالب میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر لے آتا ہے۔

اردو افسانہ ابتداء سے اب تک ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے۔ پریم چند نے یلدرم کی رومانوی فضا کو بدل ڈالا کیوں کہ ان کے زمانے کے حالات و واقعات اور ضرورتیں بدل چکی تھیں۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں مزدور اور نچلے طبقے کے عام آدمی کے حق میں قلم اٹھایا۔ دیہی زندگی اور مناظر فطرت کے متعلق لکھا اور ظلم و بربریت اور معاشی و سماجی استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے انسانی بے بسی اور اشرافیہ کی بے حسی جیسے موضوعات پر افسانے لکھے۔ اس طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کا تجربہ کامیاب ٹھہرا۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک وجود میں آگئی اور زمانہ تغیر کے قلابیں بھرتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ گیا، وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مسائل کی نوعیت بھی بدل گئی اور اس طرح افسانوں میں موضوعات میں بھی تبدیلی آگئی۔ موضوع میں تبدیلی سے ہر گز یہ مراد نہیں کہ زمانے کے بدلنے سے حالات واقعات یا نئے مسائل آسمان سے نازل ہو گئے جن پر موضوعات بھی بآسانی ہاتھ لگ گئے یا پھر یہ بات بھی درست نہیں کہ زمانہ اچانک سے کسی وقت کی کسی مخصوص تاریخ یا سن میں بدل گیا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی مستقل نہیں۔ اور ہر لمحہ وقوع پذیر ہونے والا تغیر مستقل جاری و ساری ہے۔ جب کوئی بڑی اور واضح تبدیلی رونما ہوتی ہے تب ہی زمانے کے اس تغیر کا احساس ہوتا ہے اور جب مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے تو موضوعات بھی بدل جاتے ہیں اور لکھنے والوں اور تخلیق کاروں کے نظریے اور ان کی سوچ کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ تخلیق کاروں نے جبر اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان لوگوں نے سماجی برائیوں کو بے نقاب کیا اور عام انسانی موضوعات پر بیش قیمت ادب تخلیق کیا۔ انہوں نے عام طبقے کے مسائل مثلاً مزدور کا استحصال، متوسط طبقے کی پریشانیاں، جاگیرداروں اور زمینداروں کا جبر وغیرہ کو موضوع بنادیا۔ اس کے علاوہ تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات، تقسیم کے وقت کی صعوبتیں، ہجرت کا کرب، عالمی جنگ کے پوری دنیا پر اثرات، مذہبی و علاقائی تعصبات و تنازعات اور اسی نوعیت کے ان گنت موضوعات پر اس تحریک سے منسلک افسانہ نگاروں اور ادیبوں نے افسانے لکھے۔ کیونکہ یہ موضوعات ہی اس دور کی پیداوار تھے اور ان پر لکھنا اس وقت کی ضرورت تھی۔ برصغیر کی تقسیم پر بھی بہت سے اچھے افسانے تخلیق کیے گے اور یہ دکھ بھی ایسا دکھ تھا جس پر تقریباً تمام افسانہ نگاروں نے لکھا۔ فسادات پر لکھے جانے والے افسانے آج بھی لازوال حیثیت رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد اردو افسانے کے موضوعات اور تیکنیک میں بے پناہ تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں بعض نے روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے افسانے تخلیق کیے۔ اور تیکنیک اور فن کو چھیڑے بغیر ہی اچھا ادب تخلیق کیا۔ مگر بعض نے روایت سے انحراف کیا اور پرانے اصولوں سے الگ ہو کر نئے تجربات کیے اور اردو افسانے کو نئی ہیت اور شکل عطا کی۔ یہ اردو افسانے کے عروج کا دور ہے۔ اس دور میں افسانے نے فکر و فن کے کئی مدارج طے کیے اور مغربی تحریکات اور ادب سے بہت کچھ مستعار لیا۔ جو کہ بدلتے ہوئے واقعات اور حالات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتا ہوتا آج جدت کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔

اردو افسانے کے اسلوب، تکنیک اور کردار نگاری پر دہشت گردی کے اثرات

فن اور ادب ایک دوسرے کے لیے ضروری اور لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی بھی ادیب یا تخلیق کار اپنے معاشرے سے ہی کچھ اجزاء اکٹھے کر کے ان کو ترتیب دیتا ہے۔ وہی اجزاء اس کے ذہن میں ایک فکری اور عملی قوت پیدا کرتی ہیں۔ ان کو محرکات کہا جاتا ہے۔ یہی محرکات ہی ادب کی تخلیق کا سبب بن جاتے ہیں۔ ان محرکات کے پیش نظر ایک تخلیق کار کچھ تخلیق کرتا ہے۔ باتیں جب تک دماغ میں پوشیدہ رہتی ہیں، وہ محرکات کہلاتی ہیں مگر جب کوئی تخلیق کار ان باتوں کو تخلیق کی صورت میں منظر عام پر لاتا ہے تو وہ موضوع بن جاتے ہیں ۔ جب محرکات بدلتے ہیں تو موضوعات بھی بدل جاتے ہیں۔ حوادث اور واقعات کی تبدیلی گزشتہ کچھ عرصے میں مزید تیز ہو گئی ہے ۔ آج کے عہد میں حوادث اور واقعات کی حیرت انگیز تیزی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان حوادث میں "دہشت گردی" کا ناسور آج سر فہرست ہے۔ جس نے سارا عالمی منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ دہشت گردی کے کریہہ واقعات کے رونما ہوتے ہی ہیں تخلیق کاروں اور فن کاروں نے محسوس کر لیا تھا کہ

اب دنیا کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے، نہ ہی وہ اقدار باقی رہی ہیں، نہ ہی اخلاقیات پہلے جیسی ہیں۔ جن کو بنیاد بنا کر بہت سے اخلاقی اصولوں کو وضع کیا گیا تھا۔ دہشت گردی کے واقعات اور خصوصاً نائن الیون کے سانحے کے رونما ہونے سے اردو افسانے میں موضوعات بدل گئے اور افسانہ نگاروں میں سے ایک گروہ نے روایت سے ہٹ کر اردو افسانے کے موضوع کے ساتھ ساتھ اس کی ہیت کے بھی تجربات کیے۔

"فلسفۂ وجودیت" اردو افسانے میں ایک خاص موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان چاند پر جا چکا ہے مگر آج کے مشینی دور میں وہ اپنی شناخت ہی کھو چکا ہے۔ دہشت گردی نے دنیا کے ہر خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ "وجودیت" کا فلسفہ اسی دہشت زدہ ماحول اور فضا، انسان کی شناخت کھو جانے کا خدشہ، انسانی قدروں کے کھو جانے اور رشتوں کے بکھرنے جیسے حالات کا ہی عطیہ ہے۔ آج کا انسان خود کو تنہا سمجھنے لگا ہے۔ ان مسائل نے انسان کے خارج سے زیادہ داخل کو گھائل کیا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے انسان کی انہی داخلی کیفیتوں کی بازگشت کو ان کے اندر ڈوب کر سننے کی سعی کی اور موضوعات کو خارج سے نہیں بلکہ داخلی سطح پر منتخب کیا۔ اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ افسانہ نگاروں نے دیگر سیاسی یا معاشرتی حالات سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ بلکہ انہوں نے تو ہر اس محرک کو موضوع بنایا جس نے انسان کے داخل کو چوٹ پہنچائی۔ انسان پر اس کے گرد و نواح کے حالات و واقعات ہی اثر انداز ہوئے۔ افسانہ نگاروں نے انہی مسائل کو موضوع بنا کر کہانیاں لکھیں۔ ان موضوعات میں عدم مساوات، ظلم و بربریت، جبر و استحصال، دہشت گردی، معاشرتی عدم استحکام، اور اس طرح کے متعدد مسائل شامل ہو گئے۔

الف۔ اردو افسانے کے اسلوب پر دہشت گردی کے اثرات

کسی بھی فن پارے میں اسلوب کی اہمیت مسلم ہے۔ اسلوب دراصل ادائے خیالات اور اظہار و جذبات کا ڈھنگ ہے۔ یعنی یہ کسی شاعر یا ادیب کے جذبات و خیالات کے اظہار و بیان کا وہ طریقہ ہے جو خصوصاً اس صنف کی ادبی روایت میں کسی مصنف کی ذاتی انفرادیت کے شامل کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ کسی تخلیق کار کی انفرادی خصوصیات کی تشکیل میں اس کا کردار، افتادِ طبع، مشاہدات و تجربات، طرزِ فکر و احساس اور فلسفہ حیات جیسے عوامل مل کر حصہ لیتے ہیں۔ اسی لیے اسلوب کسی بھی تخلیق کار کی شخصیت کا عکس سمجھا جاتا ہے۔

"لفظ اسلوب، انگریزی کے لفظ اسٹائل کے مترادف ہے۔ یونانی زبان میں اسٹائیلاز (Stylos) اور لاطینی میں (STYOLOS) اسلوب کا ہم معنی ہے اور ہندی میں اسے شیلی کہتے ہیں۔"[1]

کسی بھی ادبی فن پارے کا اسلوب اس وقت معیاری ہو گا جب اس کی تخلیق میں اظہارِ جذبات اور ادائے خیال کی انفرادیت کے مخصوص رنگ نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ فن کار کی انفرادیت بھی آشکار ہو گی۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے مطالعے اور مشاہدے کو یک سو کر کے منضبط کرتا ہے اور جابجا بکھرے ہوئے تاثرات کو ایک رشتے میں منسلک کر کے انھیں لسانی صورت عطا کرتا ہے تو اسلوب پر غور و خوض نہایت ضروری امر ہے۔ مشہور مفکر والٹر پیٹر اپنے ایک مضمون میں کہتا ہے:

"Style is a certain absolute and unique manner of expressing a thing in all its intensity and colour."(2)

یعنی اسلوب کسی معانی اور خیال کے طریق کا نام ہے۔ والٹر کے نزدیک اظہار کے اسی پیرائے کو منفرد ہونا چاہیے۔ اظہار کی انفرادیت ہی دراصل ادیب کے اندازِ بیان کو انفرادیت بخشتی ہے۔

دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں تیکنیکی و اسلوبیاتی سطح پر تنوع پایا جاتا ہے۔ جدید افسانے میں تیکنیک اور اسلوب کے جو تجربات ہوئے ان میں رمزیت اور پیکریت، علامتیت اور تجریدیت جیسے عناصر نمایاں ہیں۔ اس دور کے افسانے میں بھی علامتیت اور حقیقت نگاری دونوں اسالیب کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے فسادات اور مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد سارے کا سارا سماجی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس نے انسانی سوچ کا انداز اور ڈھب ہی بدل ڈالا۔ لہٰذا قدیم ڈھانچے میں شکست و ریخت کے بعد جدید انداز اور فن اختیار کیا گیا اور جدید تیکنیکیں متعارف ہوئی۔ نئے اسالیب متعارف ہوئے۔ شاید اسالیب تو وہی تھے مگر کہانی بیان کرنے کا انداز تھوڑا سا حقیقی اور زیادہ سلیس ہو گیا۔ دہشت گردی نے اردو افسانے کے روایتی اسلوب میں تنوع پیدا کیا۔ ادب ہر زمانے میں اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی اردو افسانہ اپنی روایت سے مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ جدت کی راہ پر بھی گامزن ہے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی قتل و غارت گری نے اردو افسانے کے اسلوب اور علائم و رموز پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جس سے اردو افسانے کا فن دہشت، وحشت اور شدت کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی، قتل و غارت، خودکش دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ، ٹائم بم کے دھماکوں، قاتلانہ حملوں مسجد اور امام بارگاہوں پر حملوں اور اس طرح کے دیگر واقعات میں اردو افسانہ نگاروں حق گوئی اور صداقت کا علم بلند رکھا ہے۔ اس سے اردو افسانے کے اسلوب پر نمایاں اثرات مرتب ہوئے کیونکہ یہ موضوع حقیقت اور راست بازی کا تقاضا کرتا ہے اور حساسیت کو بیان کرنے کا متقاضی ہے اسی لیے ان افسانہ نگاروں نے اسلوب میں سادگی

اور سلاست کو چن کر اسلوب کے سیدھے سادھے طریقے کو اپنایا ہے۔ان افسانہ نگاروں نے پیچیدہ اسالیب سے احتراز برتنے کی کوشش کی ہے اور حتی الوسع اپنی بات کو مقصدیت اور حقیقت پر مبنی اصولوں پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ادب کے ذریعے قارئین تک حق بات پہنچائی جائے اور دہشت گردی کے اس ماحول میں پس پردہ عناصر کو بے بقاب کیا جاسکے۔دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں کا تقریباً ستر فیصد حصہ بم دھماکوں، دہشت گردی، جنگ وجدل اور قتل وغارت گری کے گرد گھومتا ہے۔جس میں دکھ، درد غم، دھماکے اور ڈرون ہیں۔جب کہ صرف تیس فیصد حصہ کہانی، رومانیت اور مثبت چیزوں کے بارے میں ملتا ہے۔

نئے افسانوی اسلوب کی ترویج میں ڈاکٹر رشید امجد کا نام بہت اہم ہے۔ان کے انوکھے موضوعات، مخصوص طریقۂ فکر اور تیکنیک نے ایک نیا اسلوب جنم دیا۔ان کے ہاں نثری اسلوب شاعرانہ فضا سے قریب تر ہے۔ان کے ہاں علامت اور استعارے کے ساتھ ساتھ تمثیل کا بھی استعمال ملتا ہے۔ان کے ہاں پیکر تراشی کا عمل عجیب ہے۔استعارے اور پیکر تراشی کے امتزاج سے مربوط تحریر ہوتی ہے جو کہ تصویر کی جلوہ کشائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔رشید امجد کے موضوعات میں لامحدودیت ہے۔انہوں نے بیانیہ افسانے کی مضبوط روایت کو توڑ دیا اور نئی علامت گری سے سماج کی نئی کہانی بیان کی۔یہ دور گھٹن زدہ تھا۔رشید امجد نے علامتی افسانے کی پوری شکل اور ماہیت ہی بدل ڈالی۔

دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گے افسانوں میں علامتوں کا استعمال بہت سی جگہوں پر ملتا ہے۔یہ علامتوں کا شعوری استعمال معاشرتی چیرہ دستیوں کی داستان بیان کرتا ہے اور ریاسی انتشار اور اتھل پتھل سے جس طرح پورا ملکی منظر نامہ متاثر ہوا، یہ اس کی روداد بھی سناتے ہیں۔سیاسی اور معاشرتی دہشت گردی کی زد میں لکھے گئے افسانوں میں "ایک کہانی اپنے لیے" "سناٹا بولتا ہے"، "پژمردہ کا تبسم"، "بگل والا"، "بادشاہ سلامت کی سواری" "شہر گریہ"، "رات" اور "مجال خواب" کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ان افسانوں میں معاشرے کی بے حسی اور سفاکی انسانیت کا منہ چڑاتی ہے۔"پژمردہ کا تبسم" میں افسانہ نگار نے ایک عام آدمی کے جذبات و احساسات کو حالات کے عتاب کا شکار دکھایا ہے۔اور علامت کے ذریعے حالات کی تصویر کشی کی ہے۔اس افسانے کا پلاٹ ایک ایسے شخص کے گرد گھومتا ہے جو درحقیقت "عام" ہے۔کمزور انسان پر جبر و تشدد اور ستم رسیدگی آج ہمارے معاشرے کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھا رہا ہے اور نائن الیون کے واقعے کے بعد تو جبر و تشدد کے انداز بھی بدل چکے ہیں۔ٹیکنالوجی نے جہاں آلات اور دیگر اشیاء کو جدت بخشی ہے، اسی طرح ظلم و جبر کے نت نئے طریقے بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔جبر و تشدد کے واقعات جب حد درجہ بڑھ جاتے ہیں تو

ایک تخلیق کار اور فن کار علامات کا استعمال کر کے اشاروں کنایوں میں اپنا مدعا بیان کرتا ہے تا کہ ان علامتوں میں پوشیدہ اس کے دل کی بات قاری تک پہنچ جائے اور اعلیٰ قوتوں پر بظاہر ان باتوں کا معنی و مفہوم آشکار نہ ہو۔ اس طرز کی تخلیقات زمان و مکان کی قید سے مبرا ہوتی ہیں اور ان میں ناموں کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ان اشاروں کنایوں کی زبان کو ہم "بگل والا" میں واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ رشید امجد کے ہاں "عام آدمی" بطور بنیادی استعارہ استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے عام آدمی کی کہانیاں ہی پیش کی ہیں اور زندگی کی مشکلات اور غم والم کی کیفیت کا شکار "عام آدمی" رشید امجد کی نظر میں سب سے خاص ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> "رشید امجد عام آدمی کو در پیش صورت حال کی محض تصویریں نہیں اتارتے اور نہ ہی کسی ایک واقعے یا زاویے میں مقید ہو کر اسے فوکس کرتے ہیں۔ بلکہ مختلف سطحوں اور مختلف زمانی و مکانی منطقوں کے، زاویے بدل بدل کر حقائق کو نقش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے یک رخے یا عام و محامیانہ نہیں بلکہ کثیر جہتی، متنوع اور معنویت سے مملو ہیں۔"(۳)

عہد حاضر میں دہشت گردی کا ٹیگ محض ایک مخصوص گروہ کے لیے مختص کیا گیا ہے اور وہ ہیں مسلمان۔ آج کے انسانی معمولات زندگی میں "دہشت گردی" کا موضوع اپنے بھیانک چہرے کے ساتھ منصۂ شہود پر نمودار ہے۔ یہ ایک ایسا عفریت ہے جس کا خوف اور دہشت زمانہ قدیم سے ہی کسی نہ کسی صورت میں در پیش رہا ہے۔ مگر اس کو عجب اتفاق ہی کہیے کہ اس کی آج تک کوئی بھی حتمی تعریف معرض وجود میں نہیں آسکی۔ کیوں کہ جتنے بھی مقتدر ممالک اور اقوام تھیں، انہوں نے اپنے دشمن کے لیے "دہشت گرد" بطور لقب استعمال کیا۔ مگر افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو ساری دنیا میں دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے۔ تمام قوتیں مسلمانوں کو اس لیبل سے ہی نوازتی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی میں متحد ہوتی جارہی ہیں۔ یہ اصطلاح امریکہ کی ہی اختراع ہے اور یہ بات بھی اب بالکل عیاں ہے کہ نائن الیون کے سانحے کے بعد امریکہ اور اس کے حامیوں نے مسلمانوں پر بہت زیادہ سختیاں کی ہیں۔ عام آدمی تک مسلمانوں کا ایک غلط تصور ابھارا جارہا ہے اور ان کے ذہنوں میں ایسا زہر گھول دیا ہے کہ آج لوگ مسلمانوں سے بات کرنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ اس سارے معاملے پر بین العلومی مکتبہ فکر کے ادباء نے آواز اٹھائی اور قلم کے ذریعے ان حالات اور غیر مساوی رویے کو تنقید کی زد میں دنیا کے سامنے ابھارا۔ اردو ادب کے مختلف تخلیق کاروں نے اپنی

شاعری اور افسانوں میں اس نکتے کو موضوع بنایا۔ گزشتہ دو دہائیوں میں ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھے والے لوگوں کی زندگی میں بے شمار تبدیلیاں آئیں۔ دہشت گردی نے جہاں ہر ذی روح کو متاثر کیا ہے۔ وہاں ہر ذی شعور کی سوچ کے زاویے ہی بدل دیے ہیں۔ تمام تخلیق کاران خوف و دہشت کے واقعات کی کرچیاں اپنی تخلیقات میں سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ان کی تخلیقات کی دبیز تہوں میں دبے وہ دردناک واقعات ذہن انسانی کو ایک لمحے کے لیے مفلوج کر دیتے ہیں کہ جس انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنا کر اختیارات عطا کیے۔ آج وہ انہی اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے اللہ کی مخلوق کو ایذا پہنچا رہا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کے اسلوب میں جہاں تندی و تلخی اور دہشت و وحشت کی وجہ سے ایک عجیب سی جذباتیت اور حساسیت پیدا کر دی ہے۔ وہاں ایک روشن کل کی ہلکی سی کرنیں بھی پھوٹ رہی ہیں کہ ایک دن اس غم کے بادل چھٹ بھی جائیں گے اور تمام عالم انسانی بے خوف و خطر فضاؤں میں قدم رکھے گا۔ یہی شادمانی کی نوید ہی قارئین کو جینے کی امنگ سی دیتی ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اس ضمن میں "شہر گریہ" میں رشید امجد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ "مجال خواب" بھی اسی موضوع کا عکاس ہے۔ "شہر گریہ" میں کہانی کو اساطیر کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس افسانے میں اپنے وطن کی خستہ حالی بیان کرتے ہیں۔ اور اشارتاً بنی اسرائیل کی گریہ وزاری کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ جب وہ بابل و نینوا میں بخت نصر کی قید میں تھے۔

> "وہ روتا تھا شہر میں جو بچ گئے تھے وہ بھی روتے تھے۔ بنی اسرائیل تو وطن کی دوری پر روتے تھے لیکن وہ اپنے ہی شہر میں جلا وطن تھے اور شہر میں جلا وطن ہے اور شہر کو روتے تھے۔ سارا شہر دیوار گریہ تھا"۔ (۴)

اس افسانے میں ایک تاریخی واقعے کی طرح کا ایک ملتا جلتا فرضی قصہ تیار کیا گیا ہے جس کو اصل قصے سے منطبق کیا گیا ہے۔ چوں کہ مصنف کے واقعات اس کے اپنے ماحول سے جڑے ہوتے ہیں اور وہ اپنے افسانے کے لیے کہانی بھی اپنے آس پاس سے بنتا ہے۔ اس لیے قارئین کی خاص توجہ حاصل کرتا ہے اس طرز عمل کو تمثیل نگاری کہا جاتا ہے۔ جس سے کوئی مراد کوئی ایسی حکایت یا قصہ ہے جو کسی دوسری مذہبی، سیاسی، فلسفیانہ اور اخلاقی صورت حال کی مانند ہو۔ شہر گریہ میں بنی اسرائیل کی آہ و بکاہ تمثیل نگاری کی اعلیٰ مثال ہے ۔ جس کو اشاراتی تلمیح بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس سے مصنف کی تاریخ سے دل چسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے

یوں اس افسانے میں یہ ٹریجڈی تاریخی ٹریجڈی سے افزوں تر ہو جاتی ہے۔ علامتی انداز میں بنی اسرائیل کا رونا تو سمجھ میں آجاتا ہے مگر قاری کو کہانی کے ہیرو یا اس کی طرح کے بیشتر لوگوں کے رونے کی وجہ

سمجھ میں نہیں آتی۔ جو انسانوں پر ظلم و ستم کی داستانیں رقم کر رہے ہیں اور ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ اپنے وطن کی دھجیاں اڑنے میں جو عناصر مشغول ہیں اور جس سرزمین میں زندہ مردوں کے مترادف ہیں۔ بم دھماکے جہاں روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں اور عام آدمی اب اس درد کو سہتے سہتے اس کا عادی ہی ہو چکا ہے۔ جنت کی بشارت اور حوروں کا حصول انسانیت کو زخمی کرنے میں سب سے اول ہے۔ ایسی سرزمین پر عوام اجنبیت محسوس کر رہے ہیں۔ افسانہ نگار نے بنی اسرائیل کی تلمیح استعمال کر کے اس دور کے بدترین لوگوں کا موازنہ آج کے ظالم اور شر پسند لوگوں سے کیا ہے اور یہ احساس دلایا ہے کہ یہ ملک تو یہودیوں سے بھی بدتر ہوتا جا رہا ہے اور انسانیت کی شناخت ہی مٹتی جا رہی ہے۔

"میں کون ہوں؟ میں کون تھا، ہوں بھی یا نہیں، اگر نہیں تو پھر یہ کون ہے جو ابھی تک میرے وجود میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔"(۵)

آج کے انسان نے گویا اپنی شناخت ہی مسخ کر لی ہے۔ اس نے انسانیت سے گری ہوئی روش اپنا کر تمام انسانیت کو ایک سوالیہ نشان بنا لیا ہے کہ کیا انسان قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر زمینی خدا بن کر جزا و سزا مقرر کرنے کا حق دار ہے۔ یا پھر وہ گناہوں کی دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا ہے۔

جدید افسانہ اسلوب و اظہار کے بے پناہ تجربات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ جن میں علامت، اسلوب، تمثیل اور ہیت کے ان گنت تجربات کو افسانے میں بے پناہ وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر گزرنے والی قیامت کے واقعے کو بہت سے افسانہ نگاروں نے تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں رشید امجد کے افسانے قابل ذکر ہیں۔ انتظار حسین کی طرح رشید امجد بھی ایسے تخلیق کار ہیں جن کو موضوعات کے برتاؤ کے ساتھ اسلوب کی وجہ سے فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔

"خاک قندھار سے اڑی، لہور کو چھوتی دلی پہنچی، یہ جغرافیہ کا سفر تھا اور تاریخ تو میں خود ہوں۔ ہوائی اڈہ کی جرورت سے فارغ ہو کر وہ جب لاونج سے گزر رہا تھا تو نظر ٹی وی پر پڑی سلائیڈ چل رہی تھی۔۔۔ "قندھار پر امریکی طیاروں کی شدید بمباری۔۔۔" اس نے گھبرا کو دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ بیگ نیچے جا پڑا۔۔۔ قندھار، لہو دلی سب ملبے کا ڈھیر بن گئے۔"(۶)

ان کے اسلوب میں محسوس و غیرہ محسوس اشیاء کی تجسیم ہے۔ ان کا افسانہ "مجال خواب" تمثیلی انداز میں تاریخ کے قبرستان کے سفر کی داستان بیان کرتا ہے۔ اس افسانے میں کہانی کا راوی واحد متکلم ہے۔ ان کے

افسانے کا معنیاتی نظام ایک سیدھ میں چلتا ہوا بلندیوں کو چھولیتا ہے۔ جیسے ہی علامت نگاری کی جلوہ گری ہوتی ہے، تو ان کا افسانہ حقیقی مفہوم سے کوسوں دور نکل جاتا ہے اور نئے معانی و مفاہیم پیدا کر دیتا ہے۔

"قومیں عروج پر جا کر زوال کے راستے پر کیوں چل پڑتی ہیں، وہ بار بار پوچھتا۔ لیکن مرشد جواب دینے کے بجائے کوئی اور بات شروع کر دیتا۔ آخر تنگ آکر اس نے کہا۔ "میں تاریخ کے قبرستان میں ایک بار پھر جانا چاہتا ہوں۔ مرشد کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا۔ کیا کروگے جا کر دیکھوں گا کہ عروج و زوال آخر ہے کیا مرشد نے شانے اچکائے۔ "تو چلو"۔ ہر قبر کے کتبے پر عروج و زوال کی پوری داستان رقم تھی۔ وہ ایک ایک قبر پر رکتا، سارا کتبہ پڑھتا۔ یارب تغیر! یہ کیا اسرار ہے کہ ساری داستانیں ایک سی ہیں، لیکن کسی سے سبق نہیں سیکھا۔" مرشد مسکرایا۔ عروج ایک نشہ ہے اور نشے میں عقل کام نہیں کرتی۔"(۷)

درج بالا اقتباس میں عروج و زوال کی داستان کو "تاریخ کے قبرستان" کی علامت کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو جیتے جی مرنے کا احساس تک نہیں ہوتا وہ دولت، شہرت اور طاقت کے نشے میں موت جیسی حقیقت سے بالکل بے بہرہ ہو جاتا ہے اور جب موت ایک روز اس کے سرہانے آٹھہرتی ہے تو اس کے پاس اس تلخ حقیقت کی سچائی کو سوائے ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا اور یہ باقی اہل عقل و شعور کے لیے عبرت ہے کہ دنیا کی ہر چیز ہی فانی ہے۔ اگر کسی چیز کو دوام ہے تو وہ ہے موت کے بعد کی زندگی۔ اس افسانے میں تمثیل کاری عروج پر ہے۔

وزیر آغا لکھتے ہیں:

"صحیح معنوں میں علامتی افسانے لکھنے کے سلسلے میں سب سے اہم نام رشید امجد کا ہے۔"(۸)

انہوں نے دہشت زدہ اور شکست خوردہ سماج میں علامت کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور معاشرتی، معاشی اور سیاسی انحطاط اور ابتری کو افسانے کے قالب میں ڈھالا۔

رشید امجد نے جس عہد میں آنکھ کھولی، وہ ایک ایسے انحطاط زدہ سماج کا پروردہ ہے۔ جس نے وقت کے تمام اتار چڑھاؤ بڑی شدت سے محسوس کیے۔ یہ سماج اس قدر شکستگی سے دوچار ہے کہ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔ رشید امجد علامتوں کا ایک نظام قائم کر کے اس کھوکھلے سماج میں بچی کھچی کوئی امید تلاش کر رہے ہیں جس کی بدولت اس دہشت زدہ معاشرے میں شاید کوئی خوشیوں کی کرن پھوٹے

ساجدہ شاہین لکھتی ہیں:

"رشید امجد ایسا علامتی افسانہ نگار ہے۔ جس نے اس زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں، طبقاتی تضادات کی نفرت انگیز صداقتوں اور معاشرے میں ان غلاظتوں سے اپنے افسانوں کے موضوعات اخذ کیے ہیں جن کو اکثر لوگ عام گھٹیا سمجھ کر گزر جاتے ہیں۔"(۹)

رشید امجد نے علامتوں کے ذریعے ایک نئی دنیا تخلیق کی۔ انہوں نے دہشت گردی جیسے خشک موضوع کو بھی نہایت خوب صورتی سے پیش کیا۔ وہ جو بھی تحریر کرتے ہیں اسے مکمل شکل میں اپنی چشم تصور سے دیکھتے ہیں اور پھر بھرپور انداز میں کہانی منتقل کرتے ہیں۔

"شہر کو آگ لگ گئی تھی اور بجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ بس رونا ہی رونا تھا، جانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی، پیچھے رہ جانے والے آہ و بکا ہی کر سکتے تھے۔

"اپنے کیے کا کوئی علاج نہیں۔" سوچتا، "اور جو بویا ہے وہ تو کاٹنا ہی ہے۔"(۱۰)

اس علامتی اسلوب کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلوب کے باقی خصائص کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں اسلوب کے تمام رنگ پائے جاتے ہیں۔ اس میں تشبیہ واستعارہ، رمزیہ، کنایہ سب موجود ہیں۔

"گلابی آنکھوں اور سرمئی انگلیوں والی دیوی اپنے سنہری رتھ پر سوار خراماں خراماں دہلی ائیر پورٹ پر اتر رہی تھی اور اس کے پیچھے جہاز لینڈنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔"(۱۱)

یعنی وہ ایک بہترین افسانہ نگار کی طرح اپنے اسلوب میں مقصدیت، حقیقت اور رومانیت کا بہترین امتزاج کرتے ہیں۔ اس انداز بیان سے ان کے افسانوں میں دہشت گردی جیسے ثقیل موضوع کے بیان کے باوجود بھی کہانی پن غائب نہیں ہوتا۔

تشبیہ واستعارہ کی مزید مثال ملاحظہ کریں:

"پرندوں کی چہچہار یک دم بند ہو گئی۔ یوں لگا گلابی آنکھوں اور سرمئی آنکھوں والی صبح کا کھلتا رتھ درمیان میں کہیں رک گیا ہے۔۔۔۔ چچا ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ قندھار۔۔۔ لہور۔۔۔ دلی!"(۱۲)

عام معنوں میں یہ اندازِ بیان علامتی و استعاراتی کہلاتا ہے۔ لیکن رشید امجد کے افسانوں کی تیکنیک ،اختصار کے باوجود سادہ الفاظ میں پنہاں جہان معنی اور جملوں کی معروضی و فکری ساخت ان کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ابلاغ کا مسئلہ جنم نہیں لیتا۔ "اختصار" جو کہ افسانے کا سب سے اہم نکتہ ہے۔ رشید امجد

کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ان کی کہانی میں بیانیہ کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کے افسانے میں معنی کے کئی جہان آباد ہیں اور قاری ان کے افسانے کی گہرائی میں ڈوب کر کہیں بھی اکتاتا نہیں۔احمد اعجاز لکھتے ہیں:

"معروف معنوں میں قبر خوف ،دہشت اور فضا کی علامت ہے لیکن ہمارے کہانی کار نے "بیزار آدم کے بیٹے" سے "عام آدمی کے خواب "تک قبر کو علامتی اور استعاراتی سطح پر معانی و مفاہیم کے جو نت نئے پیرہن عطا کیے ہیں اس کی معمولی نظیر بھی پوری افسانوی روایت میں نہیں ملتی۔"(۱۳)

"شہر گریہ "میں بھی انہوں نے علامتی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ان کے ہاں جوں جوں سیاسی اور خارجی جبر بڑھتا ہے۔موضوع کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب میں بھی شدت پیدا ہوتی ہے اور علامتی سلسلے بھی اسی نسبت سے اپنے ڈھب بدلنے لگتے ہیں۔یہی چیز انہیں مزید منفرد بنا دیتی ہے۔افسانہ "سراب" سیاسی افراتفری اور ہنگاموں پر لکھی گئی کہانی ہے۔ہر طرف ماحول گولیوں اور دھماکوں سے آلودہ ہے۔شہر تو کئی شہروں کا ایک تھا۔اس لیے ایک حصے میں چلنے والی گولیوں کی تڑتڑاور چیخیں دوسرے حصے میں سنائی نہیں دیتی تھیں۔لیکن فضا میں خوف کی ایسی چپچپاہٹ تھی جو سسکیوں اور آہوں کو لمحوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیتی تھی۔

نئے افسانوی اسلوب کی ترویج میں ڈاکٹر رشید امجد کا نام بہت اہم ہے۔ان کے انوکھے موضوعات، مخصوص طریقہ فکر اور تیکنیک نے ایک نیا اسلوب جنم دیا ہے۔ان کے ہاں نثری اسلوب شاعرانہ فضا کے قریب تر ہے۔ان کے ہاں علامت اور استعارے کے ساتھ ساتھ تمثیل کا استعمال بھی ملتا ہے۔ان کے ہاں پیکر تراشی کا عمل عجیب ہے۔استعارے اور پیکر تراشی کے امتزاج سے مربوط تحریر وجود میں آتی ہے جو کہ تصویر کی جلوہ کشائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

خالدہ حسین کے ہاں سیاسی شعور اور دہشت گردی کے موضوعات کا ذکر براہ راست کم ملتا ہے۔ انہوں نے اس کا علامتی اور تجریدی انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ان کے افسانوں میں علامت کے ذریعے اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ شعور کی رو اور آزاد تلازماتی عمل بھی ملتا ہے۔ان کے افسانوں کا اسلوب سادہ اور غیر جذباتی ہے جو کہ بلند آہنگی سے لبریز ہے۔انہوں نے ترغیبی اور مقصدی اسالیب اور انقلابی حقیقت نگاری کے برعکس رمزیہ ،علامتی اور باطن نگاری کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ان کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے براہ راست سیاسی شعور کا ذکر اپنے افسانوں میں نہیں کیا اور نہ ہی زیادہ تر براہ راست سیاسی علامتوں کا استعمال

کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی نفسیاتی اشاروں تک خود کو محدود کیا۔ دہشت گردی سے متعلق ان کے لکھے گئے افسانے بالغ عصری شعور سے آراستہ ہیں۔ان کے اسلوب میں ایک خاص قسم کے تجسس کی فضا پائی جاتی ہے۔

اسلوبیاتی سطح پر ان کے افسانے میں تجریدیت وعلامتیت اور استعارے کا استعمال معنویت کے کئی جہان آباد کرتا ہے۔ان کے افسانوں میں پیغام کی داخلی لہر داخل ہو جاتی ہے۔ان کے افسانوں میں ظاہر و باطن کی کشمکش ایک مابعد الطبیعاتی دنیا کی تشکیل کرتی ہے۔وجودی نقطۂ نظر اور اساطیری جہات بھی ان کی تخلیق کا خاصہ ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں تہہ در تہہ شعور کے شعری وسائل کو بھی بخوبی برتا ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں ظاہر و باطن کے درمیان ایک کشمکش سی پائی جاتی ہے۔ان کے اسلوب میں بلند آہنگی، سادگی اور غیر جذباتی پن پایا جاتا ہے۔انہوں نے انقلابی حقیقت نگاری، ترغیبی اور مقصدی اسالیب کے برعکس باطن نگاری، رمزیہ اور علامتی اسلوب اختیار کیا۔

> "میں بھی نہیں مانتا تھا مگر اس زمین کی ہوائیں بین کرتی ہیں اور کرتی آئی ہیں۔یہاں کی زمین سیال سونا اگلتی رہے۔اس سے کچھ نہیں ہوتا۔فاقہ اور جبر یہاں کی کونسلوں پر لباس کی طرح منڈھ دیے گئے ہیں۔اس وقت میرا مسئلہ صرف اپنے حصے کا احتجاج ہے۔ایک بہتر موت کا انتخاب کر کے:
>
> "مگر ضروری نہیں، موت ضروری نہیں، ہر گز نہیں، زندہ رہنا زیادہ قرین قیاس، زیادہ فطری عمل ہے۔"اس کے اندر کسی نے کہا تھا اور بے حد شرمندہ ہو گیا تھا۔اس نے پھر سوچا، یہ بزدلی اس میں کب اور کس طرح پیدا ہوئی۔شاید یہ بھی موروثی ہوتی ہے۔"(۱۴)

خالدہ حسین کے ہاں عورت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔وہ عورت کی بے بسی اور محرومیت کو جدید علامتی اسلوب میں اس ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں کہ ایک تعلیم یافتہ عورت کے محسوسات نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس میں تمام حسیات موجود ہوتی ہے اور وہ عورت ایک نئی شناخت کے ساتھ دنیا میں سامنے آتی ہے۔

> "مگر اس وقت لیلیٰ اس کے سامنے تھی۔سیاہ عبایا میں لپٹا اس کا خوب صورت جسم۔وہ جسم جس کو دیکھنے اور چھونے کی خواہش پر قابو پانے میں وہ بری طرح ناکام رہا تھا۔اسے معلوم تھا لیلیٰ ابو حمزہ سے منسوب ہے۔یہ ایک اور وجہ تھی اس کی شرمندگی کی۔اسے لگتا، اس کے

جسم میں لہو کے بجائے شرمندگیاں اور ندامتیں دوڑتی پھرتی ہیں۔اس وقت ابو حمزہ نے کہا، "لیلی تم بینک کے چوراہے پر دن ۲ بج کے پانچ منٹ پر پہنچو گی۔ میں اور قدوس مارکیٹ کی سڑک پر عین اسی وقت۔ پھر ابو حمزہ نے اپنی قمیض کی جیب سے ایک چھوٹا سا کیمرہ نکالا۔"(۱۵)

خالدہ حسین نے نہ براہ راست زیادہ تر صرف براہ راست علامتوں کو استعمال کر کے اور سماجی نفسیاتی اشاروں تک خود کو محدود کر لیا ہے۔ بلکہ انہوں نے ان دونوں کے حسین امتزاج سے ایک مخصوص سطح کو وجود میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ان کے افسانے اپنے عہد عصر کی آواز ہوتے ہوئے بھی ماروائے عہد خو شبو سے بھرپور ہوتے ہیں۔

زاہدہ حنا کا ایک افسانہ "نیند کا زرد لباس" ہے۔اس افسانے کا پلاٹ انتہائی مربوط اور منظم نظر آتا ہے۔ جس میں کہانی نہایت روانی سے بہتی چلی جاتی ہے۔ پلاٹ کی کامیاب بنت ہی ان کے اسلوب کو پر کشش بناتی ہے۔ان کے ہاں جزئیات نگاری اور پیکر تراشی کا عنصر بھی کافی نمایاں ہے۔افسانے کے پڑھتے ہی قاری اسی فضا میں شامل ہو جاتا ہے کہ گویا وہ اس کہانی کا حصہ ہو۔

"رات آئی تو ہم دونوں اپنی چارپائی پر لیٹے رہے۔ آسمان کی سیاہی مائل نیلگونی میں ذی قعد کی تیسری رات کا چاند ہماری آنکھوں کے سامنے طلوع ہوا اور ڈوب گیا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی پھر اس نے ایک گہری آہ بھری "اگلی عید ہم جانے کہاں کریں گے یہ سوال نہ تھا، خود کلامی تھی۔"(۱۶)

زاہدہ حنا ایک لبرل ترقی پسند خیالات کی مالک اور نظریاتی افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی بحران اور بعد ازاں دہشت گردی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے ہاں آشوب عصر کی معنویت نہایت عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔ مصنفہ نے ماضی اور عصر رواں کو باہم جوڑ کر شامل حال کیا ہے اور اسی کو مزید آگے بڑھا کر مستقبل کے لیے بھی سوالات و احکامات کی گنجائش چھوڑ دی۔ان کی اسی خوبی نے ان کے افسانوں میں نئے معانی اور مفاہیم پیدا کر دیئے ہیں۔

"میں نے پہلی مرتبہ اس شہر کو دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں قندوز، بدخشاں، ہرات اور دریائے آمو کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں نے پہاڑوں کے اس عظیم دائرے میں تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان اس دریا کو بہتے دیکھا تھا۔"(۱۷)

ان کے ہاں جو اسلوب اپنایا گیا ہے ،وہ روشن خیالی سے مزین ہے۔ان کے افسانے کراچی کے سیاسی حالات، بدامنی اور دہشت گردی کا ماجرا بیان کرتے ہیں۔ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ دراصل ان کے ضمیر کی آواز ہیں۔وہ کہتی ہیں:۔

"میں نے اپنے ضمیر اور شعور میں چبھی ہوئی پھانسوں کو قلم کی نوک سے نکالا ہے اور ورق پر رکھ دیا ہے۔اب اگر آپ کو چبھنے لگیں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔"(۱۸)

ان کے افسانوں میں طنز کا عنصر کافی نمایاں ہے۔ان کے ہاں وجودی احساسات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مگر انہوں نے وجودی فلسفے کو بے عملی کی بنیادوں پر اپنانے سے گریز کیا ہے۔یہی طنز کے نشتر انسانی ضمیروں کو جگانے کے لیے ایک آواز ہیں۔

"ہڈیاں لے لو۔ہڈیاں لے لو۔ازبک اور پشتون ہڈیاں،تاجک اور ترکمان ہڈیاں،ہزارہ اور بنجارہ ہڈیاں۔
پکے پنجبر افقان،پنجاہ سینٹ،پنجاہ سینٹ۔
"رقص مقابر۔۔۔۔قبر کھودنے والوں کا رقص۔"(۱۹)

زاہدہ حنا نے جہاں دیگر زبانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔وہاں ہندی زبان کا زیادہ استعمال ملتا ہے۔ مثلاً:

"میری دلاری دادی ماں
نمشکار"۔"(۲۰)

زاہدہ حنا نے زبان وبیان کے بے شمار تجربات کیے ہیں۔ان کے اسلوب میں غیر زبانوں کے الفاظ بھی بے حد روانی سے بہتے چلے جاتے ہیں جو کہ یہ ان کا خاصا ہے۔کسی بھی افسانے میں کہانی پن کے ساتھ ساتھ رومانیت ایک لازمی جزو ہے۔کوئی بھی قصہ جس میں رومانیت کا تاثر قائم کیا جائے وہ قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں رہتا۔زاہدہ حنا نے دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں جہاں جبر، وحشت، خوف، ظلم اور اضطراب کی تصویر کشی کی ہے وہاں اپنے اسلوب میں رومان کی فضا بھی قائم رکھی ہے تاکہ افسانے میں توازن برقرار رہے۔ان افسانوں میں رومانوی اسلوب بھی واضح دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً:

"جب میں ٹوکیو میں تھی تو مجھ سے پہلی بار محبت کی گئی۔اس شام ہم دونوں چہل قدمی کے لئے نکلے تھے۔شام ہو رہی تھی اور ہم سبزے میں چل رہے تھے۔جس پر پیڑوں پر

گرے ہوئے سفید پھول بچھے ہوئے تھے۔ اچانک اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر میرا بوسہ لیا۔ ہم اس بوسے کی گہرائی میں ڈوب گئے، پھر اچانک ایک جھٹکے سے وہ مجھ سے الگ ہو گیا۔ میں نے انکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ میری نظر اس کے ہونٹوں پر پڑی، وہ سرخ تھے۔ ان میں خون لگا ہوا تھا"۔ (۲۱)

زاہدہ حنا نے دہشت گردی جیسے سنگین موضوع کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلوب اور زبان و بیان کے تجربات بھی کیے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ اسلوب میں جو کاٹ دار انداز نظر آتا ہے وہ دہشت گردی کے واقعات کا نتیجہ ہے۔ جس نے ان کے اسلوب پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ رقص مقابر اس کی اعلی مثال ہے۔

منشا یاد کے افسانے بہترین اسلوب میں ان کی مضبوط گرفت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے افسانے دور حاضر کی بے معنویت اور بے یقینی کے عکاس ہیں۔ جن میں فرد کی تنہائی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں عہد جدید کی تیکنیک جس طرح متعارف ہوئی ہے اسی سے کہانی کا گراف مسلسل بلندیوں کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ جس سے ان کی کہانی کثیر الجہت معانی و مفاہیم سے روشناس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بات کہنے کا فن ہے۔ انہوں نے روزمرہ زندگی سے موضوعات منتخب کر کے اپنی مخصوص تیکنیک سے نہایت کامیابی سے بیان کر دیا ہے۔ ان کا افسانہ "ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ" صیغہ واحد متکلم میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے دہشت گردی کے موضوع کو ایک عام گھرانے کے معصوم جوان کے مجاہد سے شہید تک کے سفر کو بیان کیا ہے۔ وہ کہانی سنا نہیں رہے بلکہ خود بخود کہانی بنتی چلی جاتی ہے۔ انہوں نے واقعیت پسند اسلوب کا تجربہ کیا جس سے کہانی ان کی گرفت میں رہتی ہے۔

محمد فیروز لکھتے ہیں:

"محمد منشا یاد کے لکھنے کا ایک اپنا انداز ہے جو صاف پہچانا جاتا ہے۔ اس طرح کا اسلوب بنا لینا بڑی بات ہے۔" (۲۲)

ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ" اور "پھندا" سمیت دیگر افسانوں میں اسلوب میں وسعت اور تنوع محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے کسی ایک اسلوب پر اکتفا نہیں کیا۔ ان کے افسانے صداقت، حقیقت اور ندرت کے عمازہیں۔ جن میں سادگی و پرکاری کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ یہی مصنف کی کامیابی ہے کہ ان کے افسانوں میں کہانی پن آخر تک قائم رہتا ہے۔ اس کی اصل وجہ کہانی کی ماہرانہ بنت ہے۔ ان افسانوں میں پورا ایک عہد جھلکتا

ہے۔۔ جس میں قاری خود کو موجود اور حاضر محسوس کرتا ہے۔ کہیں وہ اپنی کہانی میں فصاحت و بلاغت لانے کے لیے قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ کہانی میں حقیقت کا رنگ زیادہ نمایاں ہو۔ جس طرح کا موضوع ہو اس میں اسی طرح کی شیرینی گھولنا ان کا خاص کمال ہے۔ مثلاً

> "آج کی دنیا کی تمام کافر طاقتیں اسلام کو مٹانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ آج مسلمان مغلوب ہے۔ آج کشمیر کی طرف دیکھ لیں۔ فلسطین، عراق اور افغانستان کی طرف دیکھ لیں۔ مسلمان بہنوں اور ماؤں کی عزتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ مسلمان بوڑھوں اور بچوں کو بے گناہ شہید کیا جا رہا ہے۔ وجہ کیا ہے کہ وہ لا الٰہ پڑھتے ہیں۔ یاد رکھیں اگر ہم آج نہ نکلے تو کل وہ ہمارے گھروں پر بھی چھانے والے ہیں۔ ابا جان اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آنے کا مقصد بھی بیان کیا ہے کہ "میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔"(۲۳)

اس طرح کا اسٹائل تحریر میں تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے واقعات کے انتخاب میں نہایت چابکدستی اور فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہانی میں ڈرامائی کیفیت ہونے کے باجود دہشت گردی جیسے کریہہ عمل کو بھی فاش کیا ہے۔ دونوں افسانے "پھندا" اور "ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" میں اختصار کے باوجود بھی ایک "مجاہد" بننے کے پورے عمل کو افسانہ نگار نے تفصیلاً بیان کر دیا ہے۔ جس سے ایک اچھے افسانے کی خوبی عیاں ہوتی ہے جس میں مختصر نقطۂ نظر کے باوجود جامعیت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ انہوں نے دہشت گردی جیسے مسائل اور مذہ کی آڑ میں بلیک میلنگ جیسے سنگین مسئلے کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے اور اشاروں کنایوں میں دہشت گرد تنظیموں کے عزائم سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کے ہاں پلاٹ کی بنت انتہائی منظم دکھائی دیتی ہے۔ کہانی پن جب ڈرامائی صورت حال اختیار کرتا ہے تو افسانے کی فضا مزید پر کشش ہو جاتی ہے اور مختصر فقروں اور الفاظ کے ذریعے زندگی کے مختلف فلسفوں اور مسائل حیات کی فکری لہریں ابھرتی چلی جاتی ہیں۔

> "شاید آپ کا اشارہ میرے بھائی کی اس مالی امداد سے ہے جو وہ امریکہ سے ہمیں کبھی کبھار بھجواتا ہے۔ مگر شاید مولانا کو علم نہیں کہ وہ کچھ عرصہ سے خود امریکیوں کی حراست میں ہے۔"(۲۴)

بعض جگہوں پر افسانہ نگار نے شاعرانہ تاثر اپنایا ہے۔ مثلاً:

"ہمیں اس دنیا سے کیا لینا، شہادت ہے مشن اپنا
پہاڑوں پہ دفن ہوں گے، کفن ہو گا برف اپنا۔"(۲۵)

منشایاد کی لفظیات ان کی کہانیوں میں حقیقی رنگ بھرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایسے الفاظ کا استعمال زیادہ ہے جو افسانے کے لیے بر محل ہوں اور جو افسانے میں محاکاتی رنگ بھر دیں۔ وہ اپنی تحریر میں علامات سے بے شمار الفاظ کا کام لینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ ان کا اپنا تشبیہاتی نظام ہے۔ ہمیں ان کے ہاں بر محل اور بر موقع محاورات کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ علامتیت، ادھورے جملے، شاعرانہ تلازمے اور عدم تکمیلیت جدید افسانے کی خصوصیات ہیں۔ وہ کفایت لفظی کے عادی ہیں اس لیے قاری ان کے مفاہیم کو سمجھنے کے لیے اپنے ذہن کے تمام دریچے کھلے رکھتا ہے۔ اگر ان کی لفظیات کی بات کی جائے تو اس افسانے میں خوبصورت تراکیب اور لفظیات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے وسیع مشاہدے اور مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کا چناو گہری معنویت رکھتا ہے۔

منشایاد نے روایت کی ڈور تھامے ہوئے جدت پسندی کو بھی اپنایا ہے۔ دہشت گردی جیسے خشک اور سنگین موضوع کو انہوں نے جس طرح مہارت سے بیان کیا ہے وہ ان کی بلندی تخیل کی دلیل ہے۔ وہ گہری اور دراز علامتوں کا استعمال نہیں کرتے بلکہ ان کے افسانوں میں نیم علامتی انداز ملتا ہے۔ انتظار حسین کی رائے میں:

"منشایاد نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ بڑا تجریدی اور علامتی افسانے کا دور تھا اور اس میں بڑی چمک دمک تھی اور نقادوں کی طرف سے تجریدی افسانے کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔ مگر نقاد کسی کا ہو کر نہیں رہتا۔۔۔۔۔ اب اگر اس دور میں آپ کو کہانی تلاش کرنی ہے تو وہ منشایاد ہی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض کو دیکھ کر کہانی بھاگی اور منشایاد کی انگلی پکڑ کر واپس آئی۔"(۲۶)

یعنی ایک مصنف کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ علامت کو اس کے متوازی سانچوں میں رکھ کر بیان کرے۔ جب معنویت منظر عام پر آئے تو ابہام کی گنجائش نہیں رہے گی اور قاری ان علامتوں کو خود بخود سمجھ جائے گا۔

منشایاد کے ہاں کفایت لفظی جیسی فنی مہارت بھی ملتی ہے۔ کفایت لفظی سے مراد الفاظ کے کم استعمال میں خیالات کو پرونا اور کچھ الفاظ میں ہی اپنا مدعا بیان کر دینا یا پھر الفاظ میں کفایت برتنا کفایت لفظی کہلاتا ہے۔ منشایاد نے اپنے افسانے میں اثر آفرینی ابتداء سے انتہاء تک برقرار رکھی ہے جو کہ ان کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ چند جملوں کے ذریعے ہی کردار کی باطنی کیفیت بتا دیتے ہیں۔

منشایاد کا حسن تحریر یہ ہے کہ ان کی تحریریں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ زندگی کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ وہ نہایت آسان الفاظ میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو بظاہر بہت پیچیدہ محسوس ہوتا ہے

انہوں نے روایتی کہانی کاری کے ساتھ عصر جدید کے مسائل کو مدغم کر کے اپنے اسلوب کی گل کاری کی ہے۔ ان کے ہاں کہانی کی بنت، پہلوداری، جمالیاتی عناصر، ڈرامائی کیفیت، کرداروں کی منفرد پیشکش اور فصیح و بلیغ اور سادہ زبان باہم مل کر ایک تحریر میں جان ڈال دیتے ہیں اور یہی ان کے افسانے کو آفاقی بنا دیتے ہیں۔

الطاف فاطمہ نے افسانے "یونہی کوئی مل گیا تھا سر شام" میں بیانیہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے دونوں افسانوں کی کہانی کو اپنے منطقی انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت اور فقروں کی ترتیب جملہ مواد کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ مثلاً "دید وادید" کا ایک ابتدائی پیرا گراف ملاحظہ ہو۔

> "ہاں تو میں ہارون الرشید اب اس اجڑے دیار، اس مرحوم کے دو مصری ہوٹل شیر ٹن اور ہوٹل فلسطین کے درمیانی فاصلے کے ایک مقام پر کھڑا ہوں۔ آپ کو شاید مغالطہ ہو کہ شاید یہ وہی ہارون الرشید ہے جو کبھی راتوں کو بھیس بدل بدل کر انجانے اور ان دیکھے طور پر اپنے شہر کی آبادی اور رونقوں کا نظارہ کرتا ہے۔ پھر رات گئے کسی پردیسی مسافر کو یا کسی نادار بھوکے کو دریا کنارے سے پکڑ کر لاتا۔ پھر بڑے تپاک سے اپنے دستر خوانوں پر بٹھا کر لذیذ کھانوں سے تواضع کرتا۔۔۔ نہیں یہ ہارون وہ ہارون تو نہیں جس کی معمور اور آباد بستی کو چنگیز اور ہلاکو نے اپنی حرص و آز کی بنا پر لاشوں کا شہر بنا دیا تھا۔ اللہ کے کچھ بندے بستیاں بساتے اور ان کو بڑے شوق سے سجاتے بناتے ، دلہن کی طرح آراستہ کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان بستیوں کو اجاڑ کر ایک نیا طور طریق دیتے ہیں۔ وہ شہروں کو کھوپڑیوں کے میناروں سے سجاتے ہیں اور خالق کائنات ہر دو قسم کے انسانوں کے نفسیاتی تضاد کو ملاحظہ کرتا اور چپکے چپکے مسکراتا ہے۔"(۲۷)

اس افسانے میں ہارون الرشید کا کردار تاریخی ہے۔ جس کو ہم تلمیح کہہ سکتے ہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کے لیے اپنی تحریر میں تلمیح کا استعمال کرنا اتنا آسان کام نہیں۔ اس فن کار کے لیے ایسے خیالات والفاظ تراشنے پڑتے ہیں کہ کچھ الفاظ پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں اس واقعہ، سانحہ، قول، آیت یا شعر کی جانب چلا جائے اور چند سطور ہی اس کے دماغ میں سارا واقعہ تازہ کر دیں اور اس تحریر سے اس کا ربط بھی سمجھ جائے۔

مصنفہ ایک تاریخی شہر بغداد کی تاریخ اور اس کی عظمت رفتہ بیان کر کے آج اس کے اجڑنے کی کہانی بیان کر رہی ہیں۔ تہذیب کے زوال کو انہوں نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی تاثیر قاری کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے۔ انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقت کو ہی موضوع بنایا ہے اور سماجی زندگی کی حقیقتوں کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی میں درد کی کیفیت پیدا کر کے انہوں نے اسے اثر انگیز کر دیا ہے۔ ان افسانوں کی کہانی میں سچائی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ ان کی تحریروں کی گہرائی اور گیرائی ان کے وسیع و عمیق مشاہدے کی عکاسی کرتی ہیں۔ انہوں نے سیاسی و اخلاقی خرابیوں، طبقاتی و سماجی استحصال، دہشت گردی، خود غرضی اور مفاد پرستی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

ان کے افسانوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کثیر تعداد میں ملتا ہے۔ مثلاً "دید وادید" میں استعمال ہونے والے چند انگریزی الفاظ درج ذیل ہیں:۔

انفراسٹرکچر' پے انگ گیسٹ، پولیوشن، اپس اینڈ ڈاؤن، ڈیپارٹمنٹ، سینکشن، سوری، کیریئر، انجیکشن۔Faculties, Fickleminded,Rude وغیرہ

ان افسانوں کے جملے پر معنی الفاظ سے مزین ہیں جو کہ افسانہ نگار کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہیں۔ الطاف فاطمہ اپنی تحریروں کو تشبیہات واستعارات سے مرصع کرتی ہیں۔ یہ انداز ان کے افسانوں کو علامت نگاری کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے عنوانات سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ علامتی ہیں۔ مگر اس میں ابلاغ کا مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔ ان کے ہاں محاورات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ محاورہ نثر کی جان ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے ان افسانوں کو اردو کے محاوروں سے مزین کیا ہے۔ اگرچہ محاوروات زیادہ استعمال نہیں کیے مگر جہاں کیے، وہاں عمدہ اور بر محل ہیں۔ جس سے ان کی تحریر مزید جاندار ہو جاتی ہے۔

"وہ تو ایک ہی شادی کے نام سے بدکتے ہیں۔۔۔۔۔ کہاں دو دو چار چار کا ٹنٹا پالیں گے۔"(۲۸)

ان کے افسانے میں کیفیاتی فضا قائم رہتی ہے۔ جس سے ایک بھرپور قسم کا تاثر ابھرتا ہے۔ یہ افسانے قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہی کسی فن پارے کی کامیابی ہے۔ الطاف فاطمہ نے کہیں کہیں علامتی اور نیم علامتی انداز اپنایا ہے۔ ان افسانوں کا اسلوب سادہ مگر الفاظ بہ معنی ہیں۔ اس سے جملوں کی معنویت بھرپور انداز میں سامنے آتی ہے۔ ان میں چھوٹے چھوٹے جملے سے بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی ہیں۔

"دید وادید" میں منظر نگاری بھی بلندی پر ہے۔ جو کہ بغداد کے عہد رفتہ کا پورا نقشہ بیان کرتی ہے۔ ان مناظر میں فطری پن جھلکتا ہے۔ جس ماحول کو بیان کیا گیا ہے اس کی جزئیات آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان افسانوں میں منظر کشی، داخلیت اور خارجیت دونوں سطحوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ الفاظ کی مدد سے جو مناظر تشکیل ہوئے ہیں وہ انسان کے حسن لطیف کو متاثر کیے بنا نہیں رہتے۔ قاری کے سامنے ایک فلم سی چل جاتی ہے اور ایک کے بعد دوسرا منظر چلتا رہتا ہے۔ پورا منظر ایک جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے اسلوب میں کہیں کہیں رومانویت بھی ملتی ہے۔ ماضی سے محبت اور حال سے بے زاری کا رویہ رومانوی رجحانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری پرانی تہذیب و ثقافت سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔

ان افسانوں کے موضوعات جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ اسی طبقے کی زبان بولتے ہیں۔ موضوعات کے زبان و بیان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فلاں موضوع کس ماحول سے تعلق رکھتا ہے "دید وادید" میں بعض جگہ پر مکالماتی انداز گفتگو بیان کیا گیا ہے جس سے ان کی نفسیات ان کے مزاج اور افسانے کے پلاٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مکالموں کے ذریعے سے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

مبین مرزا کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور بیانیہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے روایتی اور بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مگر وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانے میں فنی اور تیکنیکی تبدیلیاں آتی گئیں اور ان کے افسانے میں نیم علامتی انداز شامل ہو گیا۔ افسانہ نگار ماضی سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہوئے اور حال کے عصری تقاضوں اور ضرورتوں کا گہرا شعور لیے ہوئے مستقبل کی جانب گامزن ہیں۔ مبین مرزا نے اپنے ارد گرد رونما ہونے والے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات و واقعات کو ہی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانے میں معاشرتی ناہمواریوں، اخلاقی بے حسی، سیاسی و نفسیاتی مسائل، ظلم و بربریت، دہشت گردی، خوف و وحشت اور زمانے کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی اقدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے سبھی افسانوں کی یہ امتیازی خوبی ہے کہ ان کے افسانوں کی ابتداء ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور ان کا انجام نہایت چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ ابتدائیہ کی مثال دیکھیے۔

"وقت اچانک بہت تیزی سے گزرنے لگا تھا"(۲۹)

"خودکشی یا قتل

"فیصلہ تو اب اُسے کرنا ہی ہو گا۔"(۳۰)

ان افسانوں کا اسلوب نہایت شستہ ہے۔ جملے نہایت سادہ اور معنویت سے بھرپور ہیں۔ گویا مبین مرزا کے پاس کہانی بنانے اور ایک مخصوص سمت میں اسے آگے بڑھانے کی بے پناہ صلاحیت اور قوت ہے۔ ان افسانوں کا اسلوب پر کشش ہے۔ اور افسانہ نگار کو اظہار پر مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ کم سے کم جملوں میں بڑے بڑے واقعات سمیٹ لیتے ہیں۔ جن میں کہانی بڑی روانی سے چلتی ہوئی انجام تک پہنچتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً

"امام صاحب جمعے کا خطبہ پڑھ رہے تھے جب شیخ سخاوت علی کی نظر اس آدمی پر پڑی۔ جھرجھری سی آگئی اسے۔ سوچا اٹھے اور جا کر اسے پکڑ لے اور لوگوں کو بتائے کہ یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے۔ مشکوک ہے، لیکن یوں اضطرابی انداز میں اٹھنا اسے عجیب لگا۔"(۳۱)

مصنف نے اپنے اسلوب میں تجسس، تشکیک اور خوف کی جو فضا قائم کی ہے۔ قاری اس سے ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

ایک اور پیرا گراف ملاحظہ ہو:

"وہ زندگی میں پہلی بار شدید بے بسی کے احساس سے دوچار تھے۔ جو باپ اپنی اولاد کو تحفظ فراہم نہ کر سکتا ہو اسے اولاد پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے۔۔۔ انہی خیالات میں الجھے ہوئے انہیں پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب اپنی گلی میں مڑ گئے۔ وہ تو اس وقت چونکے جب کئی مکانوں کے دروازوں سے پکار پڑی۔" یہاں آجایئے۔۔ یہاں آجایئے۔۔۔"(۳۲)

مبین مرزا نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں سماج کی بے حسی اور سفاکی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کے قلم سے نکلے ایک ایک لفظ میں گہرا کرب پوشیدہ ہے۔ یہ اس حبس زدہ ماحول کی پیداوار ہے جہاں ایک ایک جان نہایت سستی ہے۔ جہاں جینے کے لیے انسان نہ جانے کتنے جتن کرتا ہے۔ مگر مرنے کے لیے محض ایک پستول کی گولی یا ایک دھماکہ جو کہ ایک پل میں کتنی جانیں بے دردی سے لے لیتا ہے، تو ذرا سوچیے ایک حساس ادیب یا مصنف اس سانحے کو بیان کرنے کے لیے کیا دلیل پیش کرے گا۔ اس کا اسلوب ہی ان دردناک مناظر کی عکاسی کر سکتا ہے۔

"خواہ مخواہ میں۔۔۔ اسے خواہ مخواہ کہتے ہیں۔"(۳۳)

"میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور جو بتایا ہے وہ درست نہیں۔ وہ تیزی سے بولی، اور جو آج بتاؤ گی کیا ہوا۔۔۔۔ خالد تلخی سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔"(۳۴)

ان افسانوں میں سادگی کا عنصر سب سے نمایاں ہے۔ افسانہ نگار نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو موضوع بنایا ہے اور ان کا انداز اس قدر مہلک اور جاندار ہے کہ قاری افسانے کی ابتداء سے انتہا تک انہماک سے کہانی پڑھتا ہے۔

"خالد نے اس بات پر بے چینی سے پہلو بدلا اس کے چہرت پر اضطراب تھا۔ آئی ایم سوری۔ میں جانتی ہوں یہ سننا، جاننا، ماننا سب تکلیف دہ ہے۔ بہت اذیت ناک، لیکن میں جانے سے پہلے تم سے ایک بات یہ ضرور شیئر کرنا چاہتی تھی، اصل میں تم جیسے لوگ سوسائٹی کے سسٹم میں موجود زہریلے مادوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور اسے زندہ رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔"(۳۵)

ان افسانوں میں تشبیہات اور ستعاروں کا بھی خوبصورت استعمال ہوا ہے تشبیہ۔ اور استعارہ داخلی اور اندرونی زندگی کی ترجمانی کرے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تشبیہات اور استعاراتی طرز بیان میں مبین مرزا کی قوت مشاہدہ اور وسیع تجربے کا آئینہ دار ہے۔ بیانیہ اسلوب فکر کی جولانی عطا کرتا ہے یہ خوب صورت الفاظ ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔ جملوں کے الفاظ نہایت پر معنی ہیں جو کہ افسانوں کے اسلوب کو مزید دلکش بنادیتے ہیں۔

"تو بھائیو! میں آج آپ کو جس پری پیکر کی داستان سنا رہا ہوں، وہ پرستان میں نہیں، اسی ہماری تمھاری دنیا میں رہتی تھی۔ وہ بنت آدم تھی، گوشت پوست کی بنی ہوئی۔ ہمارے پہلے کے داستاں طراز اور فسانہ ساز ایسی زہرہ جمال شخصیت کو طوائف زادی بتاتے آئے ہیں۔ خدا جانے یہ بیان کسی واقعی تحقیق پر مبنی ہوتا یا پھر کسی بغض کی وجہ سے ان حسینان عالم پر ایسے رقیق چھینٹے اڑائے جاتے تھے۔ یہ زمانہ اچھا ہے کہ اب کسی کو کسی کے حسب نسب سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ آج تو روشن خیالی کی ایسی مثال ہے کہ اب تو اصل طوائف زادی کو بھی کوئی طوائف زادی جانتا ہے نہ گردانتا ہے۔ اگر کوئی جان بھی پائے تو ایسی باتوں کو توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔ آپ ذرا یاد کیجیے کہ اس باب میں لوگ باگ شاہان مغلیہ اور شاہان اودھ کو کیا کیا نہیں کہتے آئے۔ اللہ غنی۔"(۳۶)

ان کے ہاں تشبیہات واستعارات کا امتزاج جب پیکر تراشی میں ہوتا ہے تو کہانی میں عجیب سی رومانوی فضا شامل ہو جاتی ہے۔

"سواب میرے سننے والو! ذرا دل تھام کے بیٹھو کہ میں اک قتالہ عالم کے رخ ماہتاب سے نقاب الٹتا ہوں۔اُس دل ربا کی آنکھیں تھیں کہ جن سے گنگناتی ہوئی جھیلیں بھی شرمائیں۔رُخسار ایسے کہ جن کی شادابی میں سیب، انار اور شہد کا آمیزہ برتا گیا ہو۔ہونٹوں کی تراش ہیرے کی انی سے اور ان کے رس میں ہی بنت عنب شامل ہو۔اُس کا کلیان کلی تھا۔"(۳۷)

ان افسانوں میں منظر نگاری کی خارجیت کا عنصر بھی قابل ستائش ہے۔خوبصورت مناظر کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔منظر نگاری میں افسانہ نگار کی بصیرت اور بصارت دونوں ہی شامل ہیں۔منظر نگاری کے عمل میں چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی ملتی ہیں۔کوئی بھی منظر یا واقعہ ماحول کا پورا پورا نقشہ بیان کرتا ہے۔

"اس وقت کتاب گود میں دھری تھی اور وہ ٹیک لگائے صوفے پر نیم دراز تھے لیکن اندر دے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خلا میں معلق ہوں۔زمین پاؤں تلے سے غائب ہو چکی تھی۔بس سر پی پر ایک آسمان تنا ہوا تھا۔۔خوف کا آسمان۔۔۔جس نے نیچے ان کا دم گھٹ رہا تھا۔انہوں نے کئی بار خود کو سنبھالنے، دلاسا دینے کی کوشش کی تھی لیکن ہر بار اس کوشش کے بعد ان کے خوف اور ہیجان میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔انہوں نے گردن گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔شام کا سرمئی جھٹپٹارات کی تاریکی میں تبدیل ہو گیا۔"(۳۸)

"مدھم نیلگوں روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی مشرقی دیوار پر آویزاں واٹر کلر کا لینڈ اسکیپ اس وقت کسی دیومالائی سرزمین کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔اس کے سرسبز منظر اور عمودی رخ کے حاشیے پر اودے پیلے اوور قرمزی پھولوں کی کیاری سب کے سب نائٹ بلبل کے بلیو فلٹر کے باعث زندگی سے عاری اور غیر حقیقی معلوم ہو رہے تھے۔"(۳۹)

ان افسانوں میں افسانہ نگار نے انگریزی الفاظ اور جملوں کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

" نہیں میں تو راستے میں گھر میں ڈراپ ہو جاؤں گی۔یہ دونوں ڈنر پر جا رہے ہیں "

That's very good! یہ ہوئی نا بات! ڈاکٹر منصور نے خوشی کا اظہار کیا۔

تمہیں اسی طرح پیسے یا۔۔۔یا شاید اس سے کچھ زیادہ یوں ہی سراج کا خیال رکھنا ہے۔وہ

لوٹ آئے گا تمہارے پاس۔ مجھے امید ہے کہ آج کے بعد اس مہم میں تمہیں کوئی Disappointment نہیں ہوگا۔"(۴۰)

نوسائرہ! نوڈارلنگ۔Not like this یہ سب نہیں چلے گا۔"(۴۱)

انگریزی زبان کے الفاظ کا بے دریغ استعمال بھی ان کے افسانوں کی اظہاریت میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتا۔ جس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ دور حاضر میں انگریزی زبان کا ہر جانب غلبہ ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ شامل ہیں جن کی وجہ سے ہمیں ان افسانوں کی فضا نامانوس محسوس نہیں ہوتی۔

۹/۱۱ کے تناظر میں لکھے گئے طاہرہ اقبال کے افسانے فکر و فن کے حوالے سے کافی منفرد ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک اعتماد اور بے خوفی کا عنصر ملتا ہے۔ مصنفہ نے جو دیکھا محسوس کیا اسے بلا جھجھک افسانوں کی صورت میں ڈھال دیا ان کی کہانیوں میں مڈل کلاس طبقے کی زندگی اور اس کو درپیش مسائل کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ ان کے دہشت گردی پر لکھے گئے افسانے بیانیہ ہیں اور بعض جگہ نفسیاتی صورت حال اختیار کر لیتے ہیں۔ کرداروں کی نفسیات کو مصنفہ نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے ان کے ہاں لفظیات کا بہترین چناؤ ملتا ہے تاریخی واقعات کو افسانہ نگار نے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا سلوب سادگی کی وجہ سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے ان کے افسانوں میں کہانی پن زیادہ ہے مختلف طبقات کی خرابیوں آرائشوں کو انہوں نے بہترین علامتوں کے ذریعے قاری پر آشکار کیا ہے مثلا:

"وہ خدا کی غیرت کو اکساتی رہیں اور عمیر کی بارات ٹھاٹ سے ان کی چھوٹی بہن کی بیٹی کو بیاہ کر لے گئی۔ تبھی بے شمار خطوں اور لاکھوں ہاتھوں سے دعائیں چھلنی بھرے پانی کی طرح پھیل گئیں اور خدا کی بستی میں داڑھیوں، عماموں والے روزہ داروں جسموں کو کتے اور اگدھ نوچتے رہے کہ خدا نما نے ان کے مقدر کا فیصلہ ایسے ہی دیا تھا۔"(۴۲)

ان افسانوں کے موضوع، ہیت اور اظہار میں ہم آہنگی موجود ہے۔ بعض جگہ افسانے میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ڈرامے میں مختلف سین ہوتے ہیں۔ کبھی وہ ڈرامہ المیہ بن کر بھیانک انجام کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں بہت سے سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ مثلا "سیلپنگ بیوٹی" اور "واکنگ ٹریک۔۔ دو کلو میٹر" کا انجام ٹریجڈی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً واکنگ ٹریک۔۔۔ دو کلو میٹر کا اختتام خود ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے جو کہ افسانے کی فضا کو مزید پراسرار بنا دیتا ہے۔

"حادثہ نہیں قیامت۔ قیامت شاید ایسے ہی حادثات کا نام ہے۔ جس پر بیت گئی اس کے لیے گزر گئی جس پر مؤخر ہو گئی پھر اس کا آنا ٹھہر گیا اور مجھ پر بیت چکی ہے۔ جب زمین تانبا رنگ ہو گئی۔ مٹی بنجر اور بالا آور درخت بانجھ، جس کی کڑک خوفناک تھی۔ لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی مانند اڑ رہے تھے جب سورک لپیٹ دیا گیا اور زمین نے شدت کے ساتھ اپنے بوجھ کو باہر نکال پھینکا۔ یہ سب درست لیکن الہامی کتاب میں کیوں نہیں لکھا کی حشر دیہاڑے انسانی اعضا گوشت اور ہڈیاں فضا میں تحلیل ہو کر روئی کے گالوں کی مانند اڑے پھریں گے اور اشرف المخلوقات کی پہچان اور شناخت ختم کر کے اسے بارود کا چارہ بنا دیا جائے گا کیوں آخر کیوں؟۔"(۴۳)

ان افسانوں میں جزئیات نگاری کی مثالیں بھی کئی جگہوں پر ملتی ہیں۔ جزئیات نگاری سے مراد لفظوں کی مدد سے کسی منظر یا چیز کے چھوٹے چھوٹے اجزاء کو اس طرح مفصل انداز میں بیان کرنا کہ اس منظر یا چیز کی ہو بہو اور جیتی جاگتی تصویر پڑھنے والے کے ذہن اور آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہی جزئیات نگاری کا فن ہے کہ جس منظر یا چیز کا ذکر کیا جائے اس کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ اس سے متعلق ہر منظر بالکل مجسم ہو کر منظر عام پر آئے۔ جزئیات نگاری کے لیے کسی افسانہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہو اور اس کی واردات تر متخیلہ بہت زیادہ قوی ہو جس سے وہ ہر منظر کی تصویر کشی دلکش انداز میں کر سکے اور سارے کا سارا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔

"اگر ان سب کاست، نچوڑ کر ایک نمونہ تشکیل دیا جائے تو پھر "وہ" بنتا ہے۔ سرما کی چمکیلی دھوپ کی حدت جیسا ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا۔ ٹریک کے مشرق و مغرب۔ شمال و جنوب ہر سمت اور ہر موڑ پر موجود۔ اللہ جانے وہ چھلاوا تھا کہ اس کی مسکراہٹ آوارہ، پھولوں کی کیاریوں میں سے جھانکتی تو کبھی سفیدے کی بلند و بالا شاخوں میں الجھتی، کبھی ٹریک کی سرمئی کیری میں شمار ہی ہوتی تو کبھی سَرو کی باڑوں میں کسمساتی کسی چاند کی طرح کسی سورج کی طرح یا تاروں کی طرح یکساں اور ہمہ گیر۔"(۴۴)

ان افسانوں میں حقیقت نگاری کا اسلوب کہیں کہیں بہت زیادہ غالب آجاتا ہے کیوں کہ ان کو آج کی دنیا کے خمیر سے گوندھا گیا ہے تلخ سے تلخ موضوع کو بعض جگہ تحریری اور شعری انداز بیان میں پیش کیا جاتا ہے ۔تاکہ اس میں رعنائی اور خوب صورتی برقرار رہے۔ افسانہ نگار نے جدید زبان کا استعمال زیادہ کیا ہے جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کا امتزاج ملتا ہے۔ دہشت گردی جیسے گنجلک مسئلے کی جس طرح نفسیاتی

تصویر کشی کی گئی ہے وہ قابل تحسین ہے اس کے لیے افسانہ نگار شاعرانہ وسائل کا استعمال کرتی ہیں جس سے افسانے کی فضا میں مزید رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں کی طرح طاہرہ اقبال نے ان افسانوں میں انگریزی زبان کا کافی استعمال کیا ہے بلکہ بعض جگہ تو کرداروں کے درمیان مکالمے میں انگریزی زبان کا بے تحاشہ استعمال نظر آتا ہے۔

"تم جیسے Brillant سٹوڈنٹ جو فسٹ آتے ہیں۔ پوزیشنیں لیتے ہیں، ہر ہر ایکٹوٹی میں I was proud of you".''But now.... Why you do this'' اسپیشلی یو انیق یو۔"(۴۵)

Stupid ! Huamn is also a carnivores''

Carnivores وہ Animals ہوتے ہیں جو Meat کھاتے ہیں جیسے یہ اس Horror سیریل میں دکھایا گیا ہے۔"(۴۶)

دہشت گردی اور ۹/۱۱ جیسے موضوعات کے باوجود بھی ان افسانوں میں اسلوب میں جاذبیت ملتی ہے اور مختلف تکنیکوں کا استعمال تحریر کو زیادہ مؤثر بنا دیتا ہے افسانوں کے پلاٹ بھی کرداروں کی طرح متحرک ہیں۔ جس سے جدید افسانے میں ایک تنوع اور کہانی کو اعلی جہت اور جمالیت حاصل رہتی ہے ان افسانوں میں تمام فکری و فنی جواہر موجود نہیں۔ جس میں موضوع، کردار، اسلوب، پلاٹ وغیرہ سب شامل ہیں اور حقیقت کے رنگوں کے ساتھ ساتھ علامت، تمثیل نگاری اور ڈرامائیت جیسے تمام عناصر ملتے ہیں۔ یہ افسانے حقیقت اور تخیل کا بہترین ارتباط پیش کرتے ہیں۔

دہشت گردی اور خاص کر نائن الیون کے موضوع پر افسانے لکھنے میں محمد حمید شاہد کا نام سر فہرست ہے انہوں نے اس سنگین موضوع پر تشدد ظلم و بربریت اور خوف و دہشت پر کئی افسانے لکھے ہیں ان افسانوں میں "کتاب الاموات سے میزان عدل کا باب" "کوئٹہ میں کچلاک"، "آدمی کا بکھراؤ"، "موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ"، "سورگ میں سئور"، اور "خونی لام ہوا قتلام بچوں کا"، قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام افسانے دہشت میں لپٹے ہوئے ہیں۔ بعض افسانوں میں علامتوں کے ذریعے کہانی کے رخ کو موڑ دیا گیا ہے۔ "سورگ میں سئور" میں سؤروں کی آمد"، کتوں کی بہتات، "بکریوں کی اموات" اور "مونگ پھلی کی کاشت"، جیسی علامتیں کہانی میں ایک انوکھا موڑ لاتی ہیں۔ اس کہانی کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی علامت ہے۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے علامتی پیرائے میں عالمی استعمار کے گھناؤنے کرتوتوں اور ان کے مکروہ چہروں کو قاری کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔

" اور اب یہ ہو چکا ہے کہ کتے بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔۔۔بہت زیادہ اور بہت قوی۔۔۔اتنے زیادہ کہ ہمارے حصے کا رزق کھا جاتے ہیں۔۔۔اور اتنے قوی کہ ان کی زنجیریں ہماری ہتھیلیوں کو چھیل کر ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ یہ کتے ہمارے کھیت اجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں۔۔۔عادی خوفزدہ یا پھر ان جیسے۔۔۔ ممکن ہے ان پلیدوں کے بار بار بدن تان کر کھڑا ہو جانے کے سبب کوئی وہم ان کے دلوں میں سما گیا ہو۔ معاملہ کچھ بھی ہو صورت احول یہ ہے کہ تھو تھنیوں والوں کو غزاہٹوں ک اوٹ میسر آ گئی ہے۔کتے دور کھڑے فقط غرائے جاتے ہیں۔ غم سے زخمی ہتھیلیوں میں بلم، مرچھیاں۔اور کلہاٹیاں تھامی ہی نہیں جا رہیں۔ لہذا ہم خوف اور اندیشوں سے کانپے جاتے ہیں۔۔۔اور کچھ یوں دکھنے لگا ہے کہ جیسے اس بلتھو تھنیوں والے انہی کتوں کی غراہٹوں کی محافظپ میں ہمارے سارے کھیت کھود کر ہی پلٹیں گے۔"(۴۷)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے علامتوں کے ذریعے اپنے اسلوب میں اس گھٹن زدہ سماج کے خلاف ایک بھڑاس سی نکالی ہے۔ یہ تمام علامات ایک پورے نظام اور معاشرے کی عکاسی ہیں۔

اسی طرح "برف کا گھونسلا" میں محمد حمید شاہد نے علامتوں کے ذریعے پاکستان پر امریکہ کی طرف سے نظریں پھیرنے والا واقعہ بیان کیا ہے۔ "چڑیا" ایک مظلوم ملک" کی علامت بنا کر پیش کی گئی ہ جو اپنے سے طاقتور ملک سے امدادیں لے کر زندہ ہے اور وہ طاقت ور ملک اگر اس کی مدد سے ہاتھ اٹھالے تو اس کا انجام بھی اس چڑیا کا سا ہو گا جو اپنے بچوں سمیت مری کی یخ بستہ راتوں میں جان کی بازی ہار گئی۔ افسانہ نگار نے دہشت گردی سے متعلق ان تمام افسانوں میں زبان و بیان کے بے شمار تجربات کیے ہیں جو ان کو اپنے مخصوص طرز بیان کی وجہ سے دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیانیہ ہے جس میں موضوع کی پیچیدگی ہونے کے باوجود قصے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ان کے ہاں کہانی کے اندر کہانی کی سی فضا ملتی ہے۔ انہوں نے اگرچہ روایت سے انحراف بھی کیا مگر ان کو لکھنے کا فن آتا ہے جس سے افسانوں میں وحدت تاثر قائم رہتی ہے۔ ان افسانوں کے اسلوب اور موضوعات دونوں میں ہی تنوع اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے "برف کا گھونسلا" میں حقیقت نگاری کا اسلوب اپنایا ہے۔ یہ افسانہ تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔ چڑیا اور اس کے بچوں پر

گزرنے والی کیفیت یہاں رہنے والے کئی خاندانوں پر آئے روز گزرتی ہے۔ یہ ایک نیااور دردناک موضوع ہے کہانی کاانجام قاری کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

"۔۔۔اور جب میں برف کھرچ چکا تو مجھے لگا، مری نے دو شالہ نہیں سفید کفن لپیٹ رکھا تھا۔اسی کفن میں چڑیا کے پر کھلے ہوئے تھے اور دو ننھے منے بچے اس کے پروں تلے دبے کب کے اپنی ماں کی طرح زندگی کی سانسیں ہار چکے تھے۔"(۴۸)

اس کے علاوہ دیگر افسانوں میں کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس میں نئی وسعتیں اور جدید امکانات کے در وا ہونے لگتے ہیں۔ علامتی تہہ داری کہانی کو پیچیدہ بنا کر قاری کی توجہ مبذول کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔اس افسانوں کے اسلوب میں جو روانی ہے وہ قابل غور ہے۔

" ریل کے رکتے ہی دہشت کا منہ زور ریلا امنڈ پڑا جو لبین کے کنارے دور تک پھیل گیا تھا اوپر کہیں شدید بارشیں ہوئی تھیں۔ یہاں بھی مینہ کم نہ برسا تھا اور ابھی تک پھوار سی پڑ رہی تھی، مگر اوپر کی بارشوں نے نالے کو دریا بنا دیا تھا۔ حوصلے تو پہلے کے ٹوٹے ہوئے تھے، آگے کا پل ٹوٹ گیا تھا اور بلوائی کسی بھی وقت ان تک پہنچ سکتے تھے۔ لبین کا بپھرا ہوا پانی سامنے تھا بلوائی نہیں پہنچے تھے مگر ان کی دہشت پہنچ گئی تھی۔ سوکتی ہوئی اور خوفیائی ہوئی دہشت۔"(۴۹)

ان افسانوں میں اساطیر، مذہبی حکایات، مظاہر فطرت اور گہرے انسانی تجربات اور بصیرت کی عکاسی ہوتی ہے ہر افسانے میں ماحول اور موضوع کے بدلاؤ سے زبان بھی بدل جاتی ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ جملے کی ساخت اور بناوٹ بھی ترتیب پاتی ہے۔ ان افسانوں میں اصطلاحات، محاورات اور مخصوص لفظوں کے ذریعے اسلوب کو آفاقیت عطا کی گئی ہے۔

"اور پھر رذیل کے خٹے سیلانے میں لگ جاتے ہیں جو سب کی باریاں باندھ رہا ہے ہمیں سب سے پہلے اپنا آپ کا نعرہ دے کر وہ جو سمجھانا چاہتے ہیں اگر وہ میں سمجھ بھی جاؤں تو بھی بھوک میں مرتے انسانوں کے خون کی باڑھ مجھے اپنی جانب آتی صاف نظر آتی ہے اور اس آگ کی باڑھ بھی جو بغداد کی ایک قدیم لائبریری میں اٹھی اور اب سارے سچے لفظوں کو ملانے کے لیے چاروں طرف بڑھ رہی ہے۔"(۵۰)

"سورگ میں سئور" میں عالمی استعمار کو بیان کرنے کے لیے "دیہتی" استعارے کا استعمال کیا گیا ہے۔ تمثیلی پیرائے میں لکھا گیا یہ افسانہ زیریں سطح پر ثقافتی تاریخ کا بیانیہ ہے۔اس میں ایک ہنگامی واقعیت پنہاں ہے۔

"شروع شروع میں اپنے ایمانوں کو بچانے کے لیے ہم اس پلید نسل کا نام بھی زبان پر نہ لاتے تھے۔ انہیں مارنے کو جی بھی نہ چاہتا تھا کہ انہیں دیکھتے ہی کراہت ہونے لگتی تھی مگر جب بہت زیادہ نقصان کرنے لگے تو ہم نے بندوقیں اٹھالی خوب منصوبہ بندی کر کے ان کا شکار کرتے۔۔۔ اور پھر جب سرکار نے کسی سرکاری مصلحت کے تحت اسلحہ رکھنے پر پابندی لگادی تو ہمیں شکاری کتوں کی تعداد بڑھادینا پڑی۔ "(۵۱)

ان افسانوں میں تاثر، تجسس اور تفکر کا باہمی امتزاج ان کو جدت و انفرادیت عطا کرتا ہے۔ ان میں استعمال ہونے والے رموز علائم زیادہ تر داستانی قصوں، مذہبی کہانیوں اور مہندی اساطیر سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار نے دور حاضر کے تلخ حقائق کو تجسس و حیرانی کی نئی فضاؤں میں پیش کرنے جو التزام کیا ہے وہ ایک نیا تجربہ ہے۔ ان دیہی زندگی سے ایک خاص قسم کا شغف ملتا ہے فطرت نگاری کے حسین امتزاج کی فضا میں ایک خاص قسم کی رعنائی ہوتی ہے۔ مناظر فطرت اور ساتھ میں کئی جگہ پر سٹل ئیلسٹک طرز ادا جو کئی بار بیانیہ انداز بیان میں بدل جاتا ہے۔ ان افسانوں کو ہی بنا دیتا ہے۔ روایتی اسلوب کی بھی کہیں کہیں جھلک نظر آتی ہے جس میں علامتی و تمثیلی عناصر ایک الگ شناخت قائم کرتے ہیں ان افسانوں میں کثرت میں وحدت تاثر کا ایک رروحانی احساس پیدا ہو کر قاری کے لیے سوچ اور فکر کے نئے جہاں آباد کر دیتا ہے۔

ان افسانوں کی وجہ شہرت یہ ہے کہ افسانہ نگار نے کسی ایک ڈکشن پر اکتفا نہیں کیا اور اسلوب کو بہتر سے بہتر دکھا کر صاحب اسلوب بننے کی کوشش نہیں بلکہ جو افسانہ موضوع کے مناسبت سے جس طرح تحریر کرنے کی ضرورت محسوس کی اسی طرح کا اسلوب اپنا لیا۔ اور اس میں تھوڑی بہت رد وبدل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ ان افسانوں میں خارجی حقیقت نگاری، افسانہ نگاری کی باطنی صداقت پسندی کے ساتھ مل کر باہم شیر و شکر ہو گئی ہیں۔ محمد حمید شاہد نے زندگی کے تمام پہلو خواہ وہ زندگی کی کوئی ٹریجڈی ہو یا کوئی معاشرتی یا سیاسی حالات و واقعات کا بیان، پیار محبت کے حسن اور کومل احساسات و جذبات ہوں یا تند و تلخ حقیقتیں، ریاستی ظلم و بربریت ہو یا غلامی دہشت گردی کے واقعات بیک وقت سب پر اپنا قلم اٹھایا۔ انہوں نے بیانیے کو لامتناہی قالبوں میں ڈھال کو صفحہ قرطاس پر رنگ بھر دیئے ہیں اور انسانی آہنگ کے مطابق ڈھالتے گئے۔ ہیں ان افسانوں میں "نو حقیقت پسندی" زندگی کی دراصل نہ صرف غیر مشروط بلکہ مکمل نگاہ ڈالنے کے مترادف ہے جو کہ ان افسانوں کو ایک توازن بخشتی ہے۔

ب۔اردو افسانے کی تکنیک پر دہشت گردی کے اثرات

تکنیک ایک یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی "فن" یا "طریق کار" ہیں۔ادب میں "تکنیک" کا لفظ "قدرت بیان" یا "طرزِ تحریر" کے معانی میں لیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ ایڈوانس ڈکشنری میں تکنیک کی تعریف اس طرح ملتی ہے۔

"Method of doing or performing something Especially in th art or science."(52)

فن اور تکنیک کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ فن کے بطن سے ہی تکنیک نے جنم لیا ہے۔ محمد احسن فاروقی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"یہ امر ہمیشہ سے مسلم ہے کہ فن کے لیے تکنیک ضروری ہے۔ لیکن اگر وہ فن میں چھپ نہ سکے تو فن بناوٹی ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔"(53)

گویا فن اور تکنیک کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کوئی ایسا خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔ جس پر دو اصطلاحوں کی جامع اور مکمل تعریف سامنے آ سکے کیونکہ فن اور تکنیک ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں جیسا کہ قوسِ قزح کے سات رنگ۔ گویا ادب میں تکنیک کا مسئلہ جتنا اہم ہے اتنا ہی پیچیدہ بھی ہے۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر فن پارے کی اپنی تکنیک ہوتی ہے۔ جہاں تک افسانے کی تکنیک کا تعلق ہے اس کے بارے میں عبدالمغنی کی رائے ملاحظہ ہو:

"افسانے کے عناصر ترکیبی تین ہیں پلاٹ: موضوع، اسلوب اور افسانے کی تکنیک اگر کچھ ہے تو وہ ان ہی تینوں اور ان کی مجموعی ترتیب سے عبارت ہے۔"(54)

افسانہ نگاری کے فنی عناصر میں تیکنیک کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ناقدین کی نظر میں تیکنیک ایسا طرز عمل ہے جس کے ذریعے کوئی فن کار اپنے موضوع کی پیش کش کرتا ہے۔ یہ طریقہ کار خیال کو وجود دینے میں مددگار ہوتا ہے۔ ایک تخلیق کار کا ملکہ یہی ہے کہ وہ قصے یا کہانی کو فنی ترتیب دیتے ہوئے جس زاویے سے تحریر کرتا ہے اسے تیکنیک کہتے ہیں۔ ایک ادیب کے پاس مختلف نوع کے موضوعات ہوتے ہیں۔ جو کہ ہمارے سماج کے عکاس ہوتے ہیں اور مواد سے موافقت اور مطابقت رکھتے ہوئے صحیح تیکنیک کا استعمال ہی افسانے میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔ جو کہ قارئین کے لیے پر کشش ہو جاتا ہے۔ اردو ادب میں افسانوں میں زیادہ تر بیانیہ تیکنیک کا استعمال نظر آتا ہے۔ جس میں واحد متکلم کہانی بیان کرتا ہے۔

۹/۱۱ کے نتیجے میں پوری دنیا میں سوچ کا انداز بدل گیا اور ایک خاص قسم کی سماجی و سیاسی ٹوٹ پھوٹ نے اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ یہ اثرات لاشعوری طور پر افسانے میں در آئے۔ مگر ایک ایسے موضوع کو بیان کرنا جس میں سنگین حالات اور ان کے نتائج واثرات کا بھی ایک حد تک علم ہو اور حقیقت کو کہانی کی صورت میں بیان کرنا ہی دراصل فن ہے۔ علاوہ ازیں جدید تیکنیکوں کے استعمال سے کہانی بھی نئی بن جاتی ہے۔ بعض اوقات نئی تیکنیک کہانی کے ڈھانچے کو جدید نہیں بنا سکتی۔ جبکہ خالص بیانیہ انداز میں لکھی ہوئی جدید ڈھب اختیار کر لیتی ہے۔ نئے افسانے میں ہیت اور تیکنیک بہت اہم ہیں۔ دہشت گردی جیسے حقیقی اور تلخ موضوع پر لکھتے ہوئے افسانہ نگاروں کے ہاں الجھن کا شکار اور شدید رویہ نظر آتا ہے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے لیے نئے تجربات اور اسالیب کے ساتھ ساتھ جدید تیکنیک کی بھی ضرورت پیش آئی۔ اس افسانے میں استعارے اور علامت نے بھی خاص جگہ بنائے رکھی۔ بعض افسانہ نگاروں کے ہاں اس تکلیف دہ موضوع کو بیان کرتے وقت شعوری و لاشعوری ہر سطح پر ایک کرب، خوف، ذہنی انتشار اور غم و غصے کی فضا قائم رہتی ہے۔ اس دور کے افسانے میں خارجی اثرات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ بعض افسانوں میں احساس معاشرت، لادینیت اور ذہنی انتشار کی کیفیت ملتی ہے۔ دہشت گردی کا موضوع ایک پیچیدہ موضوع ہے۔ مگر جدید افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو جدید فنی و تیکنیکی اسالیب کا استعمال کر کے بہت خوبصورتی سے بیان کیا۔ ابتداء میں افسانوں کی کہانیوں میں اکہرا پن زیادہ رائج تھا۔ مگر آج کے دور میں لکھنے والے اپنی کہانی کو زندگی کے تمام رنگوں میں سمیٹ کر اور خارج و باطن کے امتزاج سے بیان کرتے ہیں۔ جس سے افسانے کا ظاہری و باطنی کردار عیاں ہوتا ہے۔ "شعور کی رو" کی تیکنیک کو بعض افسانہ نگاروں نے بڑی خوب صورتی سے اپنایا ہے۔

> "مختصر افسانے میں فنی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا ذمہ دار نیا انسان ہی تھا۔ "شعور کی رو" کی تیکنیک جو جدید افسانے میں ملتی ہے اسے فنکاروں نے کسی وضع کردہ فارمولے کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ بلکہ یہ تیکنیک اس نئے انسان کی باطنی دنیا کی شناخت اور اس کا اظہار ہے جس میں مسلسل اتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔"(۵۵)

دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں اسلوب اور تیکنیک کے بے شمار تجربات کیے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں کہیں واحد غائب اور کہیں واحد متکلم کی تیکنیکیں استعمال کی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر استعاراتی تیکنیک اور بعض میں تمثیلی تیکنیک سے ان افسانوں میں اثر انگیزی پیدا کی گئی ہے جو کی عہد حاضر کا جدید رجحان ہے۔

ایک کامیاب فن کار بآسانی ہر طرح کے موضوع سے ایک بہترین افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔اس کی سمجھداری اور چابکدستی ایک معمار کی طرح اس سے عالی شان افسانے کی عمارت کھڑی کرا سکتی ہے۔اس کے لیے یہ بات قطعاً مشکل نہیں ہوتی کہ موضوع کتنا پیچیدہ ہے۔وہ اپنی ذہانت سے ایک نازک اور چھوٹے موضوع سے بھی ایک بہترین افسانہ تخلیق کر لیتا ہے۔کسی بھی تیکنیک کے بارے میں حتمی رائے دینا ممکن نہیں کہ کون سی تیکنیک دوسری تیکنیک سے بہتر ہے۔ مگر بعض جگہ اسی مواد کو مختلف اور الگ الگ تیکنیک کی ضرورت ہوتی ہے۔زندگی میں پایا جانے والا تنوع ہی دراصل جدید افسانے میں تنوع کا باعث ہے۔ دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گے افسانوں میں اسلوب کی طرح تکنیک کے بھی تجربات کیے گے۔ ہر افسانے کی تیکنیک دوسرے افسانے سے کچھ نہ کچھ ضرور مختلف ہوتی ہے۔آج کے افسانے میں علامتوں کا شعوری استعمال زیادہ ہے۔یہ افسانے معاشرتی چیرہ دستیوں کی داستان بیان کرتے ہیں ۔ان افسانوں میں علائم ورموز کے ساتھ ساتھ جدید تکنیکیں استعمال کی گئی ہیں ۔رشید امجد کے افسانوں کی تیکنیک ،اختصار کے باوجود سادہ الفاظ میں پنہاں جہان معنی اور جملوں کی معروضی و فکری ساخت ان کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ان کے ہاں ابلاغ کا مسئلہ جنم نہیں لیتا۔ "اختصار" جو کہ افسانے کا سب سے اہم نکتہ ہے،رشید امجد کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ان کی کہانی میں بیانیہ کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کے افسانے میں معنی کے کئی جہان آباد ہیں اور قاری ان کے افسانے کی گہرائی میں ڈوب کر کہیں بھی اکتاتا نہیں۔ مثلاً:

"ایک پرانی کہانی جسے دوبارہ لکھا گیا" میں تبصراتی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

> "سیاح نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنے آپ سے کہا۔۔۔"یہ سارے اندھے ہیں"۔۔۔ پھر اس نے گھوڑے کی طرف دیکھا،رات آسمان کے طشت کنارے سے سر نکال رہی تھی۔"چند گھنٹوں بعد" اس نے سوچا۔۔۔جب اس گھوڑے کا پیٹ چاک ہو گا اور سورمالکارتے ہوئے اتریں گے تو شہر کا کیا حال ہو گا؟۔"(۵۶)

اس میں ایک سیاح تاریخ کے جھروکوں سے مختلف واقعات چن کر ایسے تبصرے کر رہا ہے کہ جس سے تاریخ کی پوری شدت واضح ہو جاتی ہے۔

> "یا غیب کے اسرار جاننے والے ، کیا آنکھیں رکھنے کا دعوی کرنے والے بھی ایسے ندھے ہوتے ہیں "سیاح کا جی چاہا کہ اپنا سر نوچ لے۔ فصیل کے دروازے بند ہو چکے تھے اور گہری اندھیری رات آسمان کے طشت پر چاروں طرف پھیل چکی تھی اور اندھیرے میں گردن گردن ڈوب رہے تھے، شہر

کے بیچ بیچ گھوڑا، کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا، اپنا ہی بنایا ہوا گھوڑا کسی کو کیوں دکھائی دیتا۔ سیاح نے ایک لمحے کے لیے اسے اور پھر چاروں طرف پھیلتی سیاہی کو دیکھا، "چند لمحوں بعد۔" اُس نے سوچا، خراٹے لیتا شہر، خوابوں میں مگن لوگ۔ سیاح کو خیال آیا۔ "خواب ٹوٹنے کا المیہ ہوتا ہے"(۵۷)

"پژمردہ کا تبسم" میں دیگر تصانیف کی نسبت فلیش بیک کی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

"برسوں پہلے قندھار کے تالاب میں، جوان کے گھر میں پائیں باغ میں گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا، وہ اسی طرح بجلی بنی تالاب میں اتر رہی تھی کہ وہ کہیں سے سامنے آگیا۔ فرغانہ چیخ مار کر تالاب میں کود پڑی تھی۔ کنارے بیٹھ گیا۔

شہنشاہ کے آتے ہی کنیزیں ہٹ گئیں۔ شہنشاہ نے اپنا ہاتھ تالاب میں ڈال کر اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ مسکراتے ہوئے دور ہٹ گئی۔ کھردرے ٹھنڈے فرش پر قلعہ کی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھے ہوئے وہ نہ جان سکا کہ اس مسکراہٹ میں بے بسی تھی یا اطمینان۔ رات گئے جب وہ لوٹا تو میزبان پریشانی کے عالم میں اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ رات عجب تذبذب میں گزری، ویران اداس سیڑھوں تک پہنچتا، جونہی پہلا قدم رکھا سیڑھوں جاگ اٹھیں۔۔۔۔ جامع مسجد اس کی تاریخ تھی جس کی للکاریاں، دور ماضی میں کہیں دم توڑ گئی تھیں اور یہ جدید شہر، جو اس کی روایات کا امین تھا، اب کتنا اجنبی ہو گیا تھا۔ اجنبی تو یہ شہر اس وقت بھی نہیں تھا جب اسی شہر میں اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔"(۵۸)

حال اور ماضی سلسلہ در سلسلہ جس طرح کہانی میں پیوست ہوتا ہے وہ کہانی کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ فلیش بیک تیکنیک کو استعمال کرنے کے لیے کسی تخلیق کار کو انتہائی سمجھداری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور اگر ذرا سی بھول چوک بھی ہو جائے تو افسانہ افسانے کے قالب سے نکل سکتا ہے۔ مگر رشید امجد نے جس زیرک رویے کو اپنایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

رشید امجد اپنے قصے کے لیے بہترین طرز عمل ڈھونڈتے ہیں اور بہترین تیکنیک کے استعمال سے انہیں افسانوں کا درجہ دیا ہے اور یہ ان کے ہنر مند ہاتھوں کا فہم و بصیرت کا کرشمہ ہے

خالدہ حسین نے "ابن آدم" میں نہایت مؤثر انداز میں موضوع کو بیانیے کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اس طرح بیانیے کا حقیقی مطلب بخوبی اجاگر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس افسانے میں کوئی اضافی تبصرہ یا جملہ موجود نہیں۔ اور کہانی بنا کسی غیر ضروری مداخلت کے چلتی رہتی ہے اور واقعات کا ربط و تسلسل مکمل ابلاغ پیش کرتا ہے۔ اور یہی خالدہ حسین کا کمال ہے کہ ان کے تمام افسانوں کے ساتھ ساتھ دہشت گردی پر لکھے گئے یہ

دونوں افسانے اپنے عہد کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ماورائے عصر خوشبو سے معطر کر رہے ہیں۔ان کے تمام افسانے ایک دائرے میں سفر کرتے ہیں۔جدید زندگی کی بے مقصدیت،لایعنیت، یاسیت اور تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ان کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ ہے اور نہ خطیبانہ جلال ہے۔نہ جذباتی انتہا پسندی کا جمال۔ باطنی اتار چڑھاؤ اور خارجی افعال کے مابین آمیزش کی پیدا کردہ المیاتی صورت حال ہی دراصل ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔ڈاکٹر قاضی عابد لکھتے ہیں:

"خالدہ حسین اسطورہ سے تعلق پیدا کر کے روحانیت کے اظہار کرنے کے بجائے خود اس واردات کے اندر اترنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جسے صوفیانہ واردات کہا جاتا ہے۔یوں بعض اوقات ان کے افسانے قاری کی جہنم سے بلند ہو جاتے ہیں۔"(۵۹)

خالدہ حسین کے ہاں بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ آزاد تلازمائی عمل اور شعور کی رو کا رجحان زیادہ ہے۔وہ باطن کو خارج سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں جس کو داخلی خارجیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ان کے افسانوں میں اساطیری جہات اور وجودی نقطۂ نظر بھی نمایاں ہے۔خالدہ حسین جدید افسانے کی تاریخ کا وہ نمایاں اور منفرد نام ہے جس کے تذکرے کے بغیر افسانے کی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہ جائے گئی۔خالدہ حسین کے افسانوں مقام و مرتبے کے حوالے سے فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"خالدہ حسین کے افسانے اردو نثر میں ایک نادر و نایاب مظہر ہیں۔ مشرق کی سر زمینوں میں شاعری کی ساحری اور پیغمبری سے نسبت زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ (۶۰)

زندگی کے بدلتے ہوئے تناظر میں شکستگی اور بے یقینی کی کیفیت نے تخلیق کاروں کی سوچ کے زاویے بدل دیئے۔سیاسی خلفشار،دہشت گردی،معاشرتی انتشار نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا۔اسی صورت حال میں فلیش بیک کی تیکنیک کو اپنا کے بعض افسانہ نگاروں نے ماضی کی طرف بار بار رجوع کیا۔ حالات جوں جوں تنزلی کی جانب رواں دواں ہوئے اور نظام زندگی میں ایک بڑا چیلنج آگیا۔یہیں اردو افسانے نے ایک جست لگائی اور عہد جدید کا ترجمان بن گیا۔خالدہ حسین کے ہاں تخلیقی پس منظر انہی نفسیاتی محرکات سے مربوط ہے۔

منشایاد کے افسانے جدید تیکنیک اور بہترین اسلوب میں ان کی مضبوط گرفت کو اجاگر کرتے ہیں۔ان کے افسانے دور حاضر کی بے معنویت کے عکاس ہیں۔ جن میں فرد کی تنہائی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ان کے

افسانوں میں عہد جدید کی تیکنیک جس طرح متعارف ہوئی ہے۔اسی سے کہانی کا گراف مسلسل بلندیوں کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ جس سے ان کی کہانی کثیر الجہت معانی و مفاہیم سے روشناس ہوتی ہے۔ان کے ہاں بات کہنے کا فن ہے۔ان کے افسانے بیانیہ تیکنیک میں لکھے گئے ہیں:

"لیکن افسوس میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا بلکہ بھول ہی گیا۔ لیکن ابا جان کی زبانی مجھے اس کے جہاد پر جانے کی تفصیل کا پتہ چلا تو بہت دکھ ہوا اور وہ تصویر میری آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گئی جب وہ الوداعی رات کو صبح تک ماں کے قدموں بیٹھا اجازت طلب کرتا رہا۔ مولوی صاحب نے تو اللہ کی رضا سمجھ کر جلدی ہی ہار مان لی تھی مگر ماں کیسے اپنے جگر گوشے کو جس کی شہادت یقینی تھی، جانے دیتی۔ اصرار اور استقامت کے درمیاں رات بھر مقابلہ جاری رہا۔ ماں روتی رہی اور بیٹا التجائیں کرتا رہا۔ آخر مجبور ہو کر ماں نے ہار مان لی اور ہچکیوں کے ساتھ اسے اللہ کے سپرد کر دیا۔"(۶۱)

منشایاد نے روزمرہ زندگی سے موضوعات منتخب کر کے اپنی مخصوص تیکنیک سے نہایت کامیابی سے بیان کر دیا ہے۔"ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" اور "پھندہ" سمیت دیگر افسانوں میں تکنیک میں وسعت اور تنوع محسوس ہوتا ہے۔

"میں نے لفافہ کھولا۔اس میں محمد امین جسے ہم مینو کے نام سے پکارتے تھے، کا تعارف اور ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ تھا۔ میں اس کی شہادت کے بارے میں سن چکا تھا اور میرے دل پر ایک بوجھ بھی تھا کہ میں اس کے والد مولوی محمد شفیع کی خواہش پوری نہ کر سکا۔ وہ چاہتے تھے میں اسے اپنے پاس رکھ لوں۔"(۶۲)

انہوں نے افسانے میں تفصیل پسندی سے کام لیا ہے اور تفصیل پسندی تیکنیکی لحاظ سے افسانے میں خوب صورتی پیدا کرتی ہے۔ کہانی پڑھ کے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم افسانہ پڑھ نہیں رہے بل کہ مصنف کھڑا ہمیں کہانی سنا رہا ہے۔"ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" کو تیکنیکی لحاظ سے ایک بہترین افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

الطاف فاطمہ کے دہشت گردی کے موضوع پر لکھنے دو افسانے "یونہی کوئی مل گیا تھا سر شام" اور "دیدوادید" میں بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ بیانیہ کا لفظ کہانی کے ہم معنی یا مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بیانیہ کا اطلاق تمام افسانوی تحریروں پر ہوتا ہے۔ بیانیہ تیکنیک کے ساتھ ساتھ مکالمہ اور عمل کا امتزاج بھی ملتا ہے ۔ دیدوادید میں مصنف نے ہارون الرشید کی زبانی اس کی کہانی بیان کر کے

Biographical تیکنیک (آپ بیتی) کا استعمال کیا ہے۔ کہانی کا کردار قصہ در قصہ کی تیکنیک کے ساتھ کہانی آگے بڑھاتا ہے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اس وقت یہاں ہوٹل فلسطین کے قریب کھڑا ہوں اور یہیں شیرٹن ہوٹل ہے۔ سارا بغداد اپ ڈاون ہو رہا ہے۔ ایسا کہ جیسے ظالم اور شوخ بچے نے کسی بے چاری گوریا کا آشیانہ نوچ کھسوٹ کر تنکا بکھیر دیا ہو۔ مگر یہ ایک آشیانے کی بات تو نہیں یہاں تو برسوں بلکہ صدیوں پرانے گھنے چھتنا درخت کی شاخوں اور ڈالیوں پر آباد بے شمار آشیانوں کو نوچ کھسوٹ کر تنکا تنکا کر کے بکھیر دیا گیا ہے۔ یہ کوئی شہر ہے کہ گورستان۔ بغداد ایک ایسا شہر ہے جس کا مقدر بار بار اجاڑ دینا قرار پایا ہے۔ حالانکہ ایک بستی بستے بستے ہی بستی ہے۔ اسے آل عباس نے کتنے ارمانوں اور چاؤ سے آباد کیا۔ دلہن کی طرح ایسا سجایا کہ تاریخ عالم میں عروس البلاد کا نام پایا۔"(۶۳)

مصنفہ نے منفرد تکنیک اختیار کرتے ہوئے دونوں افسانوں کی کہانی کو اپنے منطقی انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت اور فقروں کی ترتیب جملہ مواد کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ مثلاً "دید اور دید" کا ایک پیرا گراف ملاحظہ ہو۔

"بازاروں اور منڈیوں پر سینکشن نہیں لگے ہیں اور ہر قسم کا انفراسٹرکچر نہ ہونے کے با وجود اونٹوں کے قافلوں کی آمد و رفت مسلسل جاری ہے قطار در قطار دیس دیس ولا یت کا مال آ رہا ہے۔"(۶۴)

مصنفہ نے ایک تاریخی شہر بغداد کی تاریخ اور اس کی عظمت رفتہ بیان کر کے آج اس کے اجڑنے کی کہانی بیان کی ہے۔ تہذیب کے زوال کو انہوں نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی تاثیر قاری کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقت کو ہی موضوع بنایا ہے اور سماجی زندگی کی حقیقتوں کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی میں درد کی کیفیت پیدا کر کے انہوں نے اسے اثر انگیز کر دیا ہے۔ ان افسانوں کی کہانی میں سچائی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ ان کی تحریروں کی گہرائی اور گیرائی ان کے وسیع و عمیق مشاہدے کی عکاسی کرتی ہیں۔ انہوں نے سیاسی و اخلاقی خرابیوں، طبقاتی و سماجی استحصال، دہشت گردی خود غرضی اور مفاد پرستی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس افسانے میں حال سے ماضی کی طرف لے جانے والی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

"مگر یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بغداد کے کوچہ و بازار میں گشت لگانے والے خلیفہ وقت کو یہ اطمینان رہتا تھا کہ اس کا شہر آباد ہے۔ اس کے سُوق، بازار اور منڈیوں میں مال فراوانی سے موجود ہے۔ پھل، سبزیاں، اناج اور ہر قسم کی ضرورت زندگی بکثرت اور عام بک رہی ہے۔ کہیں بھی کوئی سینکشن نہیں لگا ہوا ہے۔ یہ بات وہ یقین سے کہہ سکے تھے کہ یہ خود ان کی اپنی آنکھوں دیکھا حال ہے۔ ابھی ابھی ان کے قریب سے نان فروش آوازیں لگاتا گزرا ہے۔ یہ لوگ لمبی لمبی گرما گرم روٹیوں کے تھال کے تھال اپنے کندھوں پر لٹکائے آوازیں لگاتے ہیں۔ بھٹیارنیں اپنے تندوروں کو دہکائے گرم گرم تازہ تازہ قلچے اور نان لگا رہی ہیں۔ سقے اور شربت بیچنے کے گلاسوں میں یوں مؤدب ہو کر پیش کرتے ہیں گویا خاص الخاص جام کوثر پیش کرتے ہیں۔"(۶۵)

ان کے افسانے میں کیفیائی فضا قائم رہتی ہے جس سے ایک بھرپور قسم کا تاثر ابھرتا ہے۔ یہ افسانے قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہی کسی فن پارے کی کامیابی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے الطاف فاطمہ نے کہیں کہیں علامتی اور نیم علامتی انداز اپنایا ہے۔

مبین مرزا کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور بیانیہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے روایتی اور بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں مگر وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانے میں فنی اور تکنیکی تبدیلیاں آتی گئیں اور ان کے افسانے میں نیم علامتی انداز شامل ہو گیا۔ افسانہ نگار ماضی سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہوئے اور حال کے عصری تقاضوں اور ضرورتوں کا گہرا شعور لیے ہوئے مستقبل کی جانب گامزن ہیں۔ مبین مرزا نے اپنے ارد گرد رونما ہونے والے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات و واقعات کو ہی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

"اس کی رہائش جس جگہ تھی وہ شہر کا سب سے زیادہ متاثر رہنے والا علاقہ تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے شہر کے سیاسی، گروہی اور لسانی مسائل کے بارے میں سوچنے لگے۔ وحشیوں کا، درندوں کا شہر ہو چکا ہے کراچی، انسان نہیں بستے یہاں۔ انسان ایک دوسرے کے ساتھ نہیں کر سکتے یہ سب کچھ ۔۔۔۔ یہ بربریت ۔۔۔ یہ سفاکی ۔۔۔۔ بالکل غیر انسانی صورت حال ۔۔۔ لیکن ان کا دھیان ایک بار پھر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی، سب کے چہروں پر خوف اور اضطراب تھا۔ نہیں۔ یہ سب تو انسان ہیں ۔۔۔ ان میں تو کوئی درندہ نہیں ہے ۔۔۔۔ اور وہ لوگ جنھوں نے دروازے کھول کھول کر موت سے بھاگے ہوئے ان بے اماں لوگوں کو پناہ دی ہے ۔۔۔ نہیں، بالکل، انسانیت اس شہر سے ہر گز ختم نہیں ہوئی۔ انہوں نے فوری اپنی رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سوچا،

یہاں اکثریت انسانوں ہی کی ہے۔ لیکن یہ اکثریت درندوں کی اقلیت کے آگے بے بس ہے، لوگ نہتے ہیں، مجبور ہیں، لیکن اس بے بسی اور مجبوری کے عالم میں بھی اُن کے اندر کی انسانیت زندہ ہے۔"(٦٦)

ان کے افسانے میں معاشرتی ناہمواریوں، اخلاقی نے حسی، سیاسی نفسیات مسائل، ظلم و بر بریت، دہشت گردی، خوف و وحشت اور زمانے کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی اقدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی نظر آتی ہے۔ تیکنیکی لحاظ سے انہوں نے منظر یہ Descriptive رکھا ہے وہ جو آنے والے واقعات کے لیے خوب صورت سماں بندی ہے۔

"جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ تکبیر پڑھی جا رہی تھی۔ شیخ سخاوت علی چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سینے میں دھڑکتے دل کی کیفیت بدل گئی، اُسے لگا پل بھر میں وہ سینے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا یا پھر جتنی شدت سے دھڑک رہا ہے، پل پل میں تھک کر بالکل ساکت ہو جائے گا۔ اُس کی نگا ہیں بے اختیاری میں اس مشکوک آدمی کی طرف اٹھیں اور پھر اُس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ وہ آدمی اپنی جگہ سے غائب تھا۔ یاخدا۔ یہ کیا ہوا۔ شیخ سخاوت علی نے خوف زدہ ہو کر سوچا لیکن اگلے ہی لمحے اُسے خیال آیا، کہیں یہ صرف میرا وہم تو نہیں تھا، فریب نظر تو نہیں تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اُسے لگا جیسے سینے پر دھرا منوں وزن کسی نے ہٹا دیا۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور خود کو پورا اطمینان دلانے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ آدمی کہیں نہیں تھا، کہیں بھی نہیں۔ امام صاحب نے نیت باندھی۔ شیخ صاحب نے نہایت سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ جمعے کی نماز کی نیت کی اور دونوں ہاتھ کانوں کی لوؤں تک اٹھائے۔ بس اُسی لمحے نگاہ پھر اُس مشکوک شخص پر پڑی، اب وہ دو صفیں آگے کھڑا تھا۔ شیخ سخاوت علی کے ہاتھ جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ اُس کے جی میں آئی وہ صفوں کو چیرتا ہوا مسجد سے باہر نکل بھاگے۔ لیکن اُس کے پاوں تو جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ کیا کروں؟ کوئی اُس کے اندر پکار رہا تھا۔"(٦٧)

مبین مرزا کے ان افسانوں میں ابتدائیہ تیکنیکی لحاظ سے انتہائی جاذب ہیں اور قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ ابتدائیہ کو پڑھتے ہی افسانے میں تجسس و جستجو کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں اسلوب کے تجربات کے ساتھ ساتھ تیکنیک کے تجربات بھی ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خاص قسم کی ڈرامائیت ملتی ہیں۔ انہوں نے افسانوں میں نفسیاتی پیش کش پیدا کی ہے۔

دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے ان کے افسانے "سلیپنگ بیوٹی" میں تبصراتی تیکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے کہانی کو پس منظر میں رکھ کر حقیقت کا روپ دیا ہے۔ افسانے کی فضا شاعرانہ ہے۔

"لمبی پھیلی بانہوں والی منتظر کھڑی سیڑھی کے کشادہ سینے میں وہ چھپ گیا، یا شاید اوندھے منہ گر گیا ۔ جیسے دشمن اور خوف دونوں نے مل کر کلاوہ ڈالا ہو یا پھر دونوں تعاقب میں ہوں۔ پر وہ دوڑتے دوڑتے ہار گیا ہے ہو۔"(۶۸)

"یاپروردگار" میں تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے اور فلیش بیک اور بیانیہ تیکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔

"زندگی بنا مقصد کے جانوروں کی طرح جینا ہے اور انسانیت کا سب سے بڑا مقصد شر کی سرکوبی ہے۔ لیکن آج کا دور شر کے اقتدار کا دور ہے اور مقتدر وقت کو للکار کر ہم اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم گھات لگا کر اُسے ذرہ ذرہ توڑ سکتے ہیں اور جیسے بار بار پیر رکھنے سے پتھر گھس کر کمزور ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو ظالم بہت سہا اور کمزور ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ اپنی پوری قوت ان نہتے اور کمزوروں پر کیوں صرف کر ڈالے، جن کے پاس سوائے موت کی قوت کے کچھ نہیں ہوتا۔ ظالم اور جابر بظاہر جتنا طاقتور ہوتا ہے۔ باطن اُتنا ہی کمزور اور خوفزدہ کیونکہ اُس کی زندگی ہماری موت کی گھات میں ہے اور ہماری موت اُس کی زندگی کی گھات میں۔"(۶۹)

"جنگل اسکرین" سائنس فکشن اور ڈرامائی انداز کا افسانہ ہے۔ جس میں بیانیہ انداز کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اس افسانے کی کہانی ایک سیریز کی طرح پیش کی گئی ہے:

"میں نے کہا "بیٹا کاپی تو ہم جیسے چھوٹے چھوٹے لوگ کرتے ہیں جن کے پاس آئیڈیاز کی کمی ہوتی ہے اور وسائل کی نایابی، جنگل سکرین سیریل تو جدید ترقی یافتہ اقوام کی مشترکہ پیش کش ہے۔ جن کے سیارے اور سیارچے بادلوں کی طرح آسمانوں پر محو پرواز رہتے ہیں جو ہر انسان و حیوان، نباتات و جمادات کی ہر ہر حرکت کو محفوظ کرتے ہیں، جن کے حساس آلات ہماری سانسوں تک کا شمار رکھتے ہیں اور ایکسریزی جدید مشینیں ہمارے جسموں کے آر پار دیکھتی ہیں وہ بھلا چربہ کاہے کو بنائیں گے۔ لیکن بالک ہٹ تو نینا پر بس ہے۔ وہ باربی سا پھولا پھولا پنک فراک سمیٹ کر اُچکی اور ٹی وی آن کر دیا۔ جہاں جنگل سکرین سیریل کی دلچسپی اور مقبولیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی اقساط اور دلچسپ مناظر پر مشتمل ٹریلر بار بار ٹیلی کاسٹ کیے جاتے تھے۔ اُس وقت جنگل سکرین میں وہ مقبول قسط سہ بارہ دکھائی جارہی تھی جس میں کارپٹ بمباری کو فلمایا گیا تھا اور جسموں کے کٹے پھٹے اعضاء بریدہ لاشوں اور بہتے

لہو سے اُٹھتے دھوؤں سے سیٹ کی آرائش کی گئی تھی۔ دراصل اس قسط کا ذیلی عنوان تھا موت ہی موت۔ جس میں جانیں قبض کرنے کی جدید ریسرچ کے تجربات کو فلمایا گیا تھا اور Horror مو سیقی کے جلو میں جنگل بج رہا تھا۔"(۷۰)

ان افسانوں میں علامت نگاری کے ساتھ ساتھ جدید تیکنیکوں کا نہایت چابک دستی سے استعمال کیا گیا ہے۔ افسانوں میں اختصار کے باوجود جدت اور معروضیت پائی جاتی ہے۔ دہشت گردی جیسے خشک موضوع میں ڈرامائیت کا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ جس سے افسانوں کی جاذبیت اور فن اپنی مثال آپ ہے۔ طاہرہ اقبال عہد جدید کی افسانہ نگار ہیں اور عہد جدید کے اسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ جملے ادھورے، نامکمل، عدم تکمیلیت کا شکار ہوں۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں بھی یہ خصوصیت عروج پر ہے۔ اُن کے افسانوں میں علامات اوقاف کا استعمال جابجا نظر آتا ہے۔

محمد حمید شاہد نے اپنے افسانوں میں جدید تکنیکوں کو بھی بڑی خوب صورتی سے برتا ہے۔ دہشت گردی اور ۹/۱۱ جیسے موضوعات کے باوجود بھی ان افسانوں میں جاذبیت ملتی ہے اور مختلف تکنیکوں کا استعمال تحریر کو زیادہ مؤثر بنا دیتا ہے۔ جس میں شعور کی رو سے خطابی وقفہ کی تکنیک اور تلازمہ خیال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تلازمہ خیال کی مثال ملاحظہ ہو:

"میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ میری ماں، جسے میں بے بے کہا کرتی تھی میرے سر پر آ کر کھڑی ہوئی اور ناراض ہو کر کہا: نی تیئیے حیا کر، آج تیرا ویاہ ہے اور تو گڑیوں سے کھیل رہی ہے میں نے کہا بے بے آج تو میری گڑیا کی شادی ہے۔ بے بے نے مجھے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ پھر میرے ہاتھ سے گڑیا اور رنگ برنگے پٹولے لے کر انہیں غور سے دیکھتے ہوئے "بولی تمہیں اس گڑیا سے بھی سوہنے کپڑے پہناؤں گی۔ اس وقت میں یہی سمجھتی تھی کہ شادی خوب صورت اور کام والے کپڑے پہننے کا نام تھا۔ میں جھٹ تیار ہو گئی۔ کہا! بے بے پھر تو میں شادی ضرور کروں گی۔ بے بے ہنسی مگر میں نے دیکھا اس کی آنکھیں جیسے چھلکنے کو تھیں۔"(۷۱)

ان کے ہاں تیکنیکی لحاظ سے تکمیل کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ بیانیہ تیکنیک کی مثال ملاحظہ ہو:

"میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی چیخ اُٹھی۔ دوسری جانب سے ایک مانوس آواز لرز رہی تھی جو یک بہ یک سسکیوں میں ڈھل گئی۔ نواز کہہ رہا تھا تمھارا بھائی

مصعب شہید ہو گیا۔ مزید ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہو سکا کہ آواز سسکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

شدید دکھ میرے پورے وجود میں تیر گیا اور لفظ شہادت کی تکرار میرے اندر گونجنے لگی۔

"دعا کرنا امی، اللہ مجھے شہادت نصیب کرے"

دعا کرنا بھائی، میں خدا کی راہ میں شہید ہو جاوں"(۷۲)

مصنف نے تکنیک کے نت نئے تجربات کر کے اردو افسانے میں بیانیہ کے میدان میں بے شمار تخلیقی ابعاد پیدا کیے ہیں اور ایک جدید انداز کی Objectivety ان افسانوں میں جنم لے رہی ہے

ج۔ اردو افسانے کی کردار نگاری پر دہشت گردی کے اثرات

گزشتہ دو دہائیوں میں پیش آنے والے اندوہناک واقعات سے جڑی تحریروں کو پڑھ کر ایک خاص قسم کا خوف اور سراسیمگی اور مسلسل پیش آنے والے سانحات بم دھماکوں، خودکش حملوں اور ڈرون حملوں کے نتیجے میں انسانی جانوں کے ضیاع نے اس عہد کے تخلیق کاروں اور افسانہ نگاروں کو جذباتیت سے بھرپور اور دکھ درد سے سہم ہوئے کئی کردار مہیا کیے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کو افسانہ تخلیق کرتے ہوئے کئی عوامل کو باہم مربوط کر کے کہانی کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ مثلاً بہترین کہانی ماحول، مناسب کردار، کرداروں کے مکالمے اور پھر کہانی کا ماحول اور کرداروں کے ساتھ آگے بڑھنا وغیرہ۔ ایک افسانہ نگار کو جذباتی واقعات اور جوشیلے کرداروں کو کہانی کے پیرائے میں ڈھال کر آہستہ آہستہ آگئے بڑھانا ہوتا ہے۔ اس سارے عمل میں گہرا مشاہدہ اور بھرپور داخلی کیفیات افسانے کو ادبی شاہکار بنا دیتی ہیں۔

مسعود مفتی کا افسانہ "شناخت" دہشت گردی اور اس کے اثرات کے حوالے سے بہترین افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "خالد" عجیب کشمکش میں دکھایا گیا ہے۔ وہ جدید امریکی تہذیب کا پروردہ ہے۔ اسے ایک امریکی لڑکی سے محبت ہو گئی جس کی وجہ سے وہ اپنی شناخت اور تہذیبی ورثہ بھولنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ اس سے شادی تو کر لیتا ہے۔ مگر ۹/۱۱ کے سانحے نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس واقعہ کے بعد مسلمانوں سے امریکیوں کا رویہ یکسر بدل گیا۔ خالد کا کردار ان تمام مسلمانوں کی عکاسی کرتا ہے جنہوں نے اپنا ملک اور اپنی شناخت بھول کر امریکی تہذیب کو اپنا لیا اتنے برس قیام کے بعد بھی اس ملک اور اس کے باشندوں نے ان کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ خالد کے کردار میں جو اضطراب اور خوف کی کیفیت عیاں ہے وہ اس وقت کے تمام امریکی مسلمانوں کی

نمائندہ ہے۔افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے ۱۱ ستمبر کے بعد کی صورت حال کو وہ دھچکہ قرار دیا ہے جس کے بعد بہت سے امریکی مسلمان اپنی شناخت کی واپس لوٹ آئے۔

"یہ درست ہے کہ تم نہیں ہو۔۔۔ مگر کلچر بھی کلچر ہے۔کچھ نہ کچھ رشتہ تو باقی رہتا ہے۔" خالد کے چہرے پر ایک سایہ سا تیرا۔ وہ چند لمحے گہری نظر سے جوزفین کو دیکھتا رہا اور پھر ڈھیلی آواز میں بولا "تم تو نہ کہو ڈیئر"۔۔۔جو شخص اپنے زندہ ماں باپ بھائی بہنوں کو فراموش کر چکا ہو، اپنا ملک چھوڑ چکا ہو، اس کا اپنے ماضی سے کیا رشتہ رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔

"اوہ آئی ایم سوری۔۔۔۔میرا مطلب یہ نہیں۔۔۔۔۔"جوزفین نے معذرت شروع کی۔

مگر وہ بات سنے بغیر ہی باہر نکل گیا۔"(۷۳)

الطاف فاطمہ کے دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے دو افسانے "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام" اور "دید وادید" کردار نگاری کے حوالے سے بھی بہت اہم ہیں۔ان افسانوں کے کردار زندگی کی ایسی حقیقتیں اور صداقتیں لیے ہوئے ہیں جنہیں ہم عام زندگی میں نظر انداز ہی کر دیتے ہیں۔ یہ عام سی حقیقتیں جب ان افسانوں کے کرداروں کی صورت ہمارے سامنے آتی ہیں۔تو نہ صرف ان کی معنویت بڑھتی ہے بلکہ قاری کا مشاہدہ بھی بڑھتا ہے۔ تمام کردار بہت جاندار اور متحرک ہیں۔ مثلاً حناداؤد "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام" میں مرکزی کردار ہے۔اس افسانے میں ۹/۱۱ کا بیان کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے واقعات نے مسلمانوں کا پوری دنیا میں غلط امیج بنایا۔ حناداؤد کا کردار صحیح غلط اور خیر و شر کی پہچان کرنے والا کردار ہے۔ مثلاً وہ مسلمانوں کے بارے میں جب معلومات اکٹھی کر کے ڈائری میں لکھتی ہے:

"بد قسمت قوم کے ننھے بچے آج تم اس گرم اور تپتی زمین پر بے آسرا کیوں پڑے ہو کیا بہت تھک گئے ہو۔۔۔۔۔ سینکشنوں نے تم پر زندگی حرام کر دی تھی۔ پھر بھی زندہ رہے۔ سواب کیا ہے۔ جو پانی اور روشنی نہ ملنے پر پھر بھی جی رہے تھے۔ بس ایک بمباری پر روٹھ گئے۔ارے یہ کوئی مہلک ہتھیار والے بم نہ تھے۔ یہ تو تم کو صبر اور سختیوں سے نجات دینے والے فرینڈلی شاہین ہیں۔اچھا تو دھوئیں اور گرد و غبار کے مرغولوں سے دم گھٹ گیا تو پھر کیا ہوا؟ وہ تم کو نجات دلانے ہی تو آئے تھے۔ دیکھو تم پر ان کا کتنا بڑا احسان ہے کہ تم کو ہر فکر اور غم سے نجات دلائی۔"(۷۴)

افسانے میں داستانی رنگ نمایاں ہے۔انہوں نے افسانے کا آغاز داستانی انداز میں کیا ہے۔

اسی طرح احمد داؤد "یوں ہی کوئی مل گیا سر شام" کا کردار ہے۔ یہ کردار انسانی کیفیات کی غمازی کرتا ہے۔ یہ کردار بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھرپور ہے اور جب ۹/۱۱ کے واقعے میں مسلمانوں کو معتوب ٹھہرایا گیا تو اس کے ذہن میں کئی سوالات نے جنم لیا۔ اسی طرح ہارون الرشید کا کردار بھی جاندار ہے۔ یہ سارے کردار ہمارے معاشرے کی گزشتہ نصف صدی کے معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور جذباتی رجحانات کے عکاس ہیں۔

اسی طرح "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام" میں انہوں نے انٹرنیٹ پر ہونے والے دو کرداروں کی ملاقات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح انٹرنیٹ کے ذریعے انسان اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ انٹرنیٹ سے متعلق جو معلومات بیان کی ہیں وہ ان کے وسیع مطالعے کی دلیل ہیں۔

"چلو کل تم کو کمپیوٹر لا کر دیتے ہیں اور تم انٹرنیٹ پر سوال ساری دنیا سے کر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔زیرو زیرو تھری ڈاٹ کام مسلم ٹیریرسٹ زیرو زیرو۔"(۷۵)

الطاف فاطمہ کے افسانوں کے کردار جن کیفیات سے گزرتے ہیں وہ عام انسانوں کے عمومی تجربے کی کیفیات ہیں۔ ان میں فرد کے روحانی آشوب کی تفہیم کے لیے مختلف زبانوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ جس سے تحیر کی فضا تشکیل پاتی ہیں۔ کرداروں کی پیشکش کے حوالے سے کردار کی نوعیت کے مطابق زبان اور فنی وسائل کا استعمال کیا گیا ہے۔

ان افسانوں کے کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اسی طبقے کی زبان بولتے ہیں۔ کردار کی زبان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں کردار کس ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔ "دید اور دید" میں بعض جگہ پر کرداروں کے درمیان مکالماتی انداز گفتگو بیان کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی نفسیات، ان کے مزاج اور افسانے کے پلاٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مکالموں کے ذریعے سے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

خالدہ حسین کے افسانے 'ابن آدم" میں کردار نگاری بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ اس افسانے کا ہر کردار اپنی تخلیق کا مقصد خود بیان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ہیرو کی خوبیاں اور دشمن کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ضد اس کو افسانے کے ہیرو کی خصوصیات پر پورا اثابت کرتی ہیں۔ تمام کردار اپنے اندر ایک پورا جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ امین کا کردار حرص و ہوس، لالچ اور خود غرضی کا نمائندہ کردار ہے۔ اس جیسے کردار آج کے دور میں پورے معاشرے میں بھرے پڑے ہیں۔

"جبریل الامین، کتنا غلط نام تھا اس کا۔" یہ بھی اس نے سوچا، مگر یہ امانت اور خیانت۔۔۔ یہ بھی محض تصورات ہیں جب کہ جسم اور حواس اور ان کی آسودگی حقیقت۔ اب وہ ان کے پیچھے پیچھے اس سیل میں جا رہا تھا جہاں قدوس کے ہاتھ اس کی پشت پر کنڈوں سے زنجیر کیے گئے تھے اور وہ فرش پر گچھا تھا اور شکاری، آدم خود سیاہ کتا اپنی لمبی سرخ زبان لٹکائے اور نوکیلے دانت نکوسے، بار بار اس پر غراتا اور چھٹیا تھا اور بار بار اس کا پٹا کھینچ لیا جاتا تھا اور برابر کے سیل میں ابو حمزہ جو نیم جانی کی عالم میں اٹھا لیا گیا تھا، کھال ادھڑنے، اعضاء کھینچنے، بے پناہ مسلسل شور اور آنکھوں میں ہزاروں سورج اترنے پر بھی اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا تھا"(۷۶)

افسانے میں ماہر کا کردار ایک تفتیشی افسر کا ہے۔

"ماہر کی گفتگو ٹکڑے ٹکڑے اس تک پہنچ رہی تھی۔ وہ باقیوں کو بتا رہا تھا کہ تفتیش اور راز اگلوانے سے پہلے ان لوگوں کو کنڈیشن کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے ان کی آدمیت سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دراصل آدمی میں خود آدمیت ہی سب سے بڑا فساد ہے اور اس نسل میں تو خاص طور پر۔ جب تک تم ان کو یقین نہ دلا وگے کہ وہ آدمی ہی نہیں ہیں۔ وہ تمھارے کسی کام کے نہیں۔ کل صبح ساڑھے نو بجے بیرکوں کے باہر احاطے میں پنڈال لگاؤ۔ ابھی تمھیں بہت کچھ سیکھنا ہو گا۔

ماہر سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل گیا۔"(۷۷)

عہد حاضر میں دہشت گردی کا ٹیگ محض ایک مخصوص گروہ کے لیے مختص کیا گیا ہے اور وہ ہیں مسلمان۔ آج کے انسانی معمولات زندگی میں "دہشت گردی" کا موضوع اپنے بھیانک چہرے کے ساتھ منصۂ شہود پر نمودار ہے۔ یہ ایک ایسا عفریت ہے جس کا خوف اور دہشت زمانہ قدیم سے ہی کسی نہ کسی صورت میں درپیش رہا ہے۔ مگر اس کو عجب اتفاق ہی کہیے کہ اس کی آج تک کوئی بھی حتمی تعریف معرض وجود میں نہیں آسکی۔ کیوں کہ جتنے بھی مقتدر ممالک اور اقوام تھیں، انہوں نے اپنے دشمن کے لیے "دہشت گرد" بطور لقب استعمال کیا۔ مگر افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو ساری دنیا میں دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ تمام قوتیں مسلمانوں کو اس لیبل سے ہی نوازتی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی میں متحد ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ اصطلاح امریکہ کی ہی اختراع ہے یہ بات بھی اب بالکل عیاں ہے کہ نائن الیون کے سانحے کے بعد امریکہ اور اس کے حامیوں نے مسلمانوں پر بہت زیادہ سختیاں کی ہیں۔ عام آدمی تک مسلمانوں کا ایک غلط تصور ابھارا جا رہا ہے اور ان کے ذہنوں میں ایسا زہر گھول دیا ہے کہ آج لوگ مسلمانوں سے بات کرنے سے بھی

گھبراتے ہیں۔اس سارے معاملے پر بین العلومی مکتبہ فکر کے ادباء نے آواز اٹھائی اور قلم کے ذریعے ان حالات اور غیر مساوی رویے کو تنقید کی زد میں دنیا کے سامنے بھارا۔اردو ادب کے مختلف تخلیق کاروں نے اپنی شاعری اور افسانوں میں اس نکتے کو موضوع بنایا۔اس ضمن میں "شہر گریہ" میں رشید امجد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔"مجال خواب" بھی اسی موضوع کا عکاس ہے۔"شہر گریہ" میں کہانی کو اساطیری خوابوں کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہے۔وہ اس افسانے میں اپنے وطن کی خستہ حالی بیان کرتے ہیں اور اشارتاً بنی اسرائیل کی گریہ و زاری کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔جب وہ بابل و نینوا میں بخت نصر کی قید میں تھے۔

رشید امجد کے افسانوں کے کردار پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان لکھتی ہیں کہ :

"جدید اور ہم عصر کہانی کے کرداروں سے مماثلت رکھتا ہے۔اور ایک بکھری ہوئی شخصیت کا مالک ہے جو بے نام چہرہ، بے پہچان اور بے معنی ہے۔اسے اپنے اطراف بھی بے نام، بے چہرہ، اور اجنبی لوگ نظر آتے ہیں۔"(۷۸)

منشا یاد کا افسانہ ایک "سائیکلو سٹائل وصیت نامہ "صیغہ واحد متکلم میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں انہوں نے دہشت گردی کے موضوع کو ایک عام گھرانے کے معصوم جوان کے مجاہد سے شہید تک کے سفر کو بیان کیا ہے۔وہ کہانی سنا نہیں رہے بلکہ خود بخود کہانی بنتی چلی جاتی ہے

"مجھے ان سے ملنے کی خواہش ضرور تھی مگر ہر بار جب میں گاؤں جاتا، کوئی دوسری مصروفیت آڑے آجاتی اور تہیہ کر لیتا کہ اگلی بار ایسے مجاہد شخص کو دیکھنے ضرور جاؤں گا۔ جس نے قدامت پسندی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے اور زندگی کو تکلفات سے پاک کر کے آسان اور سادہ بنا دیا۔ مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کی فکر نہ آئے روز بجلی، پانی اور گیس کے بڑھتے ہوئے بلز جمع کرانے کی چنتا۔ لیکن گاوں کے بعض لوگ ہی نہیں ہمارے اپنے گاوں کے پیش امام مولوی محمد شفیع بھی کہتے تھے کہ جاٹ آدمی تھا۔ علم کا بوجھ برداشت نہ کر سکا۔ علم اس کے سر کو چڑھ گیا۔

یہ تین روز پہلے کی بات ہے۔

ابھی ڈری اور سہمی ہوئی رات کی سویر نہیں ہوئی تھی کہ ہم ہڑ بڑا کر بیدار ہو گئے۔"(۷۹)

ان کے ہاں بیانیہ کردار کا باطن ہے۔آخر میں افسانے میں نظمیہ تیکنیک استعمال ہوتی ہے

زاہدہ حنا کے افسانہ "نیند کا زرد لباس" میں ایک معصوم بچی کی زبانی زمانے کے تلخ حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔دہشت گردی پر لکھے گئے بیشتر افسانوں کے کردار صیغہ واحد متکلم میں پیش کئے گئے ہیں۔ان میں زاہدہ

حنا کا افسانہ "نیند کا زرد لباس" بھی شامل ہے۔اس میں کردار نگاری اپنے عروج پر ہے۔ہر کردار نہایت متحرک اور جاندار ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے ایک معصوم بچی کی زبانی زمانے کے تلخ حقائق کو پیش کیا ہے۔

"میرا نام پروین ہے۔جناب! میں ۱۰ برس کی تھی جب آپ نے مجھے کابل سے نکال دیا۔ہم وہاں سے نکلتے نہیں تو اور کیا کرتے؟ بم آپ کے بھیجے ہوئے تھے اور وہ ہمارے گھر اڑا رہے تھے۔ میری بہن پروانہ اور بھائی جلال اس بمباری میں مارے گئے۔آپ نے میرے بھائی بہن چھینے، میرا شہر، میرا گھر، میری گلیاں، میرا بچپن، میرے خواب چھینے، آپ نے میری ہتھیلی بھی چھین لی۔آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ، مکھن کی ٹکیاں اور رنگ برنگ کی تتلیاں گرا رہے تھے۔تو میں اور میری کئی سہیلیاں ان تتلیوں کو اٹھانے کے لیے بھاگیں، بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اٹھانے والے بچ گئے۔تتلیاں پکڑنے والی میری دو سہیلیوں کو تتلیاں اپنے ساتھ لے گئیں اور میری ہتھیلی بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ہم نہیں جانتے تھے کہ امریکی بچے بارودی تتلیوں سے کھیلتے ہیں۔یہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ یہ تتلیاں خاص طور سے ہمارے لیے بنی تھیں۔سنا ہے آپ جب اپنے بچوں کے لیے کھلونے بناتے ہیں تو ان کے ڈبوں پر ان سے کھیلنے والے بچوں کی عمر بھی لکھ دیتے ہیں۔لیکن آپ نے ہمارے لیے ایسے کھلونے کیوں بھجوائے تھے جو ہماری جان لے لیں، جو ان کی ہتھیلیوں اور ان کے پیر ساتھ لے جائیں"۔(۸۰)

مصنفہ نے معصوم بچی پر گزرے حالات و واقعات کو اسی کی زبانی بیان کیا ہے۔

"میں اور چھوٹی؟ باجی میں نے اپنی پیاری بہن اور بھائی کو اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا ہے۔میں ہتھیلی نہیں رکھتی۔ میں کابل سے یہاں تک کبھی اونٹ، کبھی خچر، کبھی ٹرک پر بیٹھ کر پہنچی ہوں۔ میں نے فاقہ کیا ہے، راستے میں انسانوں کی لاشیں دیکھی ہیں، بچوں کے ڈھانچے۔تم بادلوں کے پانی سے نہاتی ہو، میں بموں اور میزائلوں کی برسات سے گزری ہوں، تم کہتی ہو میں چھوٹی ہوں۔ چھوٹی تو تم ہو باجی جو یہاں بیٹھی ہو۔میں تو کوہِ مُر کی تین چوٹیوں جتنی بوڑھی ہوں۔"اس کے جملوں میں انگاروں کی دہک تھی۔میں نے اس کو اپنے سینے سے لگالیا۔"(۸۱)

ان کے کردار جینے کی تمنا لیے ہوئے ہیں۔جو کہ سراپا جدوجہد میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ان کرداروں میں تحرک ہے۔جو کہ انہیں بے بسی کے خلاف جہاد کرنے میں اکساتا ہے۔انہوں نے زوال کی گہرائیوں میں جھانک کر کردار کی نفسیاتی تصویر کشی کی ہے۔ان کے ہاں رومانیت کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔ اور اسی طرح اساطیری عناصر بھی بہت سے افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

"پھوپھی مرجانہ، پھوپھا، پروین اور اس کے دو بھائی سال بھر پہلے باجوڑ آئے تھے پھوپھا بہت خوددار تھا، رات ہوتی اور حجرے میں جلتے ہوئے چراغ کا تیل ختم ہونے لگتا اور زور زور سے باتیں کرنے والے مردوں کی آوازوں کو بھی نیند آنے لگتی تو میرا پھوپھا اور اس کے دونوں بیٹے باہر خیمے میں جاسوتے۔"(۸۲)

مبین مرزا نے اپنے افسانوں میں کرداروں کے درمیان گفتگو مکالموں کی صورت میں دکھائی ہے جن سے تمام کرداروں کی نفسیات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے مزاج کا پتا چلا چلتا ہے۔ مکالمے کرداروں کی ساخت کے مطابق ہوتے ہیں جن سے کرداروں کے احساسات وجذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

"کیا جو تم بتانے والی ہو۔ وہ تمہاری ذات سے متعلق ہے یا کچھ اور؟ ہاں وہ میرے بارے میں ہے اور کچھ تمہارے بارے میں بھی لیکن اپنے بارے میں تو تم بہت کچھ مجھے پہلے کی بتا چکی ہو" "میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور جو بتایا ہے وہ درست نہیں"۔ وہ تیزی سے بولی، اور جو آج بتاؤ گی کیا وہ۔۔۔" خالد تلخی سے کہتے کہتے رک گیا۔"(۸۳)

دہشت گردی کے سانحہ نے امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی زندگی ہی بدل ڈالی۔ افسانہ "یہی تو ہے زندگی" کے تمام کردار اس کی عکاسی کرتے ہیں:

"اس کی شادی کے ساتویں سال امریکا میں ٹوئن ٹاور والا واقعہ ہوا۔ اس واقعے کے نتیجے میں شدت کے ساتھ ابھرنے والی سماجی نفرت کے تجربے نے کتنے ہی امریکی مسلمانوں کی زندگی بدل دی۔ یہ سماجی تعصب کا ردعمل تھا، مذہبی جذبہ تھا یا تحفظ ذات کا رویہ۔۔۔۔ جو بھی تھا مگر اس کے زیر اثر بہت سے لوگ جو آزاد خیال اور مذہب سے بالکل بیگانے تھے، اچانک پورے پکے مذہب پرست ہو گے۔ کتنی لڑکیاں جو کلب میں ناچتی اور شراب پیتی تھیں۔ ایسی بدلیں کہ حجاب لینے لگیں۔ تبدیلی کی اسی ہوا نے نتاشہ کے شوہر جنید کو بھی بدل ڈالا تھا اور اس طرح کہ اب وہ داڑھی رکھ کر پنج وقتہ نمازی بن گیا تھا۔ ان سب سے گزرتے ہوئے نتاشہ نے تکلیف اور مشکلیں تو بہت محسوس کیں لیکن اس کے قدم کہیں نہ ڈگمگائے۔"(۸۴)

۹/۱۱ کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ ان افسانوں کے کردار سہمے ہوئے ہیں۔ ایک غیر یقینی صورت حال سے دوچار یہ کردار ہر لمحہ اضطراب اور خالی پن کا شکار ہیں۔ کرداروں کے مکالمے ان کی ذہنی کیفیات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ مبین مرزا کے افسانوں کے کردار اپنے اپنے طبقے

کی غمازی، جس انداز میں کر رہے ہیں۔ وہ اس عہد کے ہر انسان کی داخلی و خارجی صورت حال کی بہترین مثال ہیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں کردار بہت فعال ہیں جو کہ زندہ، حقیقی اور ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ انہی کرداروں کی زبانی معاشرے کے بگاڑ اور سماجی برائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں ہر کردار انفرادی خصوصیت کا مالک ہے۔ کہیں پر افسانہ نگار نے صیغہ واحد متکلم میں کردار پیش کیے ہیں جس سے کہانی میں حقیقت کا رنگ بھر جاتا ہے۔ معاشرے میں پھیلی بد امنی سے جس طرح انسانی زندگی مفلوک ہوتی جا رہی ہے اس کی مکمل منظر کشی کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر استفہامیہ بیان ملتا ہے۔ مکالموں کی صوت میں کردار آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

"ماما! یہ Animals Animals کو کیوں کھاتے ہیں؟

میں نے کہا "بیٹا یہ جنگل کا قانون ہے کہ بڑے بڑے جانور چھوٹے جانوروں کو کھا جاتے ہیں"۔

تو پھر ماما بڑے Humans چھوٹے۔۔۔۔"(۸۵)

ان افسانوں میں کرداروں کے مکالمے ان کرداروں کی کیفیت، رتبے، علم اور لب و لہجے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جس سے افسانے کا تاثر مزید ابھر جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے علامات، اوقاف اور ساکن حروف کے استعمال سے جملوں میں تاثرات پیدا کر کے مکالماتی خصوصیت کو مزید ابھارا ہے۔ ''جنگل سکرین'' واکنگ ٹریک ۔۔۔دو کلو میٹر میں'' مکالماتی انداز چھایا ہوا ہے۔ اور مکالماتی تیکنیک سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کئی قصوں کو ایک ساتھ ہی تحریر کیا جا رہا ہے۔

"انیق نے مرغے کے ٹانگ بھر دیں حصے کو دانت سے کاٹا، ریشے بے ترتیب ہو کر ٹوٹے، ہڈی کی جڑ میں لہو کے قطرے پک کر جم گئے تھے۔ بالکل ویسے جیسے اُن سب کی آنکھوں میں کچھ برگنڈی سا پھیلتا رہتا تھا۔ نیوز بلیٹن کے وقت ۔۔۔ جیسے آنکھیں نہ ہوں چوک میں لگے اشارے کی جلتی بجھتی لال بتیاں ہوں۔ لہو ظلم، آنسو، خوشی۔ شرم، غصہ سب کی رنگت لال ہی کیوں ہوتی ہے۔ سبھی خطرے کی علامتیں۔۔۔۔ "انیق کھانا کھاو۔" پاپا نے نیوز ویک اور عینک دونوں کے اوپر سے ایک ہی زاویے میں باہر کو ابلتی آنکھیں اُٹھائیں۔۔۔ محدب شیشے سے پلکوں کی باڑ ٹکرائی۔ برگنڈی میز کے لال ریتلے سیراب کا غبار انیق کے چہرے اور آنکھوں میں لہرایا"(۸۶)

اس افسانے میں تمثیلی اور استعاراتی انداز تحریر جابجا ملتا ہے۔ افسانہ نگاری میں تمثیلی انداز بیان اختیار کرنا بڑی فنی مہارت سمجھی جاتی ہے۔ جو کہ طاہرہ اقبال نے بھرپور طریقے سے نبھائی ہے۔ ان کے ہاں تمام اشیاء تجسیم کے پیکر میں ڈھلتی نظر آتی ہیں۔ جو کہ ڈر، خوف بے قراری، ناامیدی اور بے یقینی کے کینوس پر تجسیم کاری کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ساتھ ساتھ کرداروں کے مکالمے اور حرکات و سکنات قاری کے ذہن پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لیتی ہیں۔

"ان بھاگتے، چلتے ہوؤں کے بیچ، رفتار کو معتدل رکھے ہوئے وہ ہوتا، وہ جس کا خصوصی نام جا ننا ضروری نہیں ہوا کرتا اور جس کا عمومی نام ہر کوئی جانتا ہے۔ وہ جو ہر ماحول، ہر مجلس، ہر تقریب میں موجود ہوتا ہے اور جس کے سامنے سارا ماحول، ساری مجلس، ساری تقریب، ساری فضا، اجتماعی پسپائی اختیار کر جاتی ہے اور فاتح بڑھ کر غلبہ پالیتا ہے اور ماحول کی ساری تفصیل، ساری جزئیات اسی کی ذات سے ترتیب پاتی ہیں۔ وہ ہیرو سا شخص یہاں بھی موجود تھا۔ جس کی موجودگی حسن و جمال کے ظرف کا امتحان ہوا کرتی ہے۔ قدرت کی صناعی کا شہکار، جیسے پتھروں کے سینے سے پھوٹتا ہوا، چشمہ جیسے بلندیوں سے گرتی سفید جھاگ کے گالے بناتی ہوئی آبشار جیسے کوہ ہمالیہ پر جمی چمکیلی برف، وسعتوں میں کھیتوں کی ہریالی، اپالو کی عظمت اور سبھی وہ کچھ جو جمالیات کی تعریف میں آسکتا ہے۔

اللہ جانے وہ چھلاوہ تھا کہ اس کی مسکراہٹ آوارہ پھولوں کی کیاریوں میں سے جھانکتی تو کبھی سفید کی بلند و بالا شاخوں میں الجھتی۔"(۸۷)

دہشت گردی پر لکھے گئے بیشتر افسانے کے کردار صیغہ واحد متکلم میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں زاہدہ حنا کا ایک افسانہ "نیند کا زرد لباس" ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے ایک معصوم بچی کی زبانی زمانے کے تلخ حقائق کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ انتہائی مربوط اور منظم نظر آتا ہے۔ ایک کردار کو افسانے کا محور بتا کر اسی سے ہی کہانی کا اختتام کرانا بھی ایک فن ہے۔ اس افسانے میں اس بے نام کردار کے ذریعے افسانہ نگار نے اس نکتے کو بھی واضح کیا ہے کہ آج کے دور میں ظاہریت پر جا کر لوگ زندگی کے سب سے بڑے دھوکے کھاتے ہیں۔ وہ اجنبی انسان بہ ظاہر شریف النفس معلوم ہوتا تھا۔ اسی نے ہی بے حسی کا ثبوت دے کر نہ جانے کتنے معصوموں کی جان لے لی۔

ان کے کردار جینے کی تمنا لیے ہوئے ہیں۔ جو کہ سراپا جدوجہد میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ان کرداروں میں تحرک ہے۔ جو کہ انہیں بے بسی کے خلاف جہاد کرنے میں اکساتا ہے۔انہوں نے زوال کی گہرائیوں میں جھانک کر کردار کی نفسیاتی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے ہاں رومانیت کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔اور اسی طرح اساطیری عناصر بھی بہت سے افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

> "لوگ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ پھوپھی مرجانہ، میری اماں اور دوسری عورتوں کے بین کے ساتھ اس کے لکھے ہوئے لفظوں کا بین بھی شامل ہو گیا ہے۔ میرے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں۔ شہیدوں کو نہلایا نہیں جاتا، کفن نہیں دیا جاتا، نیند کے زرد لباس میں وہ سرسوں کا پھول لگ رہی ہے۔ کچھ دیر سے بادلوں میں چھپی ہوئی کوہ مر کی تین چوٹیوں کو دیکھے گی اور اسکندر اعظم کے گھوڑے پر سواری کرے گی۔ یا شاید بودھ مندر کی سیر کو جائے اور کیوں نہ جائے کہ وہ آزاد ہو گئی ہے۔"(۸۸)

یہ انداز بیان ان کے افسانے میں پُر اسراریت کی فضا قائم کرتا ہے۔ کرداروں کے کاٹ دار رویے اس معاشرے کی بے حسی اور ناانصافی کی داستانیں سنا رہے ہیں۔ جس سے قاری کو ان کرداروں کے درد مایوسی اور بے کیفی و بے یقینی کی کیفیت کا انداز ہوتا ہے

الطاف فاطمہ کے دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے دو افسانے "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام" اور "دید اور دید" کردار نگاری کے حوالے سے بھی بہت اہم ہیں۔ان افسانوں کے کردار زندگی کی ایسی حقیقتیں اور صداقتیں لیے ہوئے ہیں جنہیں ہم عام زندگی میں نظر انداز ہی کر دیتے ہیں۔ یہ عام سی حقیقتیں جب ان افسانوں کے کرداروں کی صورت ہمارے سامنے آتی ہیں۔ تو نہ صرف ان کی معنویت بڑھتی ہے بلکہ قاری مشاہدہ بھی بڑھتا ہے۔ تمام کردار بہت جاندار اور متحرک ہیں۔ مثلاً حناداؤد "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام" میں مرکزی کردار ہے۔اس افسانے میں ۹/۱۱ کا بیان کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے واقعات نے مسلمانوں کا پوری دنیا میں غلط امیج بنایا۔ حناداؤد کا کردار صحیح غلط اور خیر و شر کی پہچان کرنے والا کردار ہے۔ مثلاً وہ مسلمانوں کے بارے میں جب معلومات اکٹھی کر کے ڈائری میں لکھتی ہے:

> "بد قسمت قوم کے ننھے بچے۔ آج تم اس گرم اور تپتی زمین پر بے آسرا کیوں پڑے ہو کیا بہت تھک گئے ہو۔۔۔۔۔۔ سینکشنوں نے تم پر زندگی حرام کر دی تھی۔ پھر بھی زندہ رہے۔ سواب کیا ہے۔ جو پانی اور روشنی نہ ملنے پر پھر بھی جی رہے تھے۔ بس ایک بمباری

پر روٹھ گئے۔ارے یہ کوئی مہلک ہتھیار والے بم نہ تھے۔یہ تو تم کو صبر اور سختیوں سے نجات دینے والے فرینڈلی شاہین ہیں۔اچھا تو دھوئیں اور گرد و غبار کے مرغولوں سے دم گھٹ گیا تو پھر کیا ہوا؟ وہ تم کو نجات دلانے ہی تو آئے تھے۔دیکھو تم پر ان کا کتنا بڑا احسان ہے کہ تم کو ہر فکر اور غم سے نجات دلائی۔"(۸۹)

اسی طرح احمد داؤد "یوں ہی کوئی مل گیا سر شام" کا کردار ہے۔یہ کردار انسانی کیفیات کی غمازی کرتا ہے۔یہ کردار بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھرپور ہے اور جب ۹/۱۱ کے واقعے میں مسلمانوں کو معتوب ٹھہرایا گیا تو اس کے ذہن میں کئی سوالات نے جنم لیا۔اسی طرح ہارون الرشید کا کردار بھی جاندار ہے۔یہ سارے کردار ہمارے معاشرے کی گزشتہ نصف صدی کے معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور جذباتی رجحانات کے عکاس ہیں۔

ان دونوں افسانوں کی تیکنیک بیانیہ ہے۔بیانیہ کا لفظ کہانی کے ہم معنی یا مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔بیانیہ کا اطلاق تمام افسانوی تحریروں پر ہوتا ہے۔

اس افسانے میں حال سے ماضی کی طرف لے جانے والی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

اسی طرح "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام" میں انہوں نے انٹرنیٹ پر ہونے والے دو کرداروں کی ملاقات کو بیان کیا ہے۔کہ کس طرح انٹرنیٹ کے ذریعے انسان اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔انٹرنیٹ سے متعلق جو معلومات بیان کی ہیں وہ ان کے وسیع مطالعے کی دلیل ہیں۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں کے کردار جن کیفیات سے گزرتے ہیں وہ عام انسانوں کے عمومی تجربے کی کیفیات ہیں۔فرد کے روحانی آشوب کی تفہیم کے لیے مختلف زبانوں کا سہارا لیا گیا ہے۔جس سے تحیر کی فضا تشکیل پاتی ہیں۔کرداروں کی پیشکش کے حوالے سے کردار کی نوعیت کے مطابق زبان اور فنی وسائل کا استعمال کیا گیا ہے۔ان افسانوں کے کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ اسی طبقے کی زبان بولتے ہیں۔کردار کی زبان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔کہ فلاں کردار کس ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔"دید اور دید" میں بعض جگہ پر کرداروں کے درمیاں مکالماتی انداز گفتگو بیان کیا گیا ہے۔جس سے ان کی نفسیات، ان کے مزاج اور افسانے کے پلاٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ان مکالموں کے ذریعے سے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

مبین مرزا کے افسانوں میں کرداروں کے درمیان گفتگو مکالموں کی صورت میں دکھائی گئی ہے جن سے تمام کرداروں کی نفسیات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے مزاج کا پتا چلا چلتا ہے مکالمے کرداروں کی ساخت کے مطابق ہوتے ہیں جن سے کرداروں کے احساسات وجذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

"کیا جو تم بتانے والی ہو۔ وہ تمہاری ذات سے متعلق ہے ی اکچھ اور؟ ہاں وہ میرے بارے میں ہے اور کچھ تمہارے بارے میں بھی لیکن اپنے بارے میں تو تم بہت کچھ مجھے پہلے کی بتا چکی ہو" "میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور جو بتایا ہے وہ درست نہیں"۔ وہ تیزی سے بولی، اور جو آج بتاؤ گی کیا وہ۔۔۔" خالد تلخی سے کہتے کہتے رک گیا-" (۹۰)

افسانوں میں کردار بہت فعال ہیں جو کہ زندی، حقیقی اور ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ انہی کرداروں کی زبان معاشرے کے بگاڑ م اور سماجی برائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں ہر کردار انفرادی خصوصیت کا مالک سو ہے کہیں پر افسانہ نگار نے صیغہ واحد متکلم میں کردار پیش کیے ہیں اس سے کہانی میں حقیقت کا رنگ بھر جاتا ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں معاشرے میں پھیلی بد امنی سے جس طرح انسانی زندگی مفلوک ہوتی جارہی ہے۔ اس کی مکمل منظر کشی کی گئی ہے افسانہ نگار کا اسلوب دراصل ان کے تخیل کی بلند پرداری ہے۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر استفہامیہ بیان ملتا ہے مکالموں کی صوت میں کردار آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

"لیکن ماما سائنس کی کتاب میں لکھا ہے کہ جب زندہ Flesh کٹتا ہے تو اس میں دھوان نکلتا ہے۔ یہ دیکھیں دھواں یہ۔۔۔۔ یہ دیکھیں " لمکن یہ دھواں تو ان گھروں اور بازاروں کے جلنے کا ہے۔ جنہیں Horror سیریل میں ناظرین کو خوفزدہ کرنے کے لیے آگ لگائی گئی ہے۔"(۹۱)

حمید شاہد کے افسانوں میں ۹/۱۱ کے کردار نگاری پر اثرات کی بہت سی مثالیں ملتی ہے "موت منڈی" "خونی لام ہوا قتلام بچوں کا"، "مرگ زار"، "سورگ میں سئور" "، "برف کا گھونسلا" وغیرہ۔ تقریباً تمام افسانوں کے کردار اس سانحہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کے کردار خوف، تشدد اور دہشت کی کہانی اپنی زبانی پیش کرتے ہیں۔ خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، سانحہ پشاور کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ آپ غم زدہ ماں کا نوحہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"بیٹا انیس، جس عمر میں تمھارے ابا کے سر پر سنہرے تاروں والا سہرا سجا تھا۔ عین اس عمر میں تمھارے معصوم بیٹے کی لہو میں لتھڑی ہوئی لاش میں نے اس گھر کے صحن میں دیکھی ہے۔ ہائے کہ یہ لاش دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی تھی۔"(۸۷)

توقیر کے باغیانہ کردار کو افسانہ نگار اس طرح بیان کرتا ہے

"میں پھٹ جاااااوں دا۔۔۔۔۔۔ میں پھٹ جاوں دااااا"

اس کے پیچھے ایک شور مچ گیا تھا

"خود کش آ گیا خود کش آ گیا"۔

وہ اس شور شرابے سے اور پر جوش ہو گیا۔ حتی کہ وہ جامع مسجد والے چوک میں پہنچ گیا۔ سانحہ پشاور کے بعد اب وہاں بھی پولیس والے کی ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ سپاہی چوکنا ہو گیا کہ اسی عمر کے نوجوان دھماکے سے پھٹ جایا کرتے تھے۔ توقیر کی نظر اُس پر پڑی، تو ٹھٹھک کر رکا، پھر یہ سوچ کر جی ہی جی خوش ہوا کہ وردی والے کو ڈرانے میں بہت مزا آئے گا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی جانب لپک رہا تھا۔ پولیس والا واقعی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر بندوق سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔"(۹۳)

محمد حمید شاہد نے دہشت گردی کے موضوع پر شعوری طور پر بے حد عمدہ افسانے تحریر کیے ہیں۔ اس لیے ان افسانوں کا ایک ایک کردار اپنی اپنی کہانی بہت صورتی سے بیان کرتا ہے۔ ایک معصوم بچے کا اس قدر سفاک عمل ہمارے اس ظالم معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں آئے روز یہ واقعات معمول بن چکے ہیں اور ظلم کو کوئی ظلم سمجھا ہی نہیں اور خوف جیسا عنصر ہی ناپید ہو چکا ہے۔

"طلال رند ایک لمحے کے لیے رکا تو جیسے ہماری سانسیں بھی رک گئی تھیں۔ اس نے کلیم خان کی جانب دیکھا اور ایک ایک لفظ چبا کر کہا: "خان صاحب آپ کے افسر ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں بہ حفاظت کوئٹہ پہنچانا آپ کو سونپتا ہوں۔ کلیم خان کے لیے یوں پکارا جانا جیسے غیر متوقع تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور کہا، جی جی یقیناً اور پھر میری جانب دیکھا اور اسی ہڑبڑاہٹ میں کہا، چلیں جناب۔"(۹۴)

حمید شاہد کے کرداروں میں ایک عجیب سی ویرانی اور خوف ہے۔ جو کہ اس معاشرے کے کھوکھلے پن کا ثبوت ہے۔ اس کے افسانے کی بنت، کردار اور کہانی سبھی قاری پر اپنی گرفت قائم رکھنا جانتے ہیں۔

الغرض درج بالا ان افسانوں کی ساخت، کہانی کی بنت، اسلوب، تکنیک، وحدت تاثر، کردار نگاری، زبان و بیان اور جامعیت یہ تمام ایسے اجزاء ہیں جو دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے۔ افسانوں کے اعلیٰ معیار کی دلیل میں اس دور کے افسانہ نگار سیاسی و سماجی مسائل، دہشت گردی جیسے ناسور، فرد کی لاچاری و بے بسی اور

اس کی سوچ اور اس کی بنیادی ضرورت کو متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے فن کے لوازمات کے ساتھ حاصل شدہ بصیرت اور عرفان و آگہی کو قاری تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

آج کا اردو ادب متنوع موضوعات کا حامل ہے۔ جس میں شاعری، ناول، افسانہ اور تنقید میں بیسویں صدی کے مزاحمتی رنگ کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

رومانیت کی صورت میں فطرت پسندی ہو یا پھر اقدار اور سماجی بندھنوں کے نام پر مجبور عوام کے دلی جذبات کا اظہار ہو، تقسیم ہند کے فسادات ہوں یا فوجی آمریت کا زمانہ، اردو افسانے نے ان تمام موضوعات کا احاطہ بطریق احسن کیا ہے۔ ان موضوعات میں سے دہشت گردی عصر رواں کا سب سے اہم موضوع بن چکا ہے۔ ۹/۱۱ کے استعارے نے اردو افسانے کی فضا پر ایک طویل عرصے سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ اردو افسانے میں دہشت گردی کا یہ استعارہ قتل و غارت گری، تباہی و بربادی، خون خرابہ، دہشت و وحشت، منافرت و منافقت، فرسٹریشن اور کنفیوژن کی علامت کے طور پر کھڑا کیا ہے۔ ۹/۱۱ کے سانحے کا جو نقصان پاکستان میں دہشت گردی کی صورت میں ہوا اس سے ہمارے معاشرے کے حساس ترین لوگ یعنی لکھاری اور ادیب اس کے تماشائی نہ تھے۔ بل کہ وہ تو اس طوفان سے خود گزرے تھے۔ اردو ادب میں بھی دیگر زبانوں کی طرح مزاحمتی رجحان کا آغاز ہوا۔ جس نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانیت کی تباہی و بربادی اور تذلیل کے خلاف احتجاج کی صدائیں بلند کیں۔ یہ مزاحمتی رویہ کسی مخصوص حکومت یا گروہ کے خلاف نہ تھا بل کہ اجتماعی اور انفرادی ہر قسم کے معاشی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی استحصال کے خلاف تھا۔

دہشت گردی اور بالخصوص ۹/۱۱ کے سانحے کے بعد کے افسانوں میں لوگوں کی نفسیاتی صورت حال کو جس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ دراصل ہمارے معاشرے کی حقیقی تصویر ہے۔ انسان میں مسرت و خوشی کی جگہ خوف و دہشت نے گھر کر لیا ہے۔ انسان معاشرے سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ خوف کی لپیٹ میں "پگلی" کی دوڑ ہو یا پھر وحشت زدہ ماحول میں پنگھوڑے میں سے سرہانے کو معصوم بچہ سمجھ کر اٹھانے کا منظر ہو۔ آئے روز بم دھماکوں کے خوف کی کیفیت ہو یا پھر افسانہ "ماں" میں سوات میں سوگوار ماحول۔ خدا کو راضی کرنے والا انسان جو دین کی امن و سلامتی کا علم بردار کہلاتا ہے شیخ سخاوت کی طرح وہ بھی ایک عجیب سے وسوسے، خوف اور ڈر کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ یہی دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانے کا موضوع ہے۔ عہد حاضر کے تقریباً تمام افسانے اسی ڈر، خوف اور کنفیوژن کو پیش کرتے ہیں۔ جو کہ ہمارے معاشرے کو لاحق ہو چکے ہیں۔ ۹/۱۱ کی قیامت نے اردو ادب کو جو موضوع دیا ہے۔ ان میں ایک اہم موضوع جنگ ہے۔ عجیب صورت حال

ہے کہ فکشن اور شاعری میں محبت ، دوستی ، رنگینی ، امن ، محاکمہ خوشی اور آشتی کے موضوعات کی جگہ اب بم دھماکے ، بارود ، خون ، جنگوں اور سازشوں کے موضوعات رائج ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں لڑی جانے والی غیروں کی جنگ میں نہ جانے کتنے معصوم لقمہ اجل بنتے رہیں گئے ، ہماری نوجوان نسل میں خوف وہراس گھر کرتی جارہی ہے۔ جو معلوم نہیں کس انجام سے دوچار کرے گی۔ ۹/۱۱ کے سانحے نے جس طرح انسانی زندگی کو مفلوج کیا ہے۔ اس سے نہ جانے کتنی خون چکاں کہانیوں نے جنم لیااور کتنے واقعات قلم بند ہوئے اور کتنی کہانیاں ان کہی رہ گئیں۔ بے شمار کہانیاں تو کرب اور اضطراب کی وجہ سے ناگفتہ بہ ہیں کہ ان کو سنانے اور سننے کی ہمت نہ تو زبان میں ہے اور نہ ہی لکھنے والوں کے نوک قلم میں۔ اس سانحے نے فرد ، معاشرے ، خاندان ، براعظم ، کائنات ، ملک اور چرند پرند کو بھی متاثر کیا ہے۔

آج کے افسانے میں واقعاتی حقائق کو افسانوی صورت میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ نائن الیون کے سانحے کے بعد کا منظر نامہ پہلے جیسا نہیں۔ اس میں حقیقتیں اپنے آپ ہی آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں جو کہ ہمارے ادیبوں کی تحاریر کا موضوع بنتی گئی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ Standard English Urdu Dictionary, baba-e-Urdu Abdul Haq, Dictionaries Publiscations, Delhi. 6

۲۔ علی زماد قتیبی، ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۱۶، ص: ۱۳۳

۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، رشید امجد، عام آدمی کا صورت گر، مشمولہ۔ رشید امجد: ایک مطالعہ (مرتب) شفیق انجم۔ نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء ص ۳۱۲

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شہر گریہ، صحرا کہیں جسے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۲ء، ص ۴۷

۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر شہر گریہ، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، مارچ، ۲۰۱۶ء، ص ۹

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر پژمردہ کا تبسم، مشمولہ گملے میں اگا ہوا شہر، اشاعت اول، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، مئی ۲۰۱۵ء، ص ۲۴۴-۲۴۳

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مجال خواب، مشمولہ سمبل، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۶

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو کے پچاس سال، مشمولہ، اوراق، جنوری تا جون، ۱۹۷۹ء، ص ۲۸۹

۹۔ ساجدہ شاہین، رشید امجد بحیثیت افسانہ نگار، مقالہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۸۲ء، ص ۳۶

۱۰۔ رشید امجد، شہر گریہ، ص ۲۱

۱۱۔ رشید امجد، پژمردہ کا تبسم، ص ۲۳۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۱۳۔ احمد اعجاز (مرتب)، رشید امجد کے منتخب افسانے، پورب اکادمی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۱۴۔ خالدہ حسین، ابن آدم، مرتبہ، نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، انتخاب و تجزیہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۶۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، مشمولہ رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۳

۱۷۔ زاہدہ حنا، رقص مقابر، مشمولہ رقص بسمل ہے، ص ۵۷

۱۸- زاہدہ حنا، قیدی سانس لیتا ہے، دیباچہ، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱

۱۹- زاہدہ حنا، رقص مقابر، ص ۹۵

۲۰۔ زاہدہ حنا، کم کم بہت آرام سے ہے، مشمولہ رقص بسمل ہے، 1 ای۔ جنید پلازہ، راشد منہاس روڈ، گلشن اقبال بلاک 6 کراچی، ۲۰۱۷ء ص ۱۴۹

۲۱- زاہدہ حنا: تنہائی کے مکان میں، مشمولہ تیلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز، لیک روڈ لاہور، ۲۰۱۷، ص ۲۵۴

۲۲- محمد فیروز شاہ، خلا اندر خلا، ص ۱۹۲

۲۳- منشایاد، ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ، ص ۲۲۱

۲۴- ایضاً، ص ۲۲۲

۲۵- ایضاً، ص ۲۱۹

۲۶- انتظار حسین، مشمولہ ایک عظیم افسانہ نگار منشایاد، مرتب، ڈاکٹر ارشد خانم، ادارہ فروغ قوم اردو زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء ص ۱۶

۲۷- الطاف فاطمہ، دید وادید، مشمولہ ۹/۱۱ پاکستان اردو افسانہ انتخاب و تجزیہ، نجیبہ عارف، ص ۵۷

۲۸- الطاف فاطمہ، دید اور دید، ص ۶۲

۲۹۔ مبین مرزا، یہی تو ہے زندگی، ص ۱۰۹

۳۰۔ مبین مرزا، یہی تو ہے زندگی، ص ۱۳۱

۳۱۔ مبین مرزا، دام وحشت، مشمولہ خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۹

۳۲- مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص ۵۹

۳۳- مبین مرزا، سفید پردہ، خوف کے آسمان تلے، ص ۴۲

۳۴۔ مبین مرزا، سفید پردہ، خوف کے آسمان تلے، ص ۴۲

۳۵- مبین مرزا، ٹھہرے ہوئے وقت میں، مشمولہ زمینیں اور زمانے، ص ۱۰۶

۳۶- مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص ۱۸۳

۳۷۔ مبین مرزا، پرچی اور داستان، ص ۱۸۴-۱۸۳

۳۸- مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص ۱۷

۳۹- مبین مرزا، خواب ہارا آدمی، ص ۱۳۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۴۱- ایضاً، ص ۱۴۴

۴۲۔ طاہرہ اقبال، یا پروردگار، مشمولہ گنجی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۴

۴۳- طاہرہ اقبال، واکنگ ٹریک۔۔۔ دو کلو میٹر، ص ۱۵۶

۴۴۔ طاہرہ اقبال، واکنگ ٹریک۔۔۔ دو کلو میٹر، ص ۱۵۲

۴۵۔ طاہرہ اقبال، سلیپنگ بیوٹی، ص ۱۷۲

۴۶۔ طاہرہ اقبال، جنگل سکرین، ص ۱۹۰

۴۷۔ محمد حمید شاہد، سورگ میں سئور، مشمولہ دہشت میں محبت، بک کارنر پبلشرز، جہلم، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۹، ۱۴۸

۴۸۔ محمد حمید شاہد، برف کا گھونسلا، ص ۱۵۷

۴۹۔ محمد حمید شاہد، لوتھ، ص ۱۲۰-۱۱۹

۵۰۔ محمد حمید شاہد، موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ، مشمولہ دہشت میں محبت، ص ۱۰۲

۵۱۔ محمد حمید شاہد، سورگ میں سئور، ص ۱۴۶

۵۲Oxford Advance Dictionary of current English, forth Edition,P 1319

۵۳۔ محمد احسن فاروقی، فکشن اور تکنیک، مشمولہ سیپ، شمارہ ۲۹، ص ۱۹۳

۵۴۔ عبدالمغنی، افسانے میں تکنیک مشمولہ نقطہ نظر، کتاب منزل، پٹنہ نمبر ۴، ۱۹۶۵ء، ص ۶۳

۵۵۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، ریز پبلی کیشنز، راول پنڈی، طبع اول، جون ۲۰۰۳ء، ص ۲۱

۵۶۔ رشید امجد، ایک پرانی کہانی جیسے دوبارہ لکھا گیا، ص ۸۳

۵۷۔ ایضاً، ص ۸۶

۵۸۔ رشید امجد، پژمردہ کا تبسم، ص ۲۴۰

۵۹۔ قاضی عابد، ڈاکٹر؛ اردو افسانہ اور اساطیر، شعبہ اردو، زکریا یونیورسٹی، ملتان، طبع۔اول، ۲۰۰۲، ص ۶۵

۶۰۔ فتح محمد ملک، خالدہ حسین کا صوفیانہ انداز نظر، مشمولہ، تحسین و تردید، ص۹۹

۶۱۔ منشا یاد، ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ، مشمولہ، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، ورڈ میٹ، اسلام آباد، ۲۰۱۰، ص۶۸

۶۲۔ ایضاً، ص۶۶

۶۳۔ ایضاً، ص۵۲

۶۴۔ الطاف فاطمہ، دید و ادید، مشمولہ، 9/11 پاکستان اردو افسانہ انتخاب و تجزیہ، نجیبہ عارف، ص۵۷

۶۵۔ ایضاً، ص۵۱

۶۶۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص۶۰

۶۷۔ مبین مرزا، دام وحشت، ص۸۰

۶۸۔ طاہرہ اقبال، سلیپنگ بیوٹی، ص۲۶۴

۶۹۔ طاہر اقبال، یا پروردگار، ص۲۱۰

۷۰۔ طاہرہ اقبال، جنگل اسکرین، ص۱۸۸

۷۱۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، ص۱۹-۲۰

۷۲۔ محمد حمید شاہد، مرگ زار، ص۸۳

۷۳۔ مسعود مفتی، شناخت، مشمولہ، ۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ انتخاب و تجزیہ۔ ص۷۷

۷۴۔ الطاف فاطمہ، یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام، مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص۲۰

۷۵۔ الطاف فاطمہ، یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام، مشمولہ ماہنامہ، ادب لطیف، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص۱۳

۷۶۔ خالدہ حسین، ابن آدم، مشمولہ ماہنامہ، ادب لطیف، لاہور، اکتوبر، ۲۰۰۳ء ص۱۰۶

۷۷۔ خالدہ حسین، ابن آدم، مشمولہ ماہنامہ، ادب لطیف، لاہور، اکتوبر، ۲۰۰۳ء ص۱۰۷

۷۸۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر: اردو مختصر افسانہ، فنی و تیکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص۲۱۷۔

۷۹۔ منشا یاد، ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ، مشمولہ اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۶۴

۸۰۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، ص ۲۱۴

۸۱۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، ص ۲۰۷

۸۲۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، ص ۲۰۳

۸۳۔ مبین مرزا، ٹھہرے ہوئے وقت میں، ص ۹۹

۸۴۔ مبین مرزا، یہی تو ہے زندگی، ص ۱۱۹

۸۵۔ طاہرہ اقبال، جنگل سکرین، مشمولہ ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۱۸۹

۸۶۔ طاہرہ اقبال، سلیپنگ بیوٹی، ص ۲۶۵

۸۷۔ طاہرہ اقبال، واکنگ ٹریک۔۔۔ دو کلو میٹر، ص ۱۵۲۔۱۵۱

۸۸۔ زاہدہ حنا، نیند کا زرد لباس، ص ۲۱۶

۸۹۔ ایضاً،

۹۰۔ الطاف فاطمہ، یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام، مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۳

۹۱۔ مبین مرزا، ٹھہرے ہوئے وقت میں، ص ۹۹

۹۲۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، ص ۲۱

۹۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۹۴۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک، ص ۴۰۔۳۹

باب چہارم

مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

ادب زندگی کا عکاس ہے۔ایک تخلیق کار یا فن کار ادب کو ذریعہ اظہار بنا کر اپنے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اور زندگی کے مختلف تجربات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے۔ کبھی ان احساسات و خیالات کا اظہار وہ شاعری کی صورت میں کرتا ہے تو کبھی نثر میں۔ نثر میں اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ جن میں دور حاضر میں افسانے کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔اردو افسانے نے یہاں پہنچتے پہنچتے سو برس کی طویل مسافت طے کی ہے ۔ادب میں افسانوی نثر اور کہانی کی روایت بہت قدیم ہے۔اردو افسانہ مغرب سے مستعار لی ہوئی صنف ادب ہے۔ جس نے یہاں آتے ہی مقبولیت کی تمام حدیں پار کر لیں۔ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جو اختصار کے باوجود زیست کا مکمل مشاہدہ و مطالعہ کرتی ہے۔ایک افسانہ نگار اسی معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور اس کا تعلق ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ بہت گہرا ہوتا ہے۔ تخیل کی بلند پردازی تک پہنچتے پہنچتے اسے مختلف حالات واقعات اور کیفیات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔اسی تخیل کی جولانی سے وہ اپنے قالب میں ڈھال کر قاری تک پہنچاتا ہے۔ایک فن کار کے تجربات دراصل کل انسانیت کے تجربات ہیں جن کا تعلق براہ راست بنی نوع انسان اور اس کی زندگی کے ساتھ ہے۔ایک تخلیق کار نہایت حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن کے ذریعے نہ صرف زندگی کی ان پرتوں سے پردہ اٹھاتا ہے بلکہ تاریخی، تہذیبی، سماجی، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی شعور کو بھی ابھارتا ہے۔ آج کے دور میں مختصر افسانے نے فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔اردو افسانے کی داغ بیل بیسویں صدی میں رکھی گئی جب اردو افسانے کا آغاز وارتقاء ہوا تو برصغیر کے سیاسی و سماجی منظر نامے میں تبدیلی کی نئی لہر شروع ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے مقامی و عالمی پیمانے پر انقلابی تحریک نے جبر اور جمود کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی اور بیسویں صدی کے نصف اول میں زندگی کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں انحراف و تصادم کے رویے بھی سر اٹھانے لگے۔ بیسویں صدی تاریخ عالم میں بہت تبدیلیوں کی مظہر ٹھہری کیوں کہ دونوں عظیم جنگیں اسی صدی میں وقوع پذیر ہوئیں جن کی وجہ سے پوری انسانیت متاثر ہوئی۔ ظلم و بربریت کی داستانیں رقم ہوئیں جن کی وجہ سے ساری دنیا متاثر ہوئی۔ سائنس نے جہاں برق رفتاری سے ترقی کی، انسانی رویوں اور اقدار میں اتنی زیادہ تنزلی دیکھنے میں آئی۔انسانیت کو پامال کر دیا گیا۔انسان کو انسان نے طاقت کے زور پر جبر اور

تشدد کی کھائی میں دھکیل دیا۔ گولہ بارود سے اڑتے جسم ،ادھڑی ہوئی لاشیں، ریزہ ریزہ تمناؤں میں چھلنی ہوتے احساس، بکھرتے ارادے، غرض دونوں عظیم جنگوں نے انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا۔اس کے بعد تقسیم ہند کے فسادات نے بر صغیر پاک و ہند کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو بدل دیا۔اردو افسانہ ان حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا یہاں تک آن پہنچا۔اکیسویں صدی کی ابتداء میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا اوہناک سانحہ پیش آیا۔یہ واقعہ نہ صرف عالمی سطح پر اثر انداز ہوا بل کہ پاکستان پر بھی سیاسی ،سماجی ،ادبی اور تاریخی سطح پر اس کے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو ادب پر ان حالات نے دور رس اثرات مرتب کیے اور کلاسیکی دور سے اب تک ہر ادیب اور شاعر کی تحریروں میں اس دور کے ملکی اور سیاسی و سماجی مسائل کا عکس ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ۹/۱۱ کے المناک واقعے پر بہت سے ادیبوں نے بہترین ادب تخلیق کیا۔نائن الیون زم کے دور رس اثرات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، بالکل اسی طرح اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ان اثرات کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔نامور افسانہ نگاروں نے امریکی رویے، مسلمانوں پر الزامات کی بوچھاڑ ، بڑی عالمی قوتوں کے تیسری دنیا پر جبر اور تسلط ، بدامنی ، انتشار، خودکش دھماکوں اور حد درجہ بڑھتی ہوئی دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔بہت سے افسانہ نگاروں نے براہ راست دہشت گردی کے عفریت کو موضوع بنایا۔ ان افسانہ نگاروں میں الطاف فاطمہ ،خالدہ حسین ،زاہدہ حنا، منشایاد، مسعود مفتی، رشید امجد، حمید شاہد، مبین مرزا،اور طاہرہ اقبال قابل ذکر ہیں۔۹/۱۱ کے تناظر میں جو افسانے لکھے گئے ان میں "دید وادید"، "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر شام"(الطاف فاطمہ)،"ابن آدم"(خالدہ حسین)،"رقص مقابر"(زاہدہ حنا)،" شناخت" (مسعود مفتی)،"مجال خواب" (رشید امجد)،"سورگ میں سور"(محمد حمید شاہد) اور "خواب ہارا آدمی" (مبین مرزا)وغیرہ شامل ہیں۔

اس اہم واقعے کے علاوہ دہشت گردی سے متعلقہ دیگر پہلوؤں کو بھی افسانوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں خاص طور پر پاکستان میں خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی لہر، افغانستان پر امریکی تسلط اور بمباری، غربت و افلاس، جہاد کے نام پر معصوم لوگوں کو اکسانے والی نام نہاد جہادی تنظیموں کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ بات تو مبنی بر حق ہے کہ دور حاضر میں دہشت گردی سب سے اہم موضوع بن گیا ہے۔اس کے اثرات سے دنیا کا کوئی گوشہ بھی محفوظ نہیں رہا۔آج تمام ممالک اسی ایک مسئلے پر قابو پانے میں ناکام ہوتے جارہے ہیں اور دہشت گردی نے جو خوفناک صورتحال اختیار کرلی ہے۔وہ لمحہ فکریہ ہے۔عالمی طاقتوں نے

مسلمانوں اور اسلام کے خلاف محاذ کھول دیا ہے اور وہ ہر حال میں مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کے در پے ہیں۔ان کا قتل عام کیا جارہا ہے۔ مغربی قوتیں اور امریکہ ایک فورم پر متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف ایک ایجنڈے کی پاسداری کر رہے ہیں۔ فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر پر ہونے والے حملے اور مظالم عالمی قوتوں کے باہم اتحاد کی وجہ سے شدت اختیار کرتے جارہے ہیں۔انسانیت سوز مظالم کیے جارہے ہیں اور کمزور ممالک اور اقوام کو اپنا دست نگر بنانے کی سعی کی جارہی ہے۔اس عالمی بے حسی کی وجہ سے ان کمزور اور مجبور انسانوں کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں۔ ہر کوئی طاقتور کے عتاب سے خوف زدہ ہو کر خاموش رہنے میں ہی مصلحت سمجھ رہا ہے۔آگ اور خون کی ہولی تسلسل سے جاری وساری ہے۔ درحقیقت عصر حاضر میں دہشت گردی کسی ایک ملک یا قوم کا مسئلہ نہیں بل کہ یہ عالمی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے نام پر آج تیسری دنیا کے ممالک لاچاری اور بے بسی کے عالم میں مغربی تسلط اور سامراجیت کا شکار ہیں۔ اس سب کی وجہ سے ان ملکوں کا معاشی سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔انتشار اور افراتفری سے ان ملکوں کی سالمیت خطرے میں ہے۔ محدود علاقائی محاذ آرائی، ہمسایہ ممالک کی باہمی کشیدگی، دہشت گردی اور فرقہ واریت کا فروغ سامراجیت کی عکاسی کرتا ہے۔ان حالات وواقعات نے پاکستان کو بھی بُری طرح متاثر کیا ہے۔افغانستان میں خانہ جنگی کی وجہ سے ہماری ملکی سالمیت اور امن وسکون تباہی کے دہانے پر ہے۔ طالبان، داعش اور القاعدہ تنظیمیں بنا کر پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ پاکستان میں قبائلی علاقوں میں ان لوگوں کی موجودگی پاکستان کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ بعض بیرونی شر پسند عناصر اس کو امن کا گہوارہ بنانے کے بجائے اس کے امن وسکون کو برباد کرنے پر مصر ہیں۔اس کے علاوہ معاشرے میں بڑھتا ہوا ظلم، ناانصافی، بدامنی اور غربت و افلاس دہشت گردی کو ہوا دے رہے ہیں۔ جہالت، پسماندگی، انتہا پسندی اور دین سے دوری بھی دہشت گردی کی اصل وجوہات ہیں۔

اردو افسانے میں ۱۹۶۰ء کے بعد علامت و تجریدیت کے فن نے نئی جہت عطا کی۔ علامتی افسانے کا آغاز انتظار حسین اور انور سجاد سے ہوا اور آج اس کے علمبرداروں میں رشید امجد، الطاف فاطمہ، منشا یاد، محمد حمید شاہد، اور مبین مرزا شامل ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے علامتوں کے پیرائے میں مختلف موضوعات کو پیش کیا اور قاری کی توجہ مبذول کرائی۔ سیاسی جبر و تشدد کے حوالے سے بھی بہت سے افسانے لکھے گئے۔ جن میں سیاسی صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے سیاسی و سماجی موضوعات پر عصری زندگی کی ہمہ جہتی، انسان کی تحقیر اور بے مائیگی، ظلم و بربریت، سیاسی خلفشار، اعلیٰ اقدار کی شکست، طبقاتی کشمکش اور اس طرح کے

بے شمار مسائل نے اردو افسانے کو نئی منزلوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ آج کے افسانے میں تبدیلی کے آثار واضح نظر آتے ہیں۔ اس میں کہانی پن پر توجہ دی گئی ہے اور بیانیہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب پر توجہ دی گئی ہے۔

پاکستان کو فی زمانہ جن مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں انتہا پسندی اور فرقہ واریت سر فہرست ہیں۔ اس صدی میں دہشت گردی لوٹ کھسوٹ، بم دھماکوں اور ڈاکہ زنی جیسے واقعات نے ہر کس و ناکس کو متاثر کیا ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں مثلاً کراچی، کوئٹہ اور لاہور وغیرہ میں آئے روز کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے ۔ افسانہ نگاروں نے ان سانحوں پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ کراچی کے خراب حالات کا تذکرہ بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ اس پر مبین مرزا کا افسانہ "خوف کے آسمان تلے" اہمیت کا حامل ہے۔ سانحہ پشاور پر محمد حمید شاہد کا افسانہ "خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، قابل ذکر ہیں۔ گردش ایام جب وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تو زندگی ایک شدید المیے اور سانحے میں داخل ہو جاتی ہے۔ لاتعداد لوگ جو بالکل بے قصور ہوتے ہیں چند قوموں یا ممالک کی حاکمیت اور اقتدار کی جنگ کا شکار بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں بھونچال سا آجاتا ہے اور خوشحالی اور آسودگی، مفلوک الحالی جیسے صدمات سے مدغم ہو جاتی ہے۔ ایک قوم تو فاتح ٹھہرتی ہے اور مفتوح کے خون سے اس کی فتوحات کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر تاریخ کی کامیابیوں کو ہی تاریخ کے اوراق میں رقم کر دیا جاتا ہے ۔ یہ تخلیق کار ہی ہوتا ہے جو ان مرنے والوں کی ہڈبیتی کو بیان کرتا ہے۔ اس ضمن میں مسعود مفتی کا افسانہ "قیامت" اور رشید امجد کا افسانہ "پژمردہ کا تبسم" قابل ذکر ہیں۔

عہد حاضر میں دہشت گردی کوئی ایک دن کی پیداوار نہیں بل کہ اس کی پرورش اور نمو میں بے شمار برسوں کا عرصہ محیط ہے۔ فی زمانہ دہشت گردی کے واقعات میں سفاکی اور رعونت کی داستانیں رقم کی جارہی ہیں اور انسانیت کا چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح روند دیئے جاتے ہیں اور معاشرے کی بے حسی عروج پر پہنچ چکی ہے۔ دہشت گردی کے حوالے سے رشید امجد کے افسانے "شہر گریہ"، "مجال خواب" اور "رات" اپنی مثال آپ ہیں جن میں علامتوں کے ذریعے دہشت گردی اور اس سے ہونے والی تباہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دہشت گردی اور بدامنی جیسے واقعات میں جانی و مالی نقصان کے ساتھ ساتھ زندہ بچ جانے والے لوگ ساری زندگی کے لیے خوف اور دہشت میں زندگی گزار دیتے ہیں انسان کو ہر لمحہ یہی خوف گھیرے رہتا ہے کہ آنے والا پل کیا امتحان لے گا۔ ان واقعات کے بارے سن کر اور میڈیا پر دیکھ دیکھ کر لوگ نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ کیوں کہ دہشت گردی نے انسانی نفسیات کو بری

طرح متاثر کیا ہے۔اس موضوع پر مبین مرزا نے افسانہ "دام وحشت" لکھا ہے۔ جس میں دہشت گردی کے انسانی نفسیات پر اثرات کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

نائن الیون کے سانحے کے بعد حالات نے یک دم کروٹ بدل لی اور ایک نئے ورلڈ آرڈر کا آغاز ہوا۔ عرصہ دراز سے چلتی ہوئی عام زندگی کا قرینہ ہی بدل گیا۔ سارا سیاسی، عالمی اور سماجی سسٹم تہس نہس ہو گیا جس سے پورا عالمی منظر نامہ بدل کر رہ گیا۔اس تبدیلی نے نہ صرف اہل مغرب کے ہاں قدم جمائے بل کہ اردو ادب میں بھی بہت سے ادیبوں نے اس کے اثرات قبول کیے۔اس دہشت گردی اور جنگوں کے متعلق بہت سے تخلیق کاروں نے قلم اٹھایا۔ عراق اور افغانستان جنگ کے بعد ہمارے ہاں دہشت گردی کا طوفان برپا ہو چکا ہے۔ جس نے نہ صرف انفرادی بل کہ اجتماعی سطح پر انسانوں کی سوچ کا دھارا ہی یکسر بدل دیا ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں نے براہ راست ۹/۱۱ پر قابل قدر افسانے تحریر کیے۔ان میں محمد حمید شاہد خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر افسانے ۹/۱۱ کے سانحے کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ خاص طور پر ان کا افسانوی مجموعہ "دہشت میں محبت" نائن الیون اور دہشت گردی کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ اس مجموعے میں "گانٹھ"، "سورگ میں سور"، "لوتھ" اور "برف کا گھونسلا" قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے اپنی نوعیت کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔افسانہ نگار نے دہشت گردی جیسے موضوع کو اسلوب کے بہترین پیرائے میں ڈھال کر اردو ادب میں ایک عظیم اضافہ کیا ہے۔ محمد حمید شاہد کے علاوہ زاہدہ حنا اور خالدہ حسین نے بھی ۹/۱۱ کے واقعے کو موضوع بنا کر بہترین افسانے تخلیق کیے خالدہ حسین کا افسانہ "ابن آدم" اور "جزیرہ" اسی موضوع پر تخلیق کیے گئے ہیں۔ یہ افسانے پیغام کی داخلی لہر سے روشناس نظر آتے ہیں۔ تکنیکی سطح پر ان کے افسانے میں استعارات اور علامت و تجریدیت کا استعمال کیا گیا ہے جس سے معنویت کے کئی جہاں منصہ شہود پر ملتے ہیں۔ان افسانوں میں عراق اور امریکہ کے درمیان ہونے والی جنگ کو موضوع بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کو جس طرح گوانتاناموبے کے جیل میں زدوکوب کیا گیا ظلم کے پہاڑ توڑے دیے گئے۔اس کے پس منظر میں "جزیرہ" کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ جنگ سے پیدا ہونے والا المیہ ہی دراصل اس افسانے کا موضوع ہے۔ زاہدہ حنا نے امریکہ اور افغانستان جنگ اور اس سے ہونے والی ہولناک تباہی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانے "کُم کُم بہت آرام سے ہے"، "نیند کا زرد لباس" اور "رقص مقابر" میں انہوں نے امریکہ افغانستان جنگ اور وہاں کے لوگوں کو درپیش مسائل اور صعوبتوں کو مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے۔

نام نہاد جہادی تنظیمیں جہاد کے نام پر معصوم لوگوں خاص کر نوجوانوں لڑکوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان کو دہشت گردی جیسے گھناؤنے فعل کا مرتکب کرتی ہیں وہ ان لوگوں کی برین واشنگ کر کے ان کو جنت اور حوروں کا لالچ دے کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں اور ان کو کسی بھی جگہ خود کش حملوں کے لیے تیار کرتی ہیں۔ یہ معصوم لوگ اپنی معصومیت کی مار کھا کر ان تنظیموں یا لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے ہیں اور بنا کسی خوف کے موت کی وادی میں بے شمار نہتے اور بے گناہ لوگوں کو دھکیل کر خود بھی جہنم واصل ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو مذہب کے نام پر اس طرح کے مذموم عزائم کی عمل کے لیے ٹریننگ دی جاتی ہے اور ان کے ذریعے دہشت گردی کے واقعات میں خود کش بم دھماکے کرا کے سیکڑوں جانیں لے لی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں وہ لوگ باآسانی کھلونا بن جاتے ہیں جو تعلیم سے بے بہرہ ہیں یا پھر غربت و مفلسی کی زندگی سے تنگ آ کر دینی مدرسوں کا رُخ کرتے ہیں۔ وہاں جا کر ان کو بجائے اسلام کی صحیح تعلیم دینے کے دہشت گردی جیسے کریہہ فعل کے لیے اکسایا جاتا ہے اور یہ لوگ باآسانی ان لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مسلمان کہلانے کے قابل نہیں کیوں کہ اسلامی تعلیمات اس سب کے برعکس ہیں۔ اسلام میں کسی مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کو ایذا یا ضرر پہنچانے کا کوئی حق نہیں۔ مگر یہ لوگ بلا عذر اور بے خوف و خطر انسان دشمن اور اسلام دشمن افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف اور صرف انتشار اور خلفشار پہنچانا ہوتا ہے۔ برین واشنگ کر کے جن لوگوں سے بم دھماکے کرائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو صرف اور صرف استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں مذہبی جنون پیدا کیا جاتا ہے اور شہادت حاصل کرنے کی طلب کو افزوں تر کیا جاتا ہے۔ اس سب میں امریکہ نے سب سے پہلے معصوم لوگوں کو خود استعمال کیا اور بعد میں وہی لوگ امریکہ کی نظر میں دشمن بن گے۔ اس سارے واقعے کو منشا یاد نے اپنے افسانوں میں بطور موضوع پیش کیا ہے۔ ان کا افسانہ "پھندہ" اسی دھوکے اور رائیگانی کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا افسانہ "ایک سائیکلو سٹائل وصیت نامہ" مڈل کلاس طبقے کے ذہنی و فکری اور معاشی استحصال اور جہادی تنظیموں کے شدت پسندانہ رویوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس افسانے میں جنت دکھانے والوں کا اصل مکروہ چہرہ دکھایا گیا ہے اور دین کی آڑ میں لوگوں کی منافقت اور دوغلے معیاروں سے پردہ اٹھایا ہے۔

سائنس کی نت نئی ایجادات نے جہاں انسان کو بے پناہ سہولیات فراہم کی ہیں، وہیں بے شمار مشکلات سے دوچار بھی کیا ہے۔ ایٹم بم کی ایجاد نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے لاکھوں زندگیاں ختم ہو گئیں۔ آئے روز دہشت گردی کے مختلف واقعات میں جانی و مالی نقصان ہو جاتا ہے۔ دہشت

گردی کے حوالے سے طاہرہ اقبال نے بھی عمدہ افسانے لکھے ہیں جن میں "سلیپنگ بیوٹی"، "یاپروردگار"، "واکنگ ٹریک"، "دو کلو میٹر" اور "جنگل سکرین" شامل ہیں۔ "سلیپنگ بیوٹی" اور "جنگل سکرین" اس ضمن میں اہم ہیں کہ اس میں افسانہ نگار نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ دہشت گردی کے عفریت نے جہاں اتنی تباہی و بربادی کا سامان کیا ہے۔ وہیں معصوم بچوں کے ذہنوں میں عجیب سی جھنجھلاہٹ، تجسس اور ان گنت سوالات پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے کچے ذہن خوف اور دہشت کے سائے میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ ان کے لیے اب کھلونوں سے زیادہ ہتھیاروں اور گولیوں کی کشش زیادہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میڈیا ہے۔ کیوں کہ میڈیا کسی بھی رونما ہونے والے واقعہ کو اس قدر اچھال دیتا ہے کہ لاشعوری طور پر ان واقعات کے اثرات ہر انسان پر گہرے پڑتے ہیں۔ گویا ۹/۱۱ کے سانحہ کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ موجودہ نسل شدت پسندی کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہے۔ اس واقعے کے بعد کرہ ارض نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ میڈیا پر تشدد پر مبنی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جو لوگوں میں نفسیاتی مسائل پیدا کر دیتے ہیں اور عام لوگ بھی دہشت گردی، لوٹ مار اور تشدد جیسے افعال کی طرف راغب ہو جاتے ہیں" جنگل سکرین" میں اسی موضوع پر بات کی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے عالمی طاقتوں کے ظلم و ستم کو ایک سیریز کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جس میں معصوم لوگوں کا اپنے سے طاقتور قوموں کے ہاتھوں جانی و مالی استحصال دکھایا گیا ہے۔ یہ افسانہ انسانیت سوز تشدد اور انسانوں کے ساتھ بدترین سلوک سے پردہ اٹھاتا ہے جو کہ دہشت گردی کے موضوع پر ایک متنوع انداز ہے۔

مختصر افسانہ عہد جدید کی سب سے مقبول اور ممتاز صنف ادب ہے اور بلا شبہ آج کے دور میں تخلیق ہونے والا افسانوی ادب معیاری ادب میں شمار ہوتا ہے۔ موضوعات اور تکنیکوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے اردو افسانے کو ایک نئے عہد میں داخل کر دیا ہے۔ زندگی کی بتدریج بدلتی ہوئی تمام تر تبدیلیوں اور اقدار کو سمیٹتے سمیٹتے یہ نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ آج کا اردو افسانہ ایک منفرد ڈسکورس کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ جس نے مختصر ہونے کے باوجود زندگی کے دیو قامت مسائل کو اپنے اندر سمو کر نت نئے موضوعات پیش کر کے قارئین کر کے کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ دہشت گردی جیسے گھمبیر مسئلے کو بطور موضوع پیش کرنا اور زندگی کی اس سنگین حقیقت کو بے نقاب کرنا بہت بڑا رسک بھی تھا اور وقت کی ضرورت بھی کہ آج جس طرح دہشت گردی نے پوری دنیا خاص کر ہمارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اس کو منظر عام پر لانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ دہشت گردی اور جبر و تشدد، وغیرہ کوئی نئے موضوعات نہیں مگر سائنس نے جس طرح ترقی کی ہے تو

دہشت گردی کے نت نئے طریقے بھی سامنے آئے ہیں مثلاً خودکش حملے، جیلوں میں جدید طریقہ تشدد، برین واشنگ، عالمی طاقتوں کا منفرد انداز انتقام وغیرہ۔ زمانے کی کروٹ بدلنے سے موضوعات میں بھی تنوع آتا جارہا ہے اور یہ سہرا افسانہ نگاروں کے سر سجتا ہے کہ انہوں نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان نازک حالات و واقعات اور ان کے دور رس اثرات کو کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں کو آج تک بھی تعریف و تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہی افسانوں کو مشعل راہ بنا کر جدید افسانہ نگاروں نے بھی جگر کاوی اور محنت شاقہ سے بہترین افسانے تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے روایت سے کہیں انحراف بھی کیا اور نئے تجربات بھی کیے اور افسانے کو نئی ہیئت اور فارم عطا کی ۔افسانے نے آغاز وارتقاء سے اب تک فکر و فن کے کئی مدارج طے کیے ہیں اور مغربی تحریکوں سے بھی بہت کچھ مستعار لیا جو کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور نت نئے موضوعات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتا ہوا ہمارے سامنے ہے۔ حوادث اور واقعات کی تبدیلی نے افسانے کے موضوعات بدل ڈالے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں نے دہشت گردی جیسے ثقیل اور خشک موضوع کو فنی اور تکنیکی سطح پر بھی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ آج کا افسانہ فنی سطح پر بہت سے عناصر کے امتزاج سے تشکیل پارہا ہے۔ جس میں علامتیت و تجریدیت، تمثیل نگاری ،اساطیری رنگ، ہمہ رنگ اسلوب اور طرز بیان شامل ہیں۔ بیانیہ اسلوب کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا تڑکا بھی افسانے میں انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام جدید تکنیکیں مثلاً شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال، خطائی وقفہ کی تکنیک اور کیمرہ تکنیک وغیرہ کا استعمال افسانے میں جدت پیدا کرتا ہے۔

الغرض دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں کو بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ افسانے اپنے مختصر بیانیہ تحریر، بہترین کہانی پن، کردار نگاری، وحدت تاثر، اختصار، فنی مہارت، حساس موضوع اور فکر کی گہرائی کی وجہ سے کامیاب افسانے ہیں۔ تمام افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے مخصوص اسلوب اور منفرد انداز بیان سے فکری و فنی لحاظ سے اس موضوع کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں مختصر نقطۂ نظر کے باوجود جامعیت کا عنصر نمایاں ہے۔ افسانہ فگاروں نے اختصار کے پردے میں ناصح کا کردار ادا کیا ہے اور کہیں کہیں جارحانہ انداز میں دہشت گردی، جبر و تشدد اور سیاسی و سماجی مسائل کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کیا ہے اور سامراجی جبر کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ان افسانوں میں اس جارحانہ پن اور کھردرے انداز کی زیریں سطح پر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ جو بعض دفعہ علامتی و تجریدی صورت میں آشکار ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق اور زندگی کے فلسفے کی فکری موجوں کو اُبھارا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ افسانے جزئیات نگاری، معجز بیانی،

وسعت تصور، بلندی تخیل اور جدت ادا میں بھی اپنی مثال آپ ہیں اور بلاشبہ موضوعاتی، فکری اور فنی لحاظ سے منفرد اور قابل تحسین ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج

گزشتہ ابواب میں دہشت گردی کے مباحث اور پاکستانی اردو افسانے میں دہشت گردی بطور موضوع کا جائزہ تفصیلی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تحقیق سے سامنے آنے والے حاصلات و نتائج درج ذیل ہیں:

دہشت گردی عہد حاضر کا ایک سنگین مسئلہ ہے جس نے تمام کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس نے کائنات انسانی کے ہر گوشے پر اپنے دور رس اثرات مرتب کیے ہیں اور انسان کی سوچ، نفسیات اور اطوار کے ساتھ ساتھ تمام شعبہ ہائے زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ادب چوں کہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس لیے دہشت گردی جیسے عظیم المیے نے ادب پر بھی اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اردو ادب بھی اس سے مبرا نہیں۔ کیوں کہ ہمارا خطہ کئی دہائیوں سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ دہشت گردی چاہے فسادات کی صورت میں ہو یا پھر امریکہ افغان جنگ کی صورت میں، مسئلہ کشمیر کی صورت میں ہو یا پھر عالمی یا بین الاقوامی پیمانے پر، ادب کے نامور ادیبوں اور تخلیق کاروں نے اس سنگین مسئلے کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا اور قارئین کی توجہ مبذول کرائی۔ مختلف دہائیوں میں اردو افسانہ بھی دہشت گردی جیسے المناک واقعات کی غمازی کرتا نظر آتا ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں مثلاً عطیہ سید الطاف فاطمہ، خالدہ حسین، منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد، مبین مرزا، زاہدہ حنا، محمد حمید شاہد اور طاہرہ اقبال نے دہشت گردی پر بہترین افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ان افسانوں میں عالمی سطح پر رونما ہونے والے دہشت گردی کے سانحات کے ساتھ ساتھ پاکستان میں آئے روز ہونے والی دہشت گردی کے مختلف واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 9/11 کے سانحے نے پورے عالمی منظر نامے کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اردو افسانے میں نائن الیونزم کے تناظر میں بھی بہت عمدہ ادب تخلیق ہوا ہے۔ اس ضمن میں زاہدہ حنا اور حمید شاہد کے افسانے قابل ذکر ہیں۔ 9/11 کے واقعے کے بعد پاکستان کو بالخصوص جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اردو افسانے میں ان پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ اس سانحے کے بعد اردو افسانہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے انسان کو درپیش مسائل کو ہمیشہ ہی موضوع سخن بنایا ہے مگر دہشت گردی جیسے خشک اور ثقیل موضوع پر خامہ فرسائی کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں زندگی کی تلخ ترین حقائق کے ساتھ ساتھ، بارود، بمباری، خودکش

حملوں، کلاشنکوف، ڈرون اور خود کش جیکٹس جیسی دیگر اصطلاحات نے اردو افسانے کو الگ ڈگر پر لا کھڑا کیا ہے۔اس میں دہشت گردی کے واقعات کے انسانی نفسیات پر رونما ہونے والے اثرات پر بھی بار بار آواز اٹھائی گئی ہے۔

جہاد کے نام پر جس طرح دہشت گردی کی جارہی ہے اس پر بھی کئی افسانہ نگاروں نے بحث کی ہے۔ مثلاً منشا یاد کا افسانہ "ایک سائیکلو اسٹائل وصیت نامہ" اس موضوع کی بہترین تصویر کشی کرتا ہے۔اردو افسانہ نگاروں نے فکری و فنی ہر سطح پر نئے تجربات کیے جس سے دنیائے افسانہ کا دامن مزید وسیع ہو گیا ہے۔دہشت گردی کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ فنی سطح پر بہت سے عناصر کے امتزاج سے تشکیل پارہا ہے جس میں علامتیت و تجریدیت، اساطیری رنگ، تمثیل نگاری، ہمہ رنگ اسلوب اور طرز بیان شامل ہیں۔بیانیہ اسلوب کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا امتزاج افسانوں میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔اس کے علاوہ افسانہ نگاروں نے دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں جدید تکنیکیں استعمال کی ہیں مثلاً شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، فلیش بیک اور کیمرہ تکنیک وغیرہ۔اس کے علاوہ جدید علامات بھی متعارف ہوئی ہیں۔مثلاً کلاشنکوف، خود کش جیکٹس، جہادی کیمپ، بارود، ڈرون، ہینڈ گرنیڈ، آپریشن مائس وغیرہ۔دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے افسانے فکری و فنی ہر سطح پر منفرد اور قابل تحسین ہیں۔

ج۔سفارشات

۱۔ زیر نظر مقالے کا دائرہ کار افسانے تک محدود ہے۔ لہٰذا دیگر اصناف نثر اور اور اصنافِ نظم میں دہشت گردی پر تخلیق کیے گئے ادب پر تحقیق کی جاسکتی ہے تاکہ موضوع کا دامن مزید وسیع ہو سکے۔

۲۔ محققین کے لیے دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے افسانوں میں اسلوبیاتی اور تکنیکی سطح پر مزید کام کی گنجائش موجود ہے۔

۳۔ دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے پاکستانی اردو افسانے اور ہندی اردو افسانے کے مابین تقابل پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔اس سے تحقیق کے میدان میں نت نئے موضوعات منظر عام پر آسکیں گے جو کہ اردو ادب میں گراں قدر اضافے کا باعث بنے گا۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

آزاد مہدی، اس مسافر خانے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

آصف فرخی، زمین کا نوحہ، مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۵ء

آصف فرخی، شہروں کے باطن، شہر ماجرا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء

اعجاز احمد (مرتب) رشید امجد کے منتخب افسانے، پورب اکادمی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۹ء

الطاف فاطمہ، "تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز لاہور، فروری ۲۰۰۷ء

الطاف فاطمہ، "جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، قصور آرٹ پریس، لاہور، فروری، ۱۹۸۸

خالدہ حسین، پہچان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

رشید امجد، ڈاکٹر، دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، مارچ ۲۰۱۶ء

رشید امجد، ڈاکٹر، شہر گریہ، صحرا کہیں جسے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۲ء

رشید امجد، ڈاکٹر، گملے میں اگا ہوا شہر، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد ۲۰۱۵ء

رشید امجد، ڈاکٹر، انتخاب افسانہ اردو مرتب، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

رشید امجد، ڈاکٹر، عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

زاہدہ حنا، رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۱۷ء

زاہدہ حنا، تیلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز، لیک روڈ لاہور، ۲۰۱۷ء

زاہدہ حنا، قیدی سانس لیتا ہے، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۸۳ء

سید زبیر شاہ، خوف کے کتبے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء

سید زبیر شاہ، یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹر، جنگی، پشاور، ۲۰۱۷

طاہرہ اقبال، پاکستان اردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۵ء

طاہرہ اقبال، گنجی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

طاہرہ اقبال، ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

طاہرہ اقبال، جنگل سکرین، مشمولہ ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

مبین مرزا، دہ، خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء
محمد جمیل کاچو خیل، میرا برزخ،، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۹ء
محمد جمیل کاچو خیل، جلتا سرا سلگتی روح، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء
محمد جمیل کاچو خیل، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء
محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، بک کارنر پبلشرز، جہلم، اپریل ۲۰۱۵ء
مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
مسعود مفتی، ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
مشرف مبشر، سب سچ، منگل کتاب کور، جنگی، پشاور، اپریل، ۲۰۱۹ء
منشایاد، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
منشایاد، شہر افسانہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

ثانوی مآخذ

آزاد کوثر، نئے افسانے کی سماجی بنیادیں، روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۹۱ء
آل احمد سرور، اردو فکشن، علی گڑھ یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ، ۱۹۷۰ء
احمد جاوید، گواہی، عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۸ء
احمد صغیر، ڈاکٹر، اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۹ء
ارشد خانم، ڈاکٹر، ایک عظیم افسانہ نگار منشایاد،، ادارہ فروغ قومی اردو زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، ریز پبلی کیشنز، راول پنڈی، طبع اول، جون ۲۰۰۳ء۔
انعام الرحمن سحری، دہشت گردی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء
پروین اظہر، ڈاکٹر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۲۰۰۰ء
پیر محمد اکرام جان قادری، ڈاکٹر، جہاد اور دہشت گردی، جامعہ مدینہ العلم، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء۔
تصدق حسین راجا، ڈاکٹر، اسلام اور دہشت گردی، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، جولائی ۲۰۰۸ء۔
جلال زئی موسیٰ خان، ۷۳ فرقے کیسے بنے؟، فکشن ہاوس لاہور، ۲۰۱۲ء۔

جواز جعفری، ڈاکٹر، اردو ادب اور یورپ میں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۲۰۱۰ء۔
خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور دہشت گردی، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ۲۰۱۱ء
خان محمد عاطف، افغانستان۔ روسی دہشت گردی سے امریکی دہشت گردی تک، معصومہ اینڈ کمپنی دہلی ۲۰۱۲ء
رشید امجد، ڈاکٹر، مرتب، مزاحمتی ادب (نثر وافسانہ) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء
زید حامد، معاشی دہشت گردی، برلاس ٹیکس ٹیم، راولپنڈی، اکتوبر، ۲۰۰۹ء۔
سلمان عابد، دہشت گردی ایک فکری مطالعہ، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
سید احتشام حسین، پریم چند کی ترقی پسندی، مشمولہ اردو افسانہ، روایت اور مسائل، مرتبہ گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء،
سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء
سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
سید وقار عظیم، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاوس الہ آباد، س ن
شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء
شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، رشید امجد: ایک مطالعہ، نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء
شیما مجید، کلیات پریم چند، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۹ء
صغیر افراہیم، ڈاکٹر، اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۱۹۹۱ء
طاہر القادری، ڈاکٹر، دہشت گردی، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
طاہر القادری، ڈاکٹر، فرقہ پرستی کا خاتمہ کیوں کر ممکن ہے، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔
علی حیدر ملک، افسانہ اور علامتی افسانہ، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۳ء
قاضی عابد، ڈاکٹر؛ اردو افسانہ اور اساطیر، شعبہ اردو، زکریا یونیورسٹی، ملتان، طبع۔اول، ۲۰۰۲ء۔
گوپی چند نارنگ، آزادی کے بعد اردو افسانہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۳ء
نشاط شاہد، نیا افسانہ نئے دستخط،، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر: اردو مختصر افسانہ، فنی و تیکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۶ء
محمد بن اختر، عالم اسلام پر یہود و نصاری کے ذرائع ابلاغ کی یلغار، دار الاشاعت، اردو بازار کراچی، س۔ن،

محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، اول علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء
مفتی محمد شفیع، وحدت امت، مطبوعہ مکتبہ خدام القران، لاہور، س ن
مقبول ارشد، القاعدہ، زاویہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء
نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکیڈمی، اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء۔
وحید احمد، نظم نامہ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء
وہاب اشرفی، پروفیسر، اردو فکشن اور تیسری آنکھ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۵ء
ہارون یحییٰ، اسلام اور دہشت گردی، مترجم تصدق حسین راجا، ڈاکٹر، فن پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۵ء

انگریزی کتب

Hornby, A. S., & Cowie, A. P. (1995). *Oxford advanced learner's dictionary* (Vol. 1430). Oxford: Oxford university press.
John Richard Thackeray,(1987), Encyclopedia of Terrorism and political violence, T.J press , New York.
Laqueur, W. (2001). *A history of terrorism*. Transaction Publishers.
White, J. R., & Clear, T. (2002). *Terrorism: an introduction*. Stanford, CA: Wadsworth Thomson Learning.

لغات

مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، نیا ایڈیشن، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء
مولوی نور الحسن نیئر، نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

ویب سائیٹس

https://www.merriam-webster.com/dictionary/terrorism
www.wajood.com
www.express.pk
www.urduweb.org>mehfil>thread.
http:/www.pbs-gov.pk/sites/default/files/pslm

میگزین

ادب لطیف ،ماہنامہ،لاہور،اکتوبر ۲۰۰۳ء

اوراق، جنوری تاجون،۱۹۷۹ء

چہار سو،ماہنامہ، جلد ۲۵، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس،ٹرنک بازار، شمارہ مئی۔جون،۲۰۱۶ء

دنیازاد، کراچی،اکتوبر ۲۰۰۹ء

فنون،۷۷ا،لاہور،اپریل تااگست، ۲۰۰۲ء

معاصر،سہ ماہی انٹرنیشنل،ادارہ معاصر،لاہور، جنوری تاجون، ۲۰۰۳ء

ضرب مومن،ہفت روزہ، کراچی جون ۲۰۰۲ء

انٹرویوز

راقم کاڈاکٹر نجیبہ عارف سے انٹرویو،انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی،اسلام آباد،۱۵جون۲۰۱۸ء،بوقت دس بجے صبح

راقم کاڈاکٹر رشید امجد سے انٹرویو،C-52لین،A-7،گلستان کالونی،راول پنڈی،۲دسمبر۲۰۱۸ء۔بوقت ایک بجے دوپہر

راقم کامحمد حمید شاہد سے انٹرویو،انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی اسلام آباد،۹ستمبر۲۰۱۹ء،بوقت دو بجے دوپہر

راقم کامبین مرزا سے انٹرویو، پاک چائینہ سنٹر،اسلام آباد،۱۸اپریل۲۰۱۸ءبوقت گیارہ بجے صبح

راقم کاطاہرہ اقبال سے انٹرویو، پاک چائینہ سنٹر،اسلام آباد،۱۸اپریل۲۰۱۸ءبوقت بارہ بجے دوپہر

راقم کازاہدہ حنا سے انٹرویو، پاک چائینہ سنٹر،اسلام آباد،۱۸اپریل۲۰۱۸ءبوقت ایک بجے دوپہر